ملتِ اسلامیہ

کے منفی کردار

مرزا محمد اکرم

Marfat.com

Marfat.com

ملتِ اسلامیہ کے منفی کردار

مصنف

مرزا محمد اکرم

گوہر پبلیکیشنز
سید پلازہ فسٹ فلور A-3، چیٹر جی روڈ، اردو بازار لاہور
فون: 042-37027720 موبائل: 0345-4327063

Marfat.com

خیالات کی جنگ میں کتابیں ہتھیار کا کام کرتی ہیں۔
دنیا پر کتابیں ہی حکومت کر رہی ہیں۔

Mob: 0345-4327063
Ph : 042-37027720

ناشر:
حفیظ گوھر

''جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں''

نام کتاب	ملتِ اسلامیہ کے منفی کردار
مصنف	مرزا محمد اکرم
اہتمام طباعت	کرانہ پبلشر
سرورق	آغا نثار
کمپوزنگ	معاذ گرافکس اردو بازار لاہور
تعداد	1000
قیمت	400 روپے

حفیظ گوہر نے بھٹو پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر
گوہر پبلی کیشنز اردو بازار لاہور سے شائع کی۔

Marfat.com

انتساب

ملتِ اسلامیہ کے ان فرزندوں کے نام جو اپنی ہی ملت کے منفی کرداروں کے ظلم و جور کا شکار ہوئے اور ہمہ جہتی تکلیفوں اور عقوبتوں کے باوجود راہ راست سے منحرف نہ ہوئے بلکہ ملت اسلامیہ کو راہِ مستقیم پر رکھنے کے لئے اپنی جانوں سے گزر گئے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

Marfat.com

مشمولات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ	نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
1	ملتِ اسلامیہ کا زوال	6	16	ابراہیم	123
2	عبداللہ بن سبا	9	17	جلال الدین اکبر شہنشاہ ہند	127
3	مروان بن حکم	20	18	روشن اختر محمد شاہ رنگیلا	135
4	یزید بن معاویہؓ	24	19	بہادر شاہ ظفر	144
5	عبدالملک بن مروان	30	20	مغلیہ دورِ حکومت کے زوال کے اسباب ونتائج	150
6	خلافت بنواُمیہ پر ایک نظر	35	21	سلطان عبدالحمید ثانی	154
7	حجاج بن یوسف ثقفی	37	22	اختتامیہ	179
8	خالد بن عبداللہ القسری ابن النصرانیہ	46	23	ضمیمہ جات	
9	ولید ثانی بن یزید بن عبدالملک	52	①	مسلمان دشمن کا سر کاٹنا اور لاشوں کی بے حرمتی	199
10	ابوجعفر عبداللہ بن محمد الملقب بہ منصور	56	②	کوفہ عجیب وغریب کیفیات کا حامل شہر بے مثال	201
11	ابومسلم خراسانی	68	③	زیاد بن ابی سفیان (ابن سمیہ) اور عبیداللہ بن زیاد	203
12	باطنیت کا فتنہ اور اس کے پیروکار	79	④	نصیر الدین طوسی	206
13	فتنہ تاتار...... دو کردار، دو محاذ	90	⑤	بیرم خاں اکبر اعظم کا اتالیق	208
	علاؤ الدین خوارزم شاہ اور معتصم باللہ		⑥	خانِ اعظم مرزا عبدالعزیز کوکلتاش	210
14	زوالِ اُمت کے دو کردار	102	⑦	ابوالفضل	214
	بایزید یلدرم اور امیر تیمور (تیمور لنگ)		⑧	نادر شاہ	217
15	سقوطِ غرناطہ کے دو کردار	110	⑨	احمد شاہ ابدالی	218
	ابوعبداللہ زغل اور ابواحمد محمد		⑩	احمد اعرابی پاشا	220
			24	کتابیات	222

ملت اسلامیہ کا زوال

اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ کی طرف سے ارسال کردہ وحی کی روشنی میں تیئس سال کی مدت میں ایک لاکھ سے زیادہ ایسے نفوس قدسیہ کی جماعت تیار کر دی تھی جن کے رگ و پے سے جہالت، بت پرستی، شرک، کینہ، حسد، قبائلی عصبیت غرض تمام جملہ روحانی امراض کی بیخ کنی کے ساتھ ان میں ایسی خوبیاں پیدا کر دی تھیں کہ ان کے جسم کے سوا ماضی کی کوئی بھی کمزوری اور کفر کی نجاست ان سے کوسوں دور چلی گئی تھی۔ نفوس قدسیہ کی اس جماعت میں چار افراد جنہیں خلفائے راشدین کہا جاتا ہے، ایسے تھے جن کی امامت، سیادت، صداقت، عدالت اور دین و دنیا سے شناسائی سب سے آگے آخری حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس جماعت نے چار حضرات یعنی صدیق اکبرؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ اور علی المرتضیٰؓ کو اپنے مخصوص زمانے میں مسلمانوں کی امامت کے لئے منتخب کیا۔ یہ چاروں خلفائے رسول ﷺ بیک وقت، مفتی مجتہد، امام نماز، قاضی مسلمانوں کی افواج کے سربراہ، مقنن اور مفسر غرضیکہ ہادیٔ برحق ﷺ کی سراپا نور شخصیت کے صحیح عکاس تھے۔ جب تک ان کا دورِ خلافت رہا دین و دنیا کی کامرانیاں اور کامیابیاں ان کے در پر ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھیں۔ ان کی حکومت کا مقصد مخلوقِ خدا کو اس طرح راحت پہنچانا تھا کہ ایک طرف وہ اللہ کے بہترین بندے بنے رہیں بلکہ اللہ کے دین کی خاطر بغیر کسی ریاکاری کے پورے صدقِ دل سے ہر لحہ جدوجہد کے لئے بھی تیار رہے ہیں۔ ان کی جدوجہد تبلیغ سے شروع ہو کر جہاد کی آخری حد یعنی قتال تک پہنچتی تھے اور ہر فرد اپنے اندرونی جذبہ سے اس کے لئے تیار رہتا تھا۔ لہٰذا خلافت (حکومت) کا رخ اس طرح متعین ہو چکا تھا کہ حکومت اور معاشرہ کے باہمی تعامل سے ہر فرد کے لئے اپنے دین و دنیا سنوارنے کے رستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ انسانی فطرت کو اس کے اپنے وہبی حسن کے مطابق اپنا سفر عروج کی طرف طے کرنے کے لئے معاشرہ ہر سہولت بغیر کوشش اور خواہش کے مہیا کرنے کو تیار رہتا تھا، بلکہ معاشرہ ہی ایسا تھا جو آپ سے آپ ایسے افراد تیار کئے جا رہا تھا۔ حکمران (خلفاء) دین و دنیا کے سارے معاملات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایت کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے کرتے تھے۔ تمدن اپنی قدرتی رفتار سے ترقی کی طرف گامزن تھا۔

کسی مؤرخ کا قول ہے کہ انسانی زندگی میں دو اوقات کا تعین ناممکنات میں سے ہے، ایک یہ کہ کوئی شخص کس وقت نیند کی گرفت میں آجائے گا اور دوسرا یہ کہ کوئی قوم یا معاشرہ کس وقت زوال کا شکار ہوا تھا یا ہو جائے گا۔ زوال کی خبر اس وقت ملتی ہے جب یہ اپنے پنجے گاڑ چکا ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی معاشرہ کے زوال کی نشان دہی کے لئے انگلی اس لکیر پر رکھی جا سکتی ہے جہاں خلافت ختم ہو گئی اور ملوکیت نے غلبہ حاصل کر لیا۔ اس لکیر کے زوال کی طرف حضرت عمر بن عبدالعزیز کو استثنیٰ حاصل ہے۔

خلافت راشدہ کے بعد اسلامی معاشرہ پہلے اموی اور پھر عباسی خلفاء (بادشاہوں) کی گرفت میں آ گیا۔ یہ تمام حضرات نہ تو صحابی تھے اور نہ صحابہ جیسے کردار سے مزین تھے۔ عوام کو غلام بنا کر رکھتے۔ ان سے دولت و ثروت لوٹتے تاکہ ان کی لطف اندوزیاں، نفس پرستیاں اور عیاشیاں بحال رہ سکیں۔ فریب کاری، دھونس، دھاندلی اور اپنے جیسے انسانوں کو قتل کرنے تک ہر عمل کو جائز سمجھتے تھے اور روا رکھتے تھے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا تھا کیونکہ ان نام نہاد خلفاء کا دینی، روحانی اور اخلاقی معیار اتنا بلند نہ تھا جو ملت اسلامیہ کے رہنماؤں کے شایانِ شان ہے۔ ان کے ذہن اور طبیعتیں عرب کی قدیم تربیت اور ماحول کے اثرات سے بالکلیہ آزاد نہیں ہوئی تھیں۔ ان میں نہ روحِ جہاد تھی اور نہ قوتِ اجتہاد۔ جو دنیا کی پیشوائی اور عالمگیر قیادت کے لئے ضروری ہے۔

اس دور میں دین اور سیاست میں عملاً تفریق ہو کر رہ گئی کیونکہ خلفاء علم اور دین میں ایسا مرتبہ نہیں رکھتے تھے جس سے ان کو علماء اور اہل دین کی ضرورت نہ پڑے۔ انہوں نے حکومت اور سیاست کو اپنے ہاتھ میں رکھا اور مشیر یا ماہرین خصوصی کی جب ضرورت محسوس ہوئی ان سے رائے لے لی اور اس کا جتنا حصہ مناسب سمجھا قبول کر لیا یا رد کر دیا۔ اس طرح سیاست دین کی نگرانی سے بالکل آزاد ہو گئی اور اس آزادی کا کوئی کنارہ نہ تھا۔ اہل علم اور اہل دین یا تو حکومت کے مخالف تھے اور اس کے خلاف بعض اوقات خروج بھی کرتے تھے یا سیاسی زندگی سے مکمل کنارہ کش اور فوری انقلاب سے مایوس ہو کر افراد کی اصلاح اور تربیت کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ بعض ماحول کی خرابی کو دیکھ کر کڑھتے رہتے اور کبھی کبھی تنقید کر لیتے۔ بعض کسی دینی مصلحت کی بنا پر حکومت سے تعاون کرتے تاکہ اس نظام میں داخل ہو کر جتنی اصلاح ممکن ہو کر دی جائے۔ کچھ حضرات اپنی ذاتی اغراض کے لئے حکومت وقت سے تعاون کر رہے تھے۔ الغرض دین روز بروز بے زور اور سیاست دن رات زور آور ہوئے جا رہی تھی۔ اس طرح دین داروں اور دنیا داروں کے دو گروہ بن گئے جن کے درمیان اختلافات بیگانگی کی حدوں سے نکل کر مخالفت تک پہنچ گئے۔ خلفاء جس بے قید اور مترفانہ زندگی کے عادی تھے وہی چلن معاشرے کے ہر طبقے کا وطیرہ بن گیا۔ ایسے حالات میں اللہ اور روزِ آخرت کو یاد دلانا تقویٰ اور دین کی ترغیب دینا اور عام لوگوں کے لئے اعلیٰ اخلاقی نمونہ قائم کرنا بہت دور کی بات تھی۔ اپنے وجود، عزت اور آزادی کو برقرار رکھنا ہی دشوار ہو گیا تھا۔

بڑی اہم تبدیلی جو خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت کے دور میں اموی اور عباسی خلفاء جس کے عادی ہو چکے تھے، وہ یہ تھی کہ حکمران اور ان کے متوسلین اپنے اخلاق و اعمال اور معاملات میں اسلام کی شرعی سیاست، اس کے جنگی قوانین، اس کے تمدنی نظام اور اس کی اخلاقی تعلیمات کی بہت کم نمائندگی کرتے تھے۔ اس طرح غیر مسلموں کے دلوں سے اسلام کے پیغام کا رعب اور احترام جاتا رہا اور ان کا اعتماد ان لوگوں سے زائل ہو گیا۔ ایک یورپین مورخ کے الفاظ میں "اسلام کو اس لئے زوال شروع ہوا کہ انسانیت کو ان لوگوں کی صداقت میں شبہ ہونے لگا جو دین جدید کی نمائندگی کر رہے تھے"۔

اسلام نے اپنے ماننے والوں کے لئے دین کو بڑا سہل اور یسیر التعمیل انداز میں پیش کیا تھا۔ اللہ کی ذات کی پہچان کے لئے کسی پیچیدہ مابعد الطبیعاتی اور فلسفیانہ موشگافیوں کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے لئے ایک سورۃ اخلاص ہی کافی تھی۔ خلفاء کی سرپرستی میں یونانی فلسفہ مابعد الطبیعات نے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہن کو سادہ حقیقت توحید سے ہٹا کر دور از کار بحثوں

Marfat.com

میں الجھا دیا۔ نتیجتاً توحید خالص جو بندوں کو اللہ سے ہمکلام کرتی تھی، عنقا ہوگئی اور فلسفہ کے نام پر خواص کی تحقیق و تجسس نے اعمال کی بنیاد کو کمزور کر دیا۔ بے لگام عقل نے عمل کے اندرونی ولولے اور حسن کو ختم کر دیا اور تشکک اور بے یقینی نے اس کی جگہ لے لی۔ جرأت، شجاعت اور شہامت کے ہمالے مٹی کے ڈھیر بن کر رہ گئے۔

اس دورِ انحطاط میں ایک نئی الجھن نے مسلمان معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسلام کا امتیاز اور اعجاز اس کی اصلیت میں ہے۔ وہ اسی بارے میں ممتاز ہے، وہ اللہ کی وحی و شریعت ہے۔ یہی اس کی معجزانہ ساخت اور اس کی حکیمانہ صفت ہے۔ اس کے برعکس مسلمان معاشرے میں قدیم جاہلی قوموں کے عقائد و خیالات اور دینی گمراہی نے نفوذ کرنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کے مزاج میں بدعات نے گھر کر لیا اور مذہبی زندگی کی ایک بڑی جگہ کو گھیر لیا اور انہیں صحیح دین اور کار آمد دنیا سے دُور کر دیا۔

یہ تھے وہ حالات و واقعات جن کی وجہ سے اموی اور عباسی دورِ خلافت امتِ مسلمہ کے لئے میزابِ رحمت کی بجائے عذاب سعیر بن گئی۔ اس ظالمانہ، قاہرانہ اور انسانیت سوز نظام کو تبدیل کرنے کے لئے ملت اسلامیہ کے بہترین انسانوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اس نظام کو راہ راست پر لانے کے لئے جہد مسلسل میں جتے رہے اور ان ظالمین کے ظلم و جور کے باوجود دین کو اصلی حالت میں بچا کے رکھا۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ بھی اسی قافلے کے رجل رشید اور میر کارواں تھے۔

اللہ پاک انسانوں کے نیک اعمال کی تحسین فرماتے ہیں اور بداعمالیوں کے لئے عذاب کی وعید سناتے ہیں۔ لہٰذا اللہ کی مشیت نیک اعمال والے انسانوں کے کردار سے جڑی ہوئی ہے جو شخص بھی خواہ وہ بادشاہ ہو، وزیر ہو، حکومتی عہدہ دار ہو یا عام آدمی ہو، راہ مستقیم سے جتنا فاصلہ بڑھاتا جائے گا اپنے ساتھ پورے تمدن کے لئے بھی مشکلات پیدا کرتا چلا جائے گا۔ کوئی شخص نظر بظاہر جتنا بڑا ہوتا ہے اور اس میں تمدن پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت جتنی زیادہ ہوتی ہے، اس کے پیدا کردہ بگاڑ اور کج روی کی مقدار اور شدت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ اموی اور عباسی خلفاء سے لے کر ان کے عمال حکومت تک ہر ایک نے فتنہ عظیم پیدا کرنے کے لئے اپنا اپنا حصہ ڈالا۔ جس نے جتنا حصہ ڈالا اتنا ہی وہ مسلمانوں کے لئے تعذیب اور معاشرے کے زوال کا سبب بنا۔ چنانچہ ہماری یہ کتاب راہ مستقیم سے خود ہٹے ہوئے اور خدا کی مخلوق کو راہ راست سے ہٹانے والے اللہ کی مرضی کی بجائے اپنے مرضی بزورِ شمشیر مسلط کرنے والے، اپنی بداعمالیوں کے سبب مستحکم معاشروں اور حکومتوں کو برباد کرنے والے بدقسمتوں کی داستان ہے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں تاریخی حقائق کو پوری تحقیق، تلاش اور دیانتداری کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔ ہماری یہ کوشش کسی بھی دل میں جوش اور ولولے کی چنگاری کو شعلہ بنا دے تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری کوشش سعی مشکور کے درجے تک پہنچ گئی۔

اموی اور عباسی خلفاء جن کا سلسلہ مروان بن حکم سے شروع ہو کر معتصم اور ابن علقمی تک پہنچتا ہے، معاشرے کے اسلامی تشخص کو برباد کرنے والے مغلوں کی داستان بھی اس کتاب کا حصہ ہے۔ اندلس اور ترکی کے حکمرانوں نے بھی زوالِ اُمت کے کارِ بے خیر میں جو حصہ ڈالا وہ بھی سامنے لایا جائے گا۔

عبداللہ بن سبا

عبداللہ بن سبا المعروف بہ ابن سوداشہر صنعا (یمن) کا رہنے والا یہودی تھا۔ اس نے سوچا اور دیکھا کہ اب دنیا میں سب سے بڑی قوم مسلمان ہیں، وہی فاتح ہیں اور ان کی فتوحات کے نتیجے میں مالِ غنیمت کی صورت میں دولت نے مسلمانوں کے شہروں کا رخ کر لیا ہے۔ عثمانِ غنیؓ کے دورِ خلافت میں وہ مدینہ چلا آیا اور بظاہر مسلمانوں میں شامل ہو گیا۔ مدینہ میں اس کا آنا اور رہنا بہت ہی غیر معروف اور ناقابلِ التفات تھا۔ اس نے مدینہ میں رہ کر مسلمانوں کی اندرونی اور داخلی کمزوریوں کو خوب جانچا اور خلافِ اسلام تدابیر کو بھی ہر پہلو سے زیرِ غور لایا۔

انہی دنوں بصرہ کے اندر ایک شخص حکیم بن جبلہ رہتا تھا۔ اس نے یہ وطیرہ بنا رکھا تھا کہ اسلامی لشکر کے ساتھ کسی فوج میں شریک ہو جاتا اور موقع پا کر ذمیوں کو لوٹتا۔ کبھی کبھی اور لوگوں کو بھی اپنا شریک بناتا اور ڈاکے ڈالتا۔ اس کی ڈاکہ زنی کی خبریں مدینہ پہنچیں تو حضرت عثمانِ غنیؓ نے گورنر بصرہ کو لکھا کہ حکیم بن جبلہ کو بصرہ میں نظر بند رکھو اور اسے شہر کی حدود سے ہرگز باہر نہ جانے دو۔ اس حکم کی تعمیل میں وہ بصرہ کے اندر محصور اور نظر بند ہو کر رہ گیا۔ عبداللہ بن سبا حکیم کے حالات سن کر مدینہ سے بصرہ چلا گیا اور حکیم بن جبلہ کے مکان میں رہنے لگا۔ یہاں اس نے حکیم بن جبلہ اور اس کے ذریعے حکیم کے دوستوں اور دوسرے لوگوں سے مراسم پیدا کئے۔

عبداللہ بن سبا کے عقائد اور نظریات

عبداللہ بن سبا اپنے منصوبے کے مطابق فساد انگیز خیالات پیدا کرنے کے لئے کبھی کہتا کہ مجھ کو تعجب ہوتا ہے کہ مسلمان اس بات کے تو قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ دنیا میں آئیں گے مگر اس بات کو نہیں مانتے کہ محمد ﷺ دنیا میں ضرور آئیں گے۔ چنانچہ لوگوں کو آیاتِ قرآنی کی غلط تفسیر سنا کر اس عقیدے پر قائم کرنے کی کوشش کرتا کہ آنحضرت ﷺ کی مراجعت دنیا میں ضرورت ہو گی۔ بہت سے احمق اس فریب میں آ گئے۔ پھر اس نے انہی احمقوں کو اس عقیدے پر قائم کرنا شروع کر دیا کہ ہر پیغمبر کا ایک خلیفہ اور وصی ہوتا ہے اور حضرت محمد ﷺ کے وصی حضرت علیؓ ہیں۔ جس طرح حضرت محمد ﷺ خاتم الانبیاء ہیں اسی طرح حضرت علی خاتم الاوصیاء ہیں۔ پھر اس نے علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ حضرت محمد ﷺ کے بعد حضرت علیؓ کے سوا دوسروں کو خلیفہ بنا کر حق تلفی کی گئی ہے اور سب کو چاہیے کہ حضرت علیؓ کی مدد کریں اور موجودہ خلیفہ کو قتل یا معزول کر کے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنا دیں۔

Marfat.com

ابن سبا کی بصرہ سے کوفہ میں سکونت

ابن سبا مکمل تیاری اور اپنی شرانگیز تحریک کے لئے پورا منصوبہ اور اس کے تمام پہلوؤں کو سوچ کر بصرہ آیا تھا۔ اس نے بڑی احتیاط اور قابلیت سے قسطوں میں اپنی شرانگیزیاں اور بدعقیدگیاں لوگوں میں پھیلائیں۔ رفتہ رفتہ اس فتنے کا حال بصرہ کے گورنر تک پہنچا۔ بصرہ کے گورنر عبدالرحمٰن بن عامر نے ابن سبا کو طلب کیا اور بتایا کہ تمہارے حالات معلوم کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تم کوئی فتنہ برپا کرنا چاہتے ہو اور مسلمانوں کو گمراہ کر کے یہودی ہونے کی حیثیت سے جمعیت اسلامی میں افتراق و انتشار پیدا کرنا چاہتے ہو۔ عبدالرحمٰن بن عامر کی زبان سے پتے کی باتیں نکل گئی تھیں، اس لئے ابن سبا نے بصرہ سے نکل جانا ہی مناسب سمجھا۔ جانے سے پہلے اپنی تحریک کے خاص راز داروں کو مخصوص ہدایات دیں تا کہ آگے چل کر کوئی فتنہ اٹھانا آسان ہو جائے اور خود دوسرے اسلامی فوجی مرکز کوفہ میں پہنچ گیا۔ کوفہ میں پہلے ہی ایک جماعت مخالفین عثمانؓ کی موجود تھی۔ چنانچہ ابن سبا کو اپنی شرانگیزیوں کو کامیاب بنانے کے لئے بصرہ سے بھی بہتر ماحول مل گیا۔

عبداللہ بن سبا کی کوفہ سے دمشق روانگی

ابن سبا کو ایک طرف اسلام سے مخالفت تھی دوسری طرف اس کو حضرت عثمانؓ سے ذاتی عداوت تھی۔ وہ عثمانؓ سے انتقام اور بدلہ لینے کا خواہش مند تھا۔ کوفہ میں اس نے اپنے جعلی زہد و ورع سے بہت جلد لوگوں کی نظروں میں عزت حاصل کرلی اور لوگ اس کا ادب ولحاظ کرنے لگے۔ اس کے پھیلائے ہوئے خیالات کا چرچہ ہوا تو کوفہ کے گورنر سعید بن العاص نے اسے بلا کر ڈانٹا، معاشرے کے معتبر آدمیوں نے بھی اسے مشتبہ قرار دیا تو ابن سبا کوفہ سے نکل کر شام کی طرف روانہ ہو گیا لیکن جانے سے پہلے اس نے مالک اشتر نخعی کی سربراہی میں اپنی شرانگیزیوں کو بڑھاوا دینے کے لئے ایک جماعت تیار کر دی تھی تا کہ فتنے کی آگ شعلہ زن رہے۔ کوفہ سے وہ شام کے شہر دمشق پہنچا لیکن یہاں اس کی دال نہ گلی اور جلد ہی شہر بدر ہونا پڑا۔

ابن سبا مصر میں

حضرت عثمانؓ اور بنو امیہ کے ساتھ ابن سبا کی عداوت روز بروز ترقی کر رہی تھی اور ہر جلاوطنی اس کی کامیابیوں کے لئے نیا میدان اور مواقع فراہم کر رہی تھی۔ شام سے ابن سبا سیدھا مصر پہنچا، وہاں اس نے سابق تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تحریک کو پہلے سے بہتر اور مضبوط انداز سے منظم کیا تا کہ حکومت کی نظروں سے اوجھل رہے۔ یہاں اس نے اپنی خفیہ سوسائٹی کا نظام مرتب کیا۔ اہل بیت کی محبت اور حمایت علیؓ کے اظہار کو کامیابی کے لئے خاص الخاص ذریعہ بنایا۔ مصر کے گورنر عبداللہ بن سعد کی نسبت بھی مصریوں اور وہاں کے مقیم عربوں کو شکایت تھی۔ دوسری طرف عبداللہ بن سعد جنگی محاذوں پر مصروف ہونے کی وجہ سے ابن سبا کے معاملات پر پوری توجہ بھی نہ دے سکا۔

مصر میں قیام کے دوران ابن سبا نے اپنے پروگرام کے مطابق بصرہ، کوفہ اور دمشق میں اپنے دوستوں سے خط و کتابت شروع کر دی۔ بصرہ والوں نے کوفہ والوں کو اپنے خلاف خطوط لکھے، کوفہ والوں نے بصرہ والوں کو، دمشق والوں

نے بصرہ اور کوفہ والوں کو خطوط لکھ کر ایسی فضا پیدا کر دی جو سراپا شر انگیز تھی۔ کیونکہ ہر شہر والا سمجھ رہا تھا کہ دوسرے شہر والے ہم سے زیادہ مظلوم ہیں اور عمالِ خلافت تمام بڑے شہروں کے عوام کو ظلم و ستم کا شکار بنا رہے ہیں۔

علاوہ ازیں اسی سازش کے تحت سبائی تحریک کے لوگ ان تمام شہروں سے مدینہ منورہ میں خطوط بھیج رہے تھے کہ عمال ظلم کر رہے ہیں اور مدینہ والے برداشت کر رہے ہیں۔ غرض اس سازشی انداز کی خط و کتابت نے عجیب اور نہ سمجھ آنے والا ماحول پیدا کر دیا اور تمام عالم اسلام میں یہ تاثر وبا کی طرح پھیل گیا کہ عثمانی خلافت کے عمال اور گورنر عوام کو ہر وقت ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہے ہیں اور حضرت عثمانؓ اپنے عمال اور گورنروں کو معزول بھی نہیں کرنا چاہتے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر حضرت عثمانؓ نے عمار بن یاسرؓ کو مصر اور محمد بن مسلمہؓ کو کوفہ بھیجا تاکہ حالات کی اصلیت معلوم کر کے دربارِ خلافت کو مطلع کریں۔ عمار بن یاسرؓ مصر پہنچے تو وہ لوگ جو عبداللہ بن سعدؓ گورنر مصر سے ناخوش تھے اور جو سبائی خط و کتابت میں شریک تھے انہوں نے عمار بن یاسرؓ کو اپنا ہمنوا بنالیا اور مصر میں روک لیا اور انہیں قائل کر لیا کہ عثمانؓ کی حکومت ظالم ہے۔ اس لئے اس کا ساتھ دینا مناسب عمل ہے۔ محمد بن مسلمہؓ نے مدینہ پہنچ کر اطلاع دی کہ کوفہ کے عوام و خواص طعن و تشنیع، الزام تراشی اور بغاوت کا اظہار کر رہے ہیں۔ انہی دنوں خلافتِ عثمانی کے حامی مددگار اور معاشرہ کے سردار اشعث بن قیسؓ جیسے کئی بزرگ کوفہ سے روانہ ہو چکے تھے۔ کوفہ کے گورنر سعیدؓ بن العاص نے ہر طرف بغاوت سرکشی اور تمرد کا سماں دیکھا تو اپنے دوست قعقاع بن عمرو کو اپنا قائم مقام بنا کر مدینہ چلے گئے تاکہ حضرت عثمانؓ کو صحیح حالات سے آگاہ کر سکیں۔ اس دوران سبائیوں نے مالک بن اشتر کو خط لکھا کہ کوفہ اس وقت بااثر سردار سے خالی ہے، آپ حمص سے جلد از جلد کوفہ پہنچو۔ دوسری طرف لوگ علانیہ عثمانی خلافت کے خلاف زبان درازیاں کر رہے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ یزید بن قیس سبائی نے ایک ہزار کا لشکر تیار کر کے مدینہ کی طرف کوچ کیا تاکہ حضرت عثمانؓ کو خلافت سے دست برداری کے لئے قائل کر سکیں۔ قعقاع بن عمرو نے ہمت کر کے اپنے لشکر کے ساتھ یزید بن قیس کو گرفتار کر لیا۔ یزید نے منت سماجت کر کے قعقاع سے اپنے آپ کو رہا کروالیا اور عذر یہ پیش کیا کہ وہ تو صرف سعید بن العاصؓ کے خلاف تھا۔ ان کے جانے سے میری بغاوت ختم ہو گئی ہے۔ اس دوران مالک اشتر حمص سے کوفہ پہنچ گیا اور علانیہ یزید بن قیس کی جماعت میں شامل ہو کر دوسرے لوگوں کو اس جماعت میں شامل ہونے کے لئے دعوت دینے لگا۔ چنانچہ یہ لوگ ایک بڑے جتھے کی صورت میں قادسیہ کے قریب ایک اہم مقام جرعہ تک پہنچ گئے۔

43 ہجری کے آخری ایام تھے، حضرت عثمانؓ کے حکم کے مطابق سارے گورنر حج کے بعد مدینہ منورہ میں جمع ہوئے۔ نظر بظاہر باغیانہ صورتِ حال پر اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کیا گیا مگر کسی نقطہ نظر پر اتفاق نہ ہو سکا۔ سوائے اس کے کہ کچھ لشکر مختلف ممالک میں جہاد کے لئے بھیج دیئے گئے۔ علاوہ ازیں جب شورش اور فساد کے متعلق اصل حالات ایک دوسرے سے دریافت کئے گئے تو معلوم ہوا کہ یہ تمام شورش محض فرضی اور خیالی ہے، اصلیت کچھ بھی نہیں ہے، اس پر سب کو تعجب ہوا۔ بعض حضرات نے مشورہ دیا کہ جو لوگ اس قسم کی بغاوتوں اور سازشوں میں حصہ لے رہے ہیں انہیں تلاش کر کے قتل کیا جائے اور مجرموں کے ساتھ کوئی نرمی اور رعائت نہ برتی جائے۔ اس کے جواب میں حلم و درگزر کے پیکر حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ

صرف اسی قدر سزا دے سکتا ہوں جس قدر قرآن و حدیث نے مقرر کی ہے۔ جب تک کسی کو علانیہ مرتد ہوتے نہ دیکھوں کیسے کسی کو قتل کر سکتا ہوں۔ جن مجرموں کے لئے حدود مقرر ہیں صرف انہی پر حد جاری کر سکتا ہوں، باقی اپنے خلاف فتنے کو صبر اور استقامت کے ساتھ برداشت کرنے کا عزم رکھتا ہوں۔ بالآخر اس قسم کی گفتگو کے بعد مجلس برخاست ہو گئی اور سارے عمال اپنے صوبوں کو روانہ ہو گئے۔ جب سعید بن العاص اپنے صوبہ کوفہ کو روانہ ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ مقام جرعہ پر کوفہ والوں کا ایک بہت بڑا لشکر یزید بن قیس کی ماتحتی میں موجود ہے۔ یزید بن قیس نے سعید بن العاص ؓ سے بڑے درشت لہجے میں کہا کہ یہاں سے فوراً واپس چلے جاؤ، ہم تم کو ہرگز کوفہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ یہ سن کر سعید بن العاص ؓ کے غلام نے کہا کیا یہ ممکن ہے کہ سعید واپس چلے جائیں؟ یہ سن کر مالک اشتر نے غلام کا پیر پکڑ کر اونٹ سے نیچے گرایا اور قتل کر دیا اور سعید ؓ سے کہا جاؤ عثمان ؓ سے کہو، ابو موسیٰ اشعری ؓ کو گورنر بنا کر کوفہ بھیج دیں۔ اس پر سعید بن العاص عثمان ؓ کی خدمت میں مدینہ پہنچے اور سارا ماجرا سنایا۔ حضرت عثمان ؓ نے ابو موسیٰ ؓ کو تقرری کا پروانہ دے کر کوفہ بھیج دیا۔

ابو موسیٰ اشعری ؓ نے کوفہ پہنچ کر جمعہ کے روز لوگوں کو نفاق و افتراق سے بچنے اور حضرت عثمان ؓ کی اطاعت کی تاکید کی۔ ان کی تقریر سے عام لوگ جو ابن سبائی تحریک سے بے خبر تھے مطمئن ہو گئے لیکن سبائیوں نے اپنی فتنہ پروری بند نہ کی۔ ابو موسیٰ ؓ کو چھوڑ کر انہوں نے کوفہ کے اردگرد چھوٹے عمال کے متعلق مدینہ منورہ کے اشراف اور معتبر حضرات کو خطوط لکھنا شروع کر دیئے۔ چنانچہ مدینہ منورہ کی اشرافیہ بھی حضرت عثمان ؓ کے متعلق بدگمانی کا شکار ہونے لگی۔ حضرت عثمان ؓ نے تحقیق کے بعد بھی ان عمال میں کوئی کوتاہی اور کمزوری محسوس نہ کی اور انہیں معزول کرنے میں تامل فرمایا۔ خطوط کا سلسلہ جاری رہا اور خود مدینہ کے اندر طعن و تشنیع بدستور جاری رہی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عبداللہ بن سبا کے کارندے تمام اسلامی ممالک میں پھیل چکے تھے اور اس کے متبعین کی ایک بڑی جماعت اس کے احکامات پر عمل کے لئے تیار ہو چکی تھی۔ علاوہ ازیں مروان بن حکم جو حضرت عثمان ؓ کا چچازاد اور میر منشی تھا، اپنی حرکتوں سے اہل مدینہ کو مسلسل کرب اور پریشانی میں مبتلا رکھے ہوئے تھا۔

عہد خلافت راشدہ میں مسلمانوں کی طاقت، سطوت اور رعب کے پانچ مراکز ایسے تھے جن کے اثرات اور رعب و دبدبہ اکناف عالم میں پھیل چکا تھا۔ یہ مراکز مدینہ منورہ، کوفہ، دمشق، بصرہ اور مصر تھے۔ جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ ابن سبا نے ان مراکز کو بڑی چالاکی اور عیاری سے اپنی شرانگیز تحریک کے لئے استعمال کیا۔ یہ ابن سبا کی لومڑی جیسی عیاری تھی کہ اس نے ایک طرف مالک اشتر، محمد بن ابی بکر، عمار بن یاسر اور کئی بااثر بزرگوں کو متاثر کر رکھا تھا۔ دوسری طرف خلافت عثمانی اور امیر معاویہ ؓ کے خلاف ایک عمومی نفرت انگیز تحریک کا سامان مہیا کر دیا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں وساوس کی ایسی فصل بو رکھی تھے جسے تلف کرنا اور جڑ سے اکھاڑ دینا بہت ہی مشکل ہو چکا تھا۔ اس کے پیچ در پیچ خطوط بازی کی وجہ سے پیدا کردہ شورش کو اگر ایک طرف فرو کیا جاتا تو دوسری طرف کسی اور انداز سے اور زیادہ شدت سے بغاوت اور تمرد سامنے آ جاتا۔ المختصر طاقت کے پانچوں مراکز اس وقت بالفعل ابن سبا کی گرفت میں تھے اور شرپسند لوگ حضرت عثمان ؓ اور بنو امیہ بالخصوص امیر معاویہ ؓ کے خلاف سازش اور تحریک کے شعلوں کو مسلسل ہوا دے رہے تھے۔

عبداللہ بن سبا جس نہج پر کام کر رہا تھا اس کی اصل کو یا وہ خود جانتا تھا یا اس کے خاص الخاص مسلمان نما یہودی جانتے

Marfat.com

تھے۔ بظاہر وہ حب علی اور حب اہل بیت کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا تھا تا کہ خلافت عثمانی کو درہم برہم کیا جاسکے۔ طاقت کے پانچوں مراکز سے سادہ لوح عرب اس کے دام تزویر میں آچکے تھے۔ چنانچہ ابن سبا کے اشارے پر پانچوں مراکز میں حضرت عثمانؓ کو معزول یا قتل کرنے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ سبائیوں کے تمام گروہ اس بات پر تو متفق تھے کہ حضرت عثمانؓ کو معزول یا قتل ضرور کر دیا جائے لیکن ان کے بعد خلیفہ کس کو بنایا جائے۔ اس میں اختلاف تھا۔ کوئی حضرت علیؓ کا نام لیتا، کوئی زبیر بن عوامؓ کو بہتر سمجھتا اور کوئی طلحہؓ کا نام لیتا اور انہیں خلافت کے لئے موزوں ترین سمجھتا۔ چونکہ ابن سبا کا مقصدِ واحد حضرت عثمانؓ کی مخالفت تھی لہٰذا اس نے حضرت علیؓ کی محبت والے نظریے پر زیادہ زور نہ دیا بلکہ تمام گروہوں کو خلافت کے معاملے میں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

فتنہ پرور قافلوں کی روانگی

سب سے پہلے ایک ہزار آدمی کا قافلہ سردار غافقی بن حرب مکی کی سربراہی میں مصر سے روانہ ہوا اور مشہور کر دیا کہ ہم حج کو جا رہے ہیں۔ قافلوں کی روانگی شوال میں شروع ہوئی تھی، دوسرا قافلہ مالک اشتر کی ماتحتی میں کوفہ سے اور تیسرا قافلہ حرقوس میں زبیر سعدی کی سرداری میں بصرہ سے روانہ ہوا۔ سب قافلے ایک ایک ہزار افراد پر مشتمل تھے۔ سب نے حج کا بہانہ کیا اور تینوں قافلے شروع میں چار چار حصوں میں اپنی قیام گاہوں سے نکلے اور آگے جا کر سب اکٹھے ہو گئے۔ سب نے یہ تجویز پختہ کر رکھی تھی کہ اس مرتبہ امیر المومنین کو ہر صورت معزول یا قتل کر دینا ہے۔ مدینہ سے کچھ منزل دور یہ سارے قافلے یکجا ہو گئے۔ جب یہ قافلے مدینہ سے تین منزل دور تھے تو تین حصوں میں بٹ کر علیحدہ علیحدہ مقامات پر قیام پذیر ہو گئے۔ ایک حصہ حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہتا تھا۔ دوسرا حضرت زبیر بن عوامؓ کو خلافت دینا چاہتا تھا اور تیسرا حصہ حضرت طلحہؓ کو سریر خلافت پر متمکن دیکھنا چاہتا تھا۔

زیاد بن المنظر اور عبداللہ بن الرحم نے تمام بلوائیوں سے کہا کہ تم لوگ اپنے اپنے مقامات پر ٹھہر جاؤ۔ ہم پہلے مدینے میں داخل ہو کر اہل مدینہ کی حالت معلوم کر آئیں۔ کیونکہ ہمیں خبر پہنچی ہے کہ مدینہ والے جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہم مکمل ناکام ہو جائیں گے۔ اس پر سارے بلوائی خاموش ہو گئے اور یہ دونوں مدینہ میں داخل ہو گئے۔ یہ دونوں سبائی حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ اور امہات المومنینؓ سے ملے اور ان سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ سب نے ان کی ملامت کی اور واپس جانے کا حکم دیا۔

اس جگہ پر یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ عبداللہ بن سبا کے آدمی جو مدینہ منورہ میں موجود تھے۔ انہوں نے حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور امہات المومنینؓ کے نام سے بہت سے خطوط لکھ کر کوفہ، بصرہ اور مصر کے ان لوگوں کے نام روانہ کئے جو ان بزرگوں کے نام سے عقیدت رکھتے تھے اور عبداللہ بن سبا کے دام تزویر میں پورے اور یقینی طور سے پھنسے ہوئے تھے۔ ان خطوط میں لکھا گیا کہ حضرت عثمانؓ اس قابل نہیں رہے کہ ان کو تخت خلافت پر متمکن رکھا جاسکے۔ مناسب یہی ہے اور امتِ مسلمہ کی فلاح اس میں مضمر ہے کہ آنے والے ذوالحج میں اس ضروری کام کو سرانجام دے دیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ تینوں قافلے مدینہ منورہ میں ہر قسم کا فساد مچانے اور کشت و خون کرنے کے ارادے سے چلے تھے۔ تین ہزار آدمی کا کیا حوصلہ تھا کہ وہ

اس مدینۃ النبی پر تصرف کرتے اور زبردستی اپنے ارادے پورے کرنے کے عزم سے آتے۔ جس مدینہ میں جنگ احزاب کے وقت کثیر التعداد کفار داخل نہ ہو سکے تھے۔ ان بلوائیوں کی یہ دلیری اور دلیری تھی کہ مدینہ کے سب اکابر ہماری حمایت پر آمادہ ہیں اور ہم جو کچھ کریں گے گویا ان کے منشا کو پورا کریں گے۔ مدینہ میں جب ان کی آمد کو ہر ایک بزرگ نے نامناسب قرار دیا اور مدینہ میں کسی قسم کی مستعدی اور جنگی تیاری بھی نہ دیکھی تو بلوائیوں نے ان بزرگوں کی رائے کو مصلحت اندیشی پر محمول کیا اور واپس جا کر تمام بلوائیوں اور ان کے سرداروں کو جمع کیا اور مدینہ والوں کی طرف سے اطمینان دلا کر یہ تجویز پیش کی کہ مصر والے حضرت علیؓ کے پاس، کوفہ والے حضرت زبیرؓ کے پاس اور بصرہ والے حضرت طلحہؓ کے پاس جائیں اور ان سے درخواست کریں کہ ہم سے بیعت لے لیں اور حضرت عثمانؓ کی خلافت ہم کسی طور پر پسند نہیں کرتے۔ جب اس دعوتِ بیعت پر سب بزرگوں نے ناراضی کا اظہار کیا تو سبائیوں نے فوراً پینترا بدلا اور حضرت علیؓ سے مصر والوں نے کہا ہمارے ہاں کا عامل عبداللہ بن سعدؓ بڑا ظالم ہے۔ اسے تبدیل کرائے بغیر ہم واپس نہیں جائیں گے۔ بلوائیوں کے سرداروں کے اصرار اور جرأت کو دیکھ کر حضرت علیؓ اور دوسرے اصحاب کرام نے حضرت عثمانؓ سے درخواست کی کہ مدینہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے ان کا مطالبہ منظور کر لیا جائے اور عبداللہ بن سعدؓ کو منظر سے ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے نیا نام مانگا تو حضرت علیؓ نے محمد بن ابی بکر کا نام پیش کر دیا۔ بدقسمتی سے محمد بن ابی بکر اس حد تک سبائیوں کی گرفت میں آ چکے تھے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے بھائی کو حج پر ساتھ چلنے کو کہا تو محمد بن ابی بکر نے کوفہ جانے کا کہہ کر انکار کر دیا اور سبائیوں سے جا ملے۔ دوسری طرف محمد بن ابی بکر حضرت علیؓ کو پسند بھی کرتے تھے اور وہ حضرت علیؓ کے پروردہ بھی تھے۔

حضرت عثمانؓ نے محمد بن ابی بکر کو مصر کی امارت کا فرمان لکھ کر دے دیا۔ حضرت علیؓ اور دوسرے اصحاب نے بلوائیوں کے سردار کو سمجھایا کہ اب تمہاری مرضی پوری ہو چکی ہے۔ اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ چلے گئے لیکن پانچ روز کے بعد وہی تین ہزار سبائی غصہ سے بھرپور دوبارہ مدینہ میں داخل ہو گئے اور آتے ہی حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ اس پر حضرت علیؓ نے ان سے دوبارہ آنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے یہ ذمہ داری حضرت علیؓ پر ہی ڈال دی کہ آپ نے عبداللہ بن سعد کو لکھ بھیجا ہے کہ مصر پہنچتے ہی ان سب کے سر قلم کر دیئے جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو چٹھی تم دکھا رہے ہو مجھ سے حلف لے لو نہ مجھے اس کا علم ہے نہ میں نے لکھی ہے۔ پتہ چلا کہ اسے عثمان غنیؓ کے میر منشی مروان بن حکم نے لکھا ہے۔ بلوائیوں نے آپ سے تقاضا کیا کہ آپ خلافت سے دست بردار ہو جائیں۔ اگر آپ نے نہیں لکھا تو بھی آپ خلافت کے اہل نہیں۔ اتنا بڑا حکم آپ کے علم کے بغیر جاری ہو گیا اور آپ کو خبر تک نہ ہوئی۔ یہ بھی آپ کی نااہلی کا ثبوت ہے۔ غرض بلوائیوں کو اب بہانہ مل گیا تھا اور وہ کسی طرح بھی اپنے برے ارادوں سے ہٹنے والے نہیں تھے۔ ان کی خود سری اور سرکشی یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ انہوں نے حضرت علیؓ جیسی بزرگ ہستی کو بھی کہہ ڈالا کہ آپ قتل عثمانؓ میں ہماری مدد کریں۔

بلوائی مدینۃ الرسول ﷺ کی گلیوں میں دندناتے پھر رہے تھے۔ پہلے حضرت عثمانؓ کے پیچھے نمازیں بھی پڑھتے۔ اب انہوں نے امیر المومنین کے پیچھے نماز پڑھنے سے لوگوں کو روکنا شروع کر دیا۔ بلوائیوں نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر رکھا تھا اور گھر میں پانی کا جانا بھی بند کر دیا تھا۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو امامت کے لئے بھیجا۔ [illegible]

Marfat.com

دنوں کے بعد یہ سلسلہ بھی بند ہوگیا اور بلوائیوں کے سردار غافقی بن حرب عکی نے امامت کرانی شروع کر دی۔

اللہ کی حکمت اور مشیت کو خود اللہ ہی جانتا ہے۔ جب مدینہ کی گلیاں بلوائیوں کے جتھوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے صوبوں کے والیوں کو خطوط لکھ کر امداد طلب کی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ تمام صوبوں کے دارالخلافوں میں خبریں پہنچیں تو نیک نہاد لوگ مدینہ کی طرف چل پڑے۔ یہ لوگ رستے ہی میں تھے کہ امیر المومنین کی شہادت کی خبر ان تک پہنچ گئی اور وہ لوگ واپس چلے گئے۔

اسی طرح عبداللہ بن سعد نے ایک لشکر کے ساتھ مصر سے مدینہ کی طرف کوچ کیا۔ ابھی رستے میں ہی تھے کہ رملہ کے مقام پر انہیں خبر موصول ہوئی کہ محمد بن حذیفہ نے مصر پر قبضہ کر لیا ہے۔ غالباً محمد بن ابی بکر اور محمد بن حذیفہ ایک دوسرے کے ساتھی تھے جبکہ محمد بن ابی بکر پہلے ہی مدینہ آچکے تھے۔ سعد بن عبداللہ واپسی میں ابھی فلسطین پہنچے تھے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر مل گئی اور انہوں نے اپنا سفر ملتوی کر دیا۔

آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ لکھتے ہوئے کہ امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ کو ابن سبا اور اس کے ساتھیوں نے شہید کر دیا، آنکھوں سے جوئے خون جاری ہے۔ اے اللہ! تو ہی بہتر جانتا ہے کس طرح ایک خناس (ابن سبا) نے الزامات کی چنگاری کو بغاوت کا شعلہ بنایا اور پھر اس شعلے کو تیرے محبوب حضرت محمد ﷺ کی امت کے لئے تفرقے اور مصیبتوں کے جوالا مکھی میں تبدیل کر دیا۔

بلوائیوں کے اعتراض جتنے بھی تھے، حضرت عثمانؓ نے ایک ایک اعتراض کا جواب پوری تفصیل، جزرسی اور خدا ترسی سے دیا۔ حضرت عثمانؓ ایک عظیم مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنی عظمت کے حساب سے یہ بھی فرمایا کہ اگر کسی کا کوئی حق میرے طرف رہ جائے تو وہ صدقہ کر دے۔ اللہ صدقہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

عثمانؓ کا گھر چالیس دن تک بلوائیوں کے محاصرے میں رہا۔ بلوائیوں نے خلافت سے دست برداری پر زور دیا۔ آپ نے فرمایا کہ جو عزت کا تاج میرے مالک نے مجھے پہنایا ہے اس کو میں اپنے ہاتھ سے نہیں اتاروں گا۔ ساتھیوں نے بلوائیوں سے لڑنے کی اجازت مانگی تو فرمایا جو میرے لئے ہاتھ نہ اٹھائے وہی میرا ہمدرد ہے۔ فوج بلانے کے لئے کہا گیا تو فرمایا کہ میں رسول ﷺ کے ہمسائیوں کو فوج کی وجہ سے اذیت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ مدینہ سے شام چلے جانے کے لئے کہا گیا تو فرمایا میں دامانِ رسول ﷺ کسی صورت میں چھوڑوں گا۔

بالآخر ذہنی طور پر شہادت کے لئے تیار ہو کر ایسا لباس پہنا جو پہلے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ اس دن کئی غلام آزاد کئے۔ بلوائیوں کو یقین ہو چلا تھا کہ اگر ہم نے دیر کی تو افواجِ اسلام آ کر ہمیں برباد کر دیں گے۔ لہٰذا جلدی اور تیزی دکھائی اور اس وقت امت کے سرپرست سرکارِ دو عالمؐ کے محبوب کو 18 ذوالحج سنہ 35 ہجری کو اذیت ناک طریقے سے شہید کر دیا گیا۔ امیر المومنین کی شہادت کی پوری تفصیلات ہمارے موضوع کا حصہ نہیں ہیں۔ اس لئے ہم عبداللہ بن سبا کی داستان کو ختم کرنے سے پہلے حضرت عثمانؓ کی وہ تقریر نقل کرتے ہیں جو قیامت تک کے حالات کی پیش گوئی کرتی ہے۔ آپ بیاسی (82) سال کی عمر میں بارہ (12) سال خلافت کر کے شہید ہوئے۔ ابن سبا کا فتنہ خلافت کے نصف میں شروع ہوا اور آپ کی شہادت کے نتیجے

Marfat.com

میں کسی حد تک اختتام پذیر ہوا۔ آپ کی یہ تقریر جو زندگی کے آخری ایام میں کی گئی، بڑی اہم تقریر تھی۔ آپؓ نے فرمایا:

"لوگو! میرے قتل کے کیوں درپے ہو، میں تمہارا والی اور مسلمان بھائی ہوں، اللہ کی قسم جہاں تک میرے بس میں تھا میں نے ہمیشہ اصلاح کی کوشش کی لیکن بہر حال میں انسان ہوں، اس لئے اصابت رائے کے ساتھ لغزشیں بھی ہوئیں۔ یاد رکھو! اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو پھر تاقیامت ایک ساتھ نماز پڑھو گے، نہ ایک ساتھ جہاد کرو گے۔"

یہ تقریر درحقیقت پیش گوئی تھی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے ملت اسلامیہ کی وحدت میں جو رخنہ پیدا ہوا، آج تک بند نہ ہو سکا۔

مدینہ منورہ میں سبائی بلوائیوں کی حکومت

مصر، کوفہ اور بصرہ کے باغیوں نے جب سے مدینہ منورہ میں داخل ہو کر حضرت عثمانؓ کو گھر سے نکلنے اور مسجد میں آنے سے روک دیا تھا اسی روز سے مدینہ میں ان کی حکومت بالفعل قائم ہو گئی تھی۔ چونکہ خلیفہ وقت حالت محاصرہ ہی میں کیوں نہ ہو، موجود تھا۔ لہٰذا بلوائیوں کی غاصبانہ اور ظالمانہ حکومت کو جائز حکومت کے نام سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ میں قریباً ایک ہفتہ تک غافقی بن حرب مکی بلوائیوں کے سرداری کی حکومت رہی۔ وہی ہر ایک حکم جاری کرتا اور وہی نمازوں کی امامت کراتا تھا۔ ان بلوائیوں میں چند مآل اندیش بلوائیوں نے سوچا کہ اگر ہم اسی طرح قتل عثمانؓ کے بعد منتشر ہو گئے تو ہمارے لئے کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکل سکتا، ہم جہاں گئے قتل کر دیئے جائیں گے اور یہ شورش محض فساد اور بغاوت سمجھی جائے گی اور ہم اپنے عمل کو لوگوں کی نظروں میں جائز قرار نہیں دے سکیں گے۔ لہٰذا کسی کو جلد از جلد خلیفہ منتخب کرائے بغیر یہاں سے جانے کا نام نہ لو۔

انہی ایام شورش کے دوران کوفہ اور بصرہ سے بھی اس تجویز کے حامی لوگ روانہ ہو کر مدینہ پہنچ گئے۔ عبداللہ بن سبا بھی مصر سے روانہ ہو کر نہایت غیر معلوم طریقے سے مدینہ میں داخل ہو کر اپنے دوستوں اور ایجنٹوں میں شامل ہو گیا۔ چونکہ بلوائیوں کے اس لشکر میں تمام لوگ ایسے نہ تھے جو ابن سبا کو جانتے ہوں، لہٰذا مدینہ میں آ کر ابن سبا نے خود کوئی سرداری یا نمبرداری مصلحتاً حاصل نہیں کی بلکہ اپنے کارندوں کے ذریعے تمام مجمع کو متحرک کر کے اپنے حسب منشا کام لیتا رہا۔ یہ انتخاب خلیفہ کی تجویز ابن سبا کی تھی۔ چنانچہ یہ لوگ جمع ہو کر طلحہؓ، زبیرؓ اور علیؓ کے پاس الگ الگ گئے اور درخواست کی کہ آپ خلافت قبول فرمائیں اور ہم سے بیعت لے لیں۔ ہر ایک بزرگ نے خلافت قبول کرنے سے انکار کیا۔ آخر عبداللہ بن سبا کے شیطانی ذہن میں ایک تدبیر آئی اور اپنے آدمیوں سے یہ ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ اہل مدینہ ہی ارباب حل وعقد ہیں۔ انہی کے مشورے سے خلیفہ کا انتخاب ہوتا ہے اور ان کی بیعت کے بعد تمام مسلمان خلیفہ کی بیعت کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم اعلان کرتے ہیں اور اہل مدینہ کو آگاہ کرتے ہیں کہ تم کو صرف دو دن کی مہلت دی جاتی ہے، اس دوران کوئی خلیفہ منتخب کر لو۔ دو دن کے بعد ہم علیؓ، زبیرؓ اور طلحہؓ تینوں کو قتل کر دیں گے۔ اس اعلان کو سن کر مدینہ والوں کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ وہ بڑی بے تابی سے اپنے گھروں سے نکل کر حضرت علیؓ کے پاس پہنچ گئے۔ اسی طرح باقی دونوں بزرگوں کے پاس بھی مدینہ والوں کے وفود

Marfat.com

پہنچے۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے تو خلافت کا بار اٹھانے سے صاف انکار کر دیا لیکن لوگوں کے اصرار کے بعد حضرت علیؓ رضامند ہو گئے اور لوگ جوق در جوق بیعت کے لئے ٹوٹ پڑے۔ اہل مدینہ کے ساتھ بلوائیوں نے بھی حضرت علیؓ کی بیعت کر لی۔

خلافت کے تیسرے دن حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ کوفہ، بصرہ اور مصر اور دوسرے صوبوں سے آئے ہوئے تمام عرب واپس چلے جائیں۔ اس حکم کو سن کر عبداللہ بن سبا اور اس کی جماعت نے واپس جانے اور مدینہ خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ اکثر بلوائیوں نے ان کا ساتھ دیا۔ حقیقت میں حضرت علیؓ کی خلافت میں یہ سب سے پہلی بدفالی تھی کہ سبائیوں نے ان کے حکم کو نہ مان کر ثابت کر دیا کہ اپنے آپ کو حضرت علیؓ کا فدائی اور شیدائی ظاہر کرنا بالکل جھوٹ اور ان کی منافقت تھی۔

جنگِ جمل کے لئے حضرت علیؓ کی طرف سے تیار کردہ فوج میں عبداللہ بن سبا اور اس کے ساتھی بھی شامل تھے۔ حضرت علیؓ گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ سے نکلنے لگے تو مشہور صحابی عبداللہ بن سلامؓ گھوڑے کی باگ پکڑ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ آپ مدینہ سے نہ نکلیں۔ اگر مسلمانوں کا امیر مدینہ سے نکل گیا تو پھر لوٹ کر نہ آئے گا۔ اس پر ابن سبا اور اس کے ساتھیوں نے عبداللہ بن سلامؓ کو گالیاں دیں اور مارنے کو دوڑے۔ حضرت علیؓ نے انہیں مارنے سے روک دیا اور فرمایا کہ اسے چھوڑ دو۔ یہ نبی اکرم ﷺ کے صحابہ میں اچھا آدمی ہے۔

جنگِ جمل شروع ہونے سے پہلے صلح کی گفتگو کامیاب ہو چکی تھی۔ صبح سے اس قرارداد پر عمل ہونا تھا کہ حضرت علیؓ نے فرمایا، اب ہم جنگ کی آگ پر پانی ڈال دیں گے۔ ساتھ ہی آپ نے حکم دیا کہ جو لوگ حضرت عثمانؓ کے محاصرہ میں شریک تھے وہ ہمارے ساتھ کوچ نہ کریں بلکہ ہمارے لشکر سے علیحدہ ہو جائیں۔ یہ سن کر اہل مصر اور عبداللہ بن سبا کو بڑی فکر پیدا ہوگئی۔

حضرت علیؓ کی افواج میں ایسے لوگوں کی تعداد اڑھائی ہزار کے قریب تھی جن میں بڑے بااثر اور چالاک افراد بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کے سرداروں کو عبداللہ بن سبا نے الگ ایک خاص مجلس میں مدعو کیا۔ اس مجلسِ خاص میں عبداللہ بن سبا، ابن ملجم، اشتر اور اشتر کے خاص احباب اور سردار شریک تھے۔ ابن سبا نے کہا، اب تک طلحہؓ اور زبیرؓ ہی حضرت عثمانؓ کے قصاص کے خواہاں تھے، اب امیر المومنین بھی ان کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں۔ آج ہم کو جدا ہونے کا حکم مل چکا ہے۔ آپس میں ان کی صلح ہوگئی تو متفق ہونے کے بعد ہم سے ضرور قصاص لیں گے اور ہم سب کو سزا کے عمل سے گزاریں گے۔ اشتر نے کہا کہ حقیقت میں طلحہؓ، زبیرؓ اور علیؓ تینوں کی رائے ہمارے متعلق ایک ہی ہے۔ ان کی صلح تو ہمارے خون پر ہی ہو گی۔ لہٰذا میری تجویز ہے کہ ان تینوں کو بھی عثمانؓ کے پاس پہنچا دیں۔ ان کے ختم ہونے سے خود بخود امن ہو جائے گا اور ہم بھی محفوظ رہیں گے۔ صدرِ مجلس ابن سبا نے کہا تم لوگوں کی تعداد بہت کم ہے اور تم اپنے قتل والے مقصد کو پورا نہیں کر سکتے۔ ابن سبا کے ایک ساتھی سالم بن ثعلبہ نے کہا کہ ہمیں صلح ہونے تک کہیں الگ اور دور چلے جانا چاہیے۔ ابن سبا نے تمام رایوں سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا اور اس پر سب متفق ہو گئے۔ ابن سبا نے کہا کہ ہم سب کے لئے بہتر یہی ہے کہ ہم سب کے سب حضرت علیؓ کے لشکر میں ملے جلے رہیں۔ اگر وہ ہمیں جدا کر کے نکال بھی دیں تو ہم ان کے لشکر کے قریب ہی

Marfat.com

رہیں، زیادہ فاصلہ اختیار نہ کریں اور کہہ دیں کہ ہم اس لئے آپ کے قریب رہنا چاہتے ہیں کہ صلح نہ ہونے کی صورت میں لڑائی چھڑ جائے تو ہم بروقت جنگ میں شریک ہو کر آپ کی امداد کرسکیں۔ لشکر کے قریب رہ کر یا لشکر میں شامل ہو کر ہم کو کوشش کرنی چاہیے کہ دونوں لشکر جب ایک دوسرے کے قریب ہوں تو ان میں لڑائی چھڑ جائے اور صلح نہ ہونے پائے۔ یہ کام کچھ مشکل نہیں ہے۔ جس وقت فریقین آپس میں لڑ پڑیں گے تو ہمارے لئے کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور صلح کی ساری کارروائیاں ناکام ہوگئیں اور اس فتنۂ عالم آشوب کی حدت اور شدت اور بڑھ گئی بلکہ اتنی بڑھ گئی کہ آج تک ملتِ اسلامیہ اسے محسوس کر رہی ہے۔

جنگِ جمل ختم ہونے کے بعد حضرت عائشہؓ بصرہ سے واپس چلی گئیں۔ حضرت علیؓ نے بصرہ کا بیت المال کھولا اور اس کا تمام مال لشکریوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر ایک لشکری کو پانچ سو درہم ملے۔ حضرت علیؓ نے فوجیوں کو بتایا کہ اگر تم ملک شام کو فتح کرو گے تو تمہارا وظیفہ دگنا کر دیا جائے گا۔ یہ فیصلہ ایسے امیر المومنین کا تھا جسے اللہ کے رسول ﷺ نے علم کا دروازہ فرمایا تھا۔ سبائی گروہ یا فرقہ سبائیہ جنگ جمل ختم ہوتے ہی حضرت علیؓ کے خلاف بدزبانیاں شروع کر چکا تھا اور فوجوں میں رقم کی تقسیم کے بعد اور بھی دیدہ دلیر ہوگیا۔ اس فرقہ نے لوگوں کو حضرت علی کے خلاف اتنا بھڑکایا کہ آپ کے لئے ان شر پسندوں سے اعراض کرنا دشوار ہوگیا۔ آپ نے جس قدر اس گروہ کے لئے نصیحت اور فہمائش سے کام لیا ان کی شوخ چشمی میں اور اضافہ ہوا۔ نوبت بایں جا رسید کہ یہ لوگ ایک روز سب کے سب بصرہ سے نکل کر چل دیئے اور غائب ہو کر اپنی شر انگیزیوں میں مصروف ہوگئے۔ عبداللہ بن سبا نے اپنے آپ کو اور اپنے گروہ کو حضرت علیؓ کا فدائی ظاہر کر کے حضرت علیؓ کی محبت کے پردہ میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کا سامان کیا اور اسلام کو نقصان پہنچایا۔ اب دیکھا کہ حضرت علیؓ اور ان کی خلافت کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ استحکام کی طرف گامزن ہے تو سبائیوں نے ملتِ اسلامیہ کو نقصان پہنچانے کے لئے براہ راست حضرت علیؓ پر زبان درازیاں اور الزام تراشیاں شروع کر دیں۔ لہٰذا یہی لوگ آگے چل کر خارجی گروہ میں تبدیل ہوگئے۔ صدیوں تک خارجیوں کا گروہ بھی قلعۂ اسلام کو ہر انداز سے نقب لگاتا رہا۔ آج بھی اس کے انڈے بچے اسلامی ممالک میں مختلف ناموں سے موجود ہیں۔

فرقہ سبائیہ کے لوگ علی الاعلان مخالفت کر کے بصرہ سے فرار ہوئے اور بہت جلد عراق، عرب کے مختلف مقامات میں منتشر ہو کر اوباشوں اور موقع پرست لوگوں کو ساتھ ملا لیا اور ایک معقول جمعیت فراہم کرلی۔ سب سے پہلے انہوں نے سجستان کا رخ کیا۔ ان کا مقصد وحید یہ تھا کہ خلفیۂ اسلام کے خلاف ایران کے تمام صوبوں میں بغاوت یا بغاوت کی فضا پیدا کر دیں تاکہ حضرت علیؓ نہ تو کوئی متحدہ اسلامی ریاست قائم کر کے مسلمانوں کو دوبارہ طاقتور بنا سکیں اور نہ ملک شام پر حملہ کر کے فتح حاصل کرسکیں۔ حضرت علیؓ نے سجستان کی طرف ان لوگوں کی توجہ کا سن کر عبدالرحمن طائی کو ان لوگوں کے استیصال کے لئے بھیجا۔ عبدالرحمن طائی شہید ہوگئے اور یہ لوگ قابو میں نہ آئے۔ اس کے بعد ربعی بن کاس چار ہزار کا لشکر لے کر ان کے تعاقب میں نکلے اور انہیں منتشر کر دیا۔ اس عرصہ میں جنگِ صفین کے لئے فریقین میں تیاریاں شروع ہوگئیں اور ان مسلم نما یہودیوں نے حضرت علیؓ کے لشکر میں بھی خفیہ طریقوں سے شامل ہونا ضروری سمجھا تاکہ بوقت ضرورت جنگ کی بھٹی کو گرم کیا جا

Marfat.com

سکے اور مسلمانوں کے سارے گروہ شیر وشکر نہ ہو سکیں۔

کوشش بسیار کے باوجود ہمیں تاریخ کی کتابوں میں ابن سبا کی موت کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔ لہٰذا اس کا ذکر ناما نوس یہیں ختم کرتے ہیں۔ اس کا ذکر ختم ہو گیا لیکن اس کی لگائی ہوئی آگ ملت اسلامیہ کے خرمن اتحاد کو ہمیشہ جلاتی رہے گی۔ العیاذ باللہ

Marfat.com

مروان بن حکم

(4 ہجری تا 65 ہجری)

مروان بن حکم بن العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف 4 ہجری میں پیدا ہوا۔ ماں کا نام آمنہ بنت علقمہ بن صفوان تھا۔ ترتیب زمانی کے لحاظ سے حضرت امیر معاویہؓ کے بعد آنیوالا پہلا خلیفہ تو یزید بن معاویہؓ تھا لیکن ہم اس داستان کو مروان بن حکم سے اس لئے شروع کر رہے ہیں کیونکہ مروان یزید کی خلافت سے کہیں پہلے عملی زندگی میں قدم رکھ چکا تھا اور اس کی کارستانیوں کی تپش حضرت عثمانؓ کے دور سے شروع ہو چکی تھی۔

مروان کا والد حکم بن العاص حضرت عثمانؓ کا حقیقی چچا بظاہر فتح مکہ کے بعد مسلمان ہو چکا تھا لیکن ایمان نے اس کے دل میں جگہ نہیں پکڑی تھی۔ دورِ نبوتؐ میں حکم مسلمانوں کی جاسوسی کرتا اور سرکارِ دو عالمؐ کی نقلیں اتارتا۔ حکم کی ان اسلام دشمن حرکات کی وجہ سے نبی رحمتؐ نے دونوں باپ بیٹے کو شہر بدر کر کے طائف بھیج دیا۔ اس وقت مروان سات سال کا ہو چکا تھا۔

حضرت عثمانؓ 24 ہجری میں خلیفہ بنے تو دونوں کو مدینہ لے آئے۔ آپ نے آنحضورؐ سے مروان اور حکم کو مدینہ لانے کی اجازت لے رکھی تھی۔ خلافتِ عثمانؓ کے وقت مروان کی عمر قریباً بیس سال تھی۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے پیارے چچازاد کو میر منشی بنا لیا۔ مروان نے حضرت عثمانؓ کے پیار کی وجہ سے بہت جلد ان کے مزاج میں رسوخ حاصل کر لیا۔ مروان دربار خلافت سے عمل درآمد کیلئے احکامات حاصل کرتا۔ علاوہ ازیں روزانہ کے معاملات چلانے کے لئے خود بھی احکامات نافذ کرتا۔ ہر دو صورتوں میں مروان کا والد حکم تمام معاملات میں دخیل ہو کر اثر انداز ہوتا۔ جس سے مدینہ میں مقیم اصحاب الرائے حضرات حضرت عثمانؓ سے بدگمانی کی حد تک پریشان رہنے لگے۔

مروان حکم کا بیٹا ہونے کے ناطے فتنہ پرور تو تھا ہی لیکن اس کی فتنہ پروری کی انتہا ہو گئی۔ جب اس نے حاکم مصر کو حضرت عثمانؓ کی اجازت کے بغیر ان کی مہر استعمال کرتے ہوئے خط لکھ دیا کہ بلوائی جونہی مصر پہنچیں ان کے سر قلم کر دیئے جائیں۔ یہ خط حاکم مصر کے پاس پہنچنے سے پہلے سبائی بلوائیوں نے پکڑ لیا اور اسی کو بہانہ بنا کر خلیفہ راشد حضرت عثمانؓ کو شہید کر ڈالا۔ مروان کی اس شرارت سے مسلمانوں میں فتنوں کا ایسا طوفان اٹھا جسے آج تک زیر نہیں کیا جا سکا۔

Marfat.com

حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ صدیقہ کی جنگِ جمل کے بعد صلح ہو چکی تھی۔حضرت زبیرؓ نے حضرت علیؓ کی زبانی حدیث رسول ﷺ سنی جس میں حضرت زبیرؓ کو حضرت علیؓ سے لڑنے سے منع کیا گیا تھا۔حدیث مبارکہ سننے کے بعد حضرت زبیرؓ جنگ سے بالکل علیحدہ ہو گئے تھے۔حالات کا یہ رنگ دیکھ کر ابن جرموز نامی سبائی آپ کے پیچھے چل پڑا۔ایک بادیہ میں حضرت زبیرؓ نماز میں مصروف اور سربسجود تھے،ظالم نے ایسی تلوار ماری کہ سر دھڑ سے الگ ہو گیا۔سر اور تلوار لے کر ابن جرموز حضرت علیؓ کے پاس آیا۔آپؓ آبدیدہ ہو گئے۔فرمایا یہ وہی تلوار ہے جس نے کئی دفعہ آنحضرت ﷺ کے چہرہ سے مشکلات کا بادل ہٹایا۔

حضرت طلحہ بھی واپسی کا عزم کر رہی تھے کہ مروان کی نظر پڑ گئی۔سمجھا کہ ان کی زندگی خاندان اموی کے لیے سنگ راہ ہے۔زہر میں بجھا ہوا ایک تیر ایسا تاک کر مارا کہ گھٹنے میں پیوست ہو گیا۔خون کسی طرح تھم نہیں رہا تھا۔آخر اسی حالت میں جان دے دی۔کر دیا۔اس طرح مروان نے سبائی کی طرح اپنی فردِ جرم میں ایک شہید کے خون کا اضافہ کر لیا۔

مروان بطور گورنرِ مدینہ منورہ

امیر معاویہؓ نے 41 تا 59 ہجری میں اپنی حکومت کے دوران مروان کو مدینہ منورہ کا گورنر مقرر کیا۔اموی ہونے کے ناطے یہ امیر معاویہؓ کا چہیتا بھی تھا۔حسبِ معمول مروان نے اہل مدینہ کو راحت پہنچانے کی کبھی کوشش نہ کی بلکہ اپنی اذیت ناک حرکتوں سے اہلِ مدینہ کو پریشان کیئے رکھا اور کبھی بھی اپنے اعمال کو سنوارنے کی کوشش نہ کی۔سیدہ عائشہؓ صدیقہ کے نزدیک مروان کا طرزِ عمل نہایت ناپسندیدہ تھا۔وہ اس پر تنقید بھی کیا کرتی تھیں اور مروان ان کے لئے دل میں کینہ رکھتا تھا۔چنانچہ وہ ام المومنینؓ کے درپے آزار ہو گیا۔اس نے سیدہ عائشہؓ کو دعوت پر بلایا اور ان کے آنے سے پہلے ایک گڑھا کھدوایا جس میں ننگی تلواریں اور خنجر ڈال دیئے اور دھوکے سے ام المومنینؓ کو گڑھے میں گرا دیا جس سے وہ شدید زخمی ہو گئیں۔آپ بہت ضعیف اور بوڑھی ہو چکی تھیں زخموں کی تاب نہ لاسکیں اور فوت ہو گئیں۔خاندانِ نبوت سے مروان کی طرف سے دشمنی اور کینے کا پہلا اظہار ہوا۔

حضرت حسنؓ نے حضرت عائشہؓ صدیقہ سے سرکارِ دو عالم ﷺ کے پاس دفن ہونے کی اجازت لے رکھی تھی۔آخری ایام میں حضرت حسینؓ سے فرمایا کہ میری وفات کے بعد دوبارہ اجازت لینا۔حضرت عائشہؓ نے دوبارہ بھی یہ اجازت مرحمت فرما دی۔مروان نے جب یہ خبر سنی تو وہ مانع ہوا۔حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھی مسلح ہو کر مروان کی طرف چلے۔اس وقت حضرت ابو ہریرہؓ درمیان میں آ گئے اور حضرت حسینؓ کو سمجھا کر کشت و خون سے باز رکھا۔چنانچہ حضرت حسنؓ کو ان کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہؓ کے پاس دفن کر دیا۔یہ واقعہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ مروان خاندانِ نبوت کے ساتھ دشمنی کا اظہار کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہا۔

امیر معاویہؓ نے 18 سال حکومت کی۔اپنی حکومت کے آخری ایام میں انہوں نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانے کا پروگرام بنایا۔انہوں نے سب سے پہلے یہ تجویز مروان بن حکم کے سامنے رکھی اور لکھا کہ اس سلسلے میں تمہارا مشورہ ضروری ہے۔اس معاملے کو اہل مدینہ کے سامنے رکھو اور ان کے جواب سے مجھے آگاہ کرو۔تجویز کی حد تک اہل مدینہ نے اتفاق

Marfat.com

کیا۔امیر معاویہ نے دوبارہ لکھا کہ اب اس ولی عہدی اور جانشینی کے لئے یزید کا نام پیش کرو۔یزید کا نام سنتے ہی تمام اصحاب الرائے اہل مدینہ نے اس تجویز سے سخت اختلاف کیا۔مروان نے یزید کی نامزدگی کے لئے حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے حضرت عمرؓ کی نامزدگی والی مثال پیش کی۔عبدالرحمن بن ابی بکر نے فرمایا کہ یزید کی نامزدگی ابوبکرؓ اور عمرؓ کی سنت نہیں ہے۔انہوں نے اپنی اولاد کو ہمیشہ خلافت سے دور رکھا۔تم اور معاویہؓ قیصر و کسریٰ کا طریقہ رائج کرنا چاہتے ہو،تاکہ ایک ہرقل کے بعد دوسرا ہرقل آئے۔مروان نے یہ حالات امیر معاویہؓ کو لکھ بھیجے۔گویا یزید کی منحوس خلافت کو قائم کرنے کے لئے پہلی اینٹ مروان ہی نے رکھی۔

یزید بن معاویہؓ نے حکومت سنبھالتے ہی ولید بن عتبہ حاکم مدینہ کو لکھا کہ حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن زبیر سے بیعت لے کر مجھے اطلاع دو۔ولید نہایت دیدہ ور شخص تھا اور کسی بھی خون خرابے سے بچنا چاہتا تھا۔اس نے مروان سے مشورہ کیا تو مروان کا جواب تھا کہ دونوں کو بلاؤ اور یزید کی بیعت کے لئے کہو اگر نہ مانیں تو دونوں کا سر قلم کردو۔گویا مروان شروع ہی سے حکومت کو بنی امیہ میں رکھنے اور اس کے حصول کے لئے نواسہ رسول ﷺ اور عبداللہ بن زبیرؓ جیسے مشہور صحابی کا خون بھی مباح سمجھتا تھا۔قلم لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ بندہ خاندانِ نبوت کا یزید سے بڑا دشمن تھا۔

64 ہجری میں یزید کا انتقال ہو گیا۔اس وقت امویوں میں کوئی بھی ایسا باہمت اور جرأت مند شخص نہیں تھا جو خلافت کا دعوے دار بن سکتا۔عملاً عبداللہ بن زبیر کو تمام عالم اسلام برحق خلیفہ ماننے کو تیار تھا لیکن ابن زبیرؓ کو بنی امیہ سے اتنی نفرت تھی کہ وہ کسی بھی اموی کو مدینہ میں دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔اس وقت مروان کا بیٹا عبدالملک چیچک کے مرض میں مبتلا تھا اور مروان اس کے ساتھ مدینہ میں ٹھہرنے کے لئے مجبور تھا لیکن ابن زبیر نے دونوں کو فوری نکل جانے کا حکم دیا وہ اس بات کو بھول گئے کہ مروان ہی بنی امیہ کا سب سے بڑا شاطر ہے،اسے نہ چھوڑا جائے۔مروان اپنے بیٹے کو لے کر نکل گیا۔بعد میں ابن زبیرؓ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔اس کے پیچھے آدمی دوڑائے لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔تیر کمان سے نکل چکا تھا اور بنی امیہ کی خلافت جو کہ بالکل ختم ہو چکی تھی مروان کے مدینہ سے نکل جانے کے بعد اس کے دوبارہ بحال ہونے کے حالات پیدا ہو گئے۔

مدینہ سے نکل کر مروان سیدھا شام پہنچا۔یہاں حالات بڑے نازک تھے۔شام کے تمام اضلاع میں ابن زبیرؓ کا اثر تھا اور ہر ضلع میں ان کے داعی اور عمال موجود تھے۔امویوں میں کسی طرح کا اتفاق نہیں تھا اور نہ ہی مروان کے لئے صورت حال حوصلہ افزاء تھی۔ان حالات میں مروان نے ابن زبیرؓ کی بیعت کا فیصلہ کرلیا۔ابھی بیعت نہیں ہوئی تھی کہ عبیداللہ بن زیاد شام میں مروان کے پاس پہنچ گیا اور اسے قریش کی سرداری کا حوالہ دے کر بیعت سے روک دیا اور ساتھ ہی کہا کہ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہمیں اپنی حکومت کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔اس کے بعد اموی عمائدین مروان کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے اور شام میں مقام جابیہ پر خلافت کا مسئلہ طے کرنے کے لئے بحث و تمحیص کی مجلس منعقد کی گئی۔بنی امیہ میں اس وقت مروان سے زیادہ جہاندیدہ اور عمر رسیدہ کوئی اور نہ تھا۔لہٰذا سب نے مروان کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور بنو امیہ جو منتشر ہو چکے تھے دوبارہ مروان کے نام پر متحد ہو گئے۔اس لئے مروان کو دولت امیہ کا مجدد بھی کہا جاتا ہے۔

بیعت خلافت کے بعد مروان نے شام اور مصر پر بڑی آسانی سے قبضہ کرلیا۔ مروان کی خلافت کے وقت یہ بھی طے کرلیا گیا تھا کہ مروان کے بعد علی الترتیب خالد بن یزید اور عمرو بن سعید خلیفہ بنیں گے لیکن چند مہینوں کے بعد مروان نے ان دونوں کو ولی عہدی سے خارج کر کے اپنے دو بیٹوں عبدالملک اور عبدالعزیز کو ولی عہد بنادیا۔

رمضان 65 ہجری میں مروان دفعتہً بغیر کسی علالت کے انتقال کرگیا۔ عام خیال یہی ہے کہ خالد بن یزید کی ماں نے اسے مار ڈالا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ خالد کی تذلیل کے لئے مروان نے اس کی ماں یزید بن معاویہؑ کی بیوہ سے شادی کرلی تھی اور ساتھ ہی اسے خالد کی ولی عہدی بھی اسے برابر کھٹکتی تھی۔ ایک دفعہ مروان نے علی الاعلان خالد اور اس کی ماں کے لئے بڑے سخت الفاظ استعمال کئے۔ خالد نے اپنی ماں سے شکایت کی تو ام خالد نے اپنے شوہر مروان کو گلا گھونٹ کر یا زہر دے کر مار ڈالا۔ مروان کی خلافت صرف 9 ماہ کا عرصہ رہی۔ جب وہ فوت ہوا تو اس کی عمر 62 سال تھی۔

Marfat.com

یزید بن معاویہؓ (یزید اوّل)

(60ھ/680ء تا 64ھ/683ء)

یزید بن معاویہؓ—امیر معاویہؓ کا بیٹا اور دولت امویہ کا دوسرا بادشاہ خلیفہ میسون بنت بحدل کے بطن سے تھا۔ اس کی پیدائش امیر معاویہؓ کے دورِ امارت میں ہوئی۔ امیر معاویہؓ شام جیسے امیر ملک کے گورنر تھے۔ یزید نے آنکھ کھولی تو وہ عیش وتنعم میں گھرا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی پرورش اور زندگی شاہزادوں اور امیر زادوں جیسی تھی۔ سیر وشکار کا بڑا شوقین تھا، باپ نے فن سپہ گری بھی سکھایا تھا۔ اسی لئے قسطنطنیہ کی مشہور مہم میں بھی شریک ہوا۔ ایک روایت کے مطابق اس فوج کا سپہ سالار بھی تھا۔

خلافت

امیر معاویہؓ اپنی زندگی ہی میں یزید کے لئے عامۃ الناس سے بیعت لے چکے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد یزید رجب 60 ہجری میں تخت نشین ہوا۔

حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ سے بیعت کا مطالبہ

یزید کی خلافت کے وقت حضرت حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ ہی دو ایسے بزرگ تھے جن کا پورے عالم اسلام میں اثر بھی تھا، خلافت کے حق دار بھی تھے اور دعوے دار بھی بن سکتے تھے اور ان کی وجہ سے یزید کی ولی عہدی کا سارا کاروبار حکومت زمین بوس ہونے کا امکان تھا۔ یزید نے حاکم مدینہ ولید بن عتبہ کو حکم دیا کہ اولین فرصت میں دونوں بزرگوں سے بیعت لے کر اطلاع دو۔ ولید بن عتبہ نے مروان سے مشورہ کیا، مروان کا مشورہ تھا کہ ان دونوں بزرگوں سے فوراً بیعت لے لو، تامل کریں تو ان کے سر قلم کر دو۔ اگر امیر معاویہؓ کو موت کی خبر عام ہوگئی تو ہر جگہ خلافت کے دعوے دار کھڑے ہو جائیں گے، اس لئے جلدی کرو۔ ولید نے دونوں بزرگوں کو بلا بھیجا۔ ابھی امیر معاویہؓ کی موت کی خبر نہیں پہنچی تھی۔ اس بلاوے سے دونوں بزرگوں کو اس کا اندازہ ہو چکا تھا۔

دونوں بزرگ بلاوے کا مطلب سمجھ چکے تھے تاہم وہ ولید کے پاس پہنچ گئے تو اس نے خود امیر معاویہؓ کی موت کی خبر سنائی اور ساتھ ہی یزید کا حکم سنایا۔ حضرت حسینؓ نے (اناللہ) پڑھا، امیر معاویہؓ کے لئے دعا کی۔ پھر فرمایا کہ میرے جیسا آدمی

چھپ کر بیعت نہیں کر سکتا اور نہ میرے لئے یہ زیبا ہے۔جب عام لوگوں کو بلاؤ گے اس وقت میں بھی آجاؤں گا۔ولید نیک فطرت اور امن پسند شخص تھا، راضی ہو گیا اور آپ لوٹ گئے۔

عبداللہ بن زبیرؓ ایک دن کی مہلت لے کر راتوں رات مکہ کو نکل گئے۔ولید کو خبر ہوئی تو اس نے آدمی دوڑائے لیکن ابن زبیرؓ دور جا چکے تھے۔مکہ پہنچ کر وہ حرم میں پناہ گزین ہو گئے۔

مروان نے بیعت لئے بغیر دونوں بزرگوں کو چھوڑے جانے پر ولید کی بڑی ملامت کی اور کہا بیعت لینے کا موقع تو تم نے کھو دیا اب قیامت تک تم ان پر قابو نہیں پا سکتے۔اس نے جواب دیا کہ میں حسینؓ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہیں کر سکتا تھا۔

حضرت حسینؓ کا سفر مکہ

حضرت حسینؓ، یزید کی غیر شرعی اور موروثی بادشاہت کو کسی طور بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے لیکن مدینہ میں ان کے لئے بیعت کرنا ضروری تھا۔اس کے بغیر آپ کا قیام ناممکن ہو چکا تھا۔اس صورت حال میں آپ محمد بن حنفیہ کے مشورہ سے مع اہل وعیال شعبان 60 ہجری میں مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔جب آپ مدینہ اور دامانِ رسول ﷺ سے دور جانے کی تیاری کر رہے ہوں گے اس کرب کو امام حسینؓ خود محسوس کر رہے ہوں گے یا اللہ۔راستہ میں ایک محب اہل بیت عبداللہ بن مطیع سے ملاقات ہوئی۔انہوں نے پوچھا کہاں کا قصد ہے، فرمایا مکہ جاتا ہوں۔

ابن مطیع نے فرمایا وہاں جانے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن خدارا کوفہ نہ جانا۔وہاں کے لوگ بڑے غدار ہیں، انہوں نے آپ کے والد بزرگوار اور محترم بھائی کو دھوکا دیا۔آپ اہل حجاز کے سردار ہیں، حرم میں بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ لوگوں کو اپنی دعوت دیں۔حرم کا گوشہ ہرگز نہ چھوڑیں۔مکہ پہنچ کر آپ نے شعب ابی طالب میں قیام فرمایا۔

اہلِ کوفہ کے دعوتی خطوط اور مسلم بن عقیل کا سفر کوفہ

قارئین کی دلچسپی کے لئے اس موضوع سے پہلے ہم ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کر رہے ہیں۔حضرت علیؓ کی خلافت کے مخالفین میں حضرت امیر معاویہؓ سب سے آگے تھے، حضرت عقیلؓ حضرت علیؓ کے سگے بھائی تھے۔جب حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان جنگ ختم ہو گئی تو دونوں بھائیوں میں کسی مرحلے پر اختلاف نے جنم لیا اور عقیلؓ حضرت معاویہؓ کے طرفدار بن گئے، انہی عقیلؓ کے بیٹے حضرت مسلمؓ تھے جنہیں حضرت حسینؓ نے اپنا خط دے کر اور اپنا ایلچی بنا کر کوفہ بھیجا۔

عراق میں شیعانِ علیؓ ابتدا ہی سے حضرت امیر معاویہؓ اور ان کی خلافت کے خلاف تھے۔ان کی وفات کے بعد کوفہ والے خلافت کا منصب اہل بیعت کو منتقل کرنے کے لئے سرگرم ہو گئے اور حضرت حسینؓ کے مکہ پہنچنے کے بعد آپؓ کے پاس بلاوے کے خطوط بھیجے۔پھر عمائدین کوفہ نے خود آ کر حضرت حسینؓ کو کوفہ چلنے کی درخواست کی۔ان کی درخواست پر آپ نے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو حالات کی تحقیق کے لئے اپنا خط دے کر کوفہ بھیجا۔خط میں لکھا تھا کہ:

"تمہارے خطوط ملے، تمہاری خواہش معلوم ہوئی، اپنے بھائی مسلم بن عقیل کو حالات کی تحقیق

Marfat.com

کے لئے بھیج رہا ہوں۔ جیسا کہ تم نے لکھا ہے اور تمہارے آدمیوں نے بیان کیا ہے، اگر واقعی تم میری خلافت پر متفق ہو تو مسلم وہاں کے حالات دیکھ کر مجھے اطلاع دیں گے اور میں فوراً آجاؤں گا۔"

یہ خط لے کر مسلم کوفہ پہنچے اور مختار بن ابی عبید کے گھر میں قیام کیا۔ ان کی آمد کی خبر سن کر شیعانِ علی نے مختار کے گھر آنا شروع کر دیا۔ کوفہ کے حاکم نعمان بن بشیر کو اس کی خبر ہو گئی لیکن وہ بڑے دین دار، نیک فطرت اور امن پسند آدمی تھے۔ اس لئے کسی قسم کی سختی نہیں کی۔ لوگوں کو بلا کر انہیں یہ بات سمجھا دی کہ:

"فتنۂ اختلاف میں نہ پڑو، اس میں جان و مال دونوں کی ہلاکت اور بربادی ہے۔ جب تک کوئی شخص میرے مقابلہ میں کھڑا نہیں ہوگا۔ اس وقت تک میں محض بدگمانی پر کسی سے باز پرس نہ کروں گا۔"

عبیداللہ بن زیاد کی آمد

یزید کے جاسوسوں نے یزید کو کوفہ میں مسلم بن عقیل کی سرگرمیوں کی اطلاع دی اور انہیں حکومت یزید کو تہہ و بالا کرنے والا انقلاب قرار دیا۔ اس پر یزید نے اپنے ترکش کا سب سے زیادہ زہر آلود تیر خانوادہ رسول ﷺ کی طرف پھینکا۔ یعنی عبیداللہ بن زیادہ والیٔ بصرہ کو کوفہ کی امارت کا پروانہ دے کر بھیجا اور ساتھ ہی حکم دیا کہ مسلم بن عقیل کے پیدا کردہ انتشار کو ختم کرنے کے لئے اسے گرفتار کرو اور قتل کر دو۔

ابن زیادہ نے سازش، حیلہ بازی، طاقت اور دولت کے تمام حربے استعمال کر کے حضرت مسلم بن عقیل کو گرفتار کرلیا۔ کوفیوں کی وفاداری کا یہ عالم تھا کہ جب مسلم بن عقیل ہانی کے مکان سے نکلے تو آپ کے ساتھ آنے والوں کی تعداد 18 ہزار سے زائد تھی۔ ابن زیاد کی پہلی للکار کے بعد ان کی تعداد تیس رہ گئی اور بالآخر مسلم تن تنہا لڑتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ مسلم کا قریبی عزیز عمرو بن سعد اموی حکام میں سے تھا۔ انہوں نے اس کو وصیت کی کہ میں نے کوفہ سے سات سو درہم قرض لئے تھے وہ انہیں ادا کر دینا اور میری لاش دفن کرنے کے بعد حضرت حسینؓ کو اطلاع دے کر راستہ سے واپس کر دینا۔ اس کے بعد ابن زیاد نے مسلم کو قتل کر دیا۔ اس قتل نے حسینؓ کا ایک بازو توڑ دیا۔

مسلم نے حضرت حسینؓ کو کوفہ کے حالات کی اطلاع دے کر کوفہ بلا بھیجا تھا۔ اس اطلاع پر آپ نے کوفہ کے سفر کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔ آپ کے اعزہ اور بہی خواہ سب کوفیوں کی عادت سے واقف تھے، انہوں نے آپ کو کوفہ کے سفر پر روانگی سے روکنے کے لئے پوری کوشش کی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ کوفہ نہ جائیں، یمن کو نکل جائیں، الگ علاقہ ہے، محفوظ رہیں گے۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے فرمایا کہ آپ حجاز کے سردار ہیں، مکہ میں رہ کر خلافت کے لئے کوشش کریں، ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ آپ کے چچیرے بھائی عبداللہ بن جعفرؓ نے گورنر مکہ عمرو بن سعید اموی سے خط لکھوا کر بھیجا کہ آپ لوٹ آئیں، اس راہ میں ہلاکت ہے۔ میں ہر طرح آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں، آپ مکہ میں رہیں، آپ کی ہر طرح کی مدد کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ لیکن مشیت کے فیصلے کے آگے ساری ہمدردیاں، آرزوئیں اور نصیحتیں بے اثر ہو گئیں اور آپ کو حالات نے میدان کربلا میں پہنچا دیا۔ بے غبار حقیقت یہ ہے کہ آپ صرف حکومت نہیں خلافت اور خلافت بھی خلافت

Marfat.com

راشدہ والی کے متمنی تھے۔ جہل وضلالت کی حکومت کے خلاف لڑنا اور اسے کسی صورت قبول نہ کرنا ان کی زندگی کا مقصد تھا۔

ابن زیاد اور اس کے ساتھیوں عمرو بن سعد، شمر ذی الجوشن اور ایسے ہی لعینوں کے لشکر نے میدان کربلا میں ریحانت الرسول ﷺ کو چاروں طرف سے گھیر کر شہید کر دیا، سرتن سے جدا کر دیا اور اسے ابن زیادہ کے پاس بھیجا۔ اس نے اس سر کو یزید کے پاس بھیج دیا۔ آپ کی لاش پر گھوڑے دوڑائے گئے۔

یزید کی زندگی کے بدترین افعال میں سے حضرت حسینؓ کا شہید کرنا تھا۔ یہ عمل یزید کی بے دینی، بے حیائی اور قطع رحمی کی انتہا تھی۔ اس کے اور اعمال جن کے متعلق فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ زیادہ شنیع تھے یا یہ عمل قتل۔ یہ وہی قطع رحمی تھی جس کے متعلق احمد بن حنبلؒ نے اپنے بیٹے کے استفسار پر یزید کو لعنت کا مستحق قرار دیا۔ شہادت حسینؓ سے قریباً پچاس سال پہلے حضرت حسینؓ کے نانا سرورِ دو عالم ﷺ نے یزید کے سارے خاندان یعنی ابوسفیان کی اولاد پر جو مہربانیاں کی تھیں، یہ بے حیا شخص انہیں ہی ذہن میں لے آتا تو انسانیت سوز جرم کا ارتکاب نہ کرتا۔ کہتے ہیں کہ شہادت کے بعد اسے بڑا افسوس ہوا اور عبید ابن زیاد کو بددعائیں دیتا رہا۔ یہ سب جھوٹ ہے، کیا اس نے ابن زیاد کو عہدے سے برطرف کیا، نہیں! کیا اسے کوئی سزا دی، نہیں! بلکہ اس کے بعد سے حجاز کے لوگوں کے قتل عام کے لئے بھی اسی کا انتخاب کیا۔ لیکن وہ جلد ہی دوزخ کو سدھار گیا۔ یزید کی بدقماشی اور اپنی ظالمانہ اور بہیمانہ اعمال کی وجہ سے اس وقت بھی عمائد امت اس کے مسلمان ہونے پر بھی کلام کرتے تھے۔ غرض اس نے جہاں خانوادہ رسول ﷺ کو شہید کیا، زندہ رہنے والوں کا سامان لوٹ لیا اور حجاز والوں کو اپنی بربریت کا شکار بنایا۔ اس پر جتنی بھی لعنت اور نفرین بھیجی جائے کم ہے۔

ایک اور واقع جو یزید کی بدکرداری، مسلم دشمنی، اسلام دشمنی اور بہیمیت کا کھلا ثبوت ہے، وہ حُرہ کا واقعہ ہے۔ حُرہ کا علاقہ اب بھی موجود ہے۔ یزید کے وقت یہ علاقہ مدینہ کے باغات سے ہوتا ہوا شمال مشرقی جانب پھیلا ہوا تھا۔ اسی جگہ سے حرم مدینہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اسے حُرہ واقم بھی کہتے ہیں۔ اہل مدینہ یزید کو فاسق و فاجر اور ظالم سمجھتے تھے۔ شہادتِ امام حسین کے بعد پورے حجاز میں اس کے خلاف بغاوت ہوگئی۔ عثمان بن ابی سفیان جسے یزید نے مدینہ کا گورنر مقرر کیا، حالات پر قابو نہ پاسکا۔ یزید نے اہل مدینہ کے ایک وفد کو دعوت دی تاکہ مصالحت کی کوئی صورت نکالی جاسکے۔ اس نے وفد سے بڑی فیاضی کا سلوک کر کے اس کی دل جوئی کی کوشش کی لیکن کوئی تدبیر بھی کارگر نہ ہوسکی۔

اس پر یزید نے حجاز کی طرف مسلم بن عقبہ المری کی سربراہی میں ایک فوج بھیج دی جس کی تعداد چار ہزار سے بارہ ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ مدینہ والوں نے عثمان بن ابی سفیان کو مدینہ سے نکال دیا اور طے پایا کہ مدینہ میں مقیم بنو امیہ کے تمام افراد کو قتل کرنے کی بجائے مدینہ کے حالات کو افشانہ کرنے کی قسم لے کر انہیں مدینہ سے نکل جانے دیا جائے۔ مدینہ والوں نے قتل سے اس لئے پرہیز کیا کہ قتل کی صورت میں شامی فوجیں آجائیں گی اور حالات زیادہ خراب ہو جائیں گے۔ مسلم بن عقبہ نے مدینہ کے باہر پڑاؤ ڈالا اور ہر آنے والے سے مدینہ کے لوگوں کی فوجی تیاری کے متعلق معلومات لینے کی کوشش کرتا لیکن سب اپنی قسم کا واسطہ دے کر نکل گئے۔ بالآخر مسلم نے مدینہ سے باہر جانے والوں سے اس شخص کا پتہ معلوم کر لیا جس نے قسم نہ کھائی ہو۔ عبدالملک بن مروان نے قسم نہ کھائی تھی اور وہ ہر وقت کبارِ علماء مدینہ کی خدمت میں رہ

Marfat.com

کر علم دین سیکھ رہا تھا اور مدینہ والے اسے بے ضرر سمجھتے تھے۔ مسلم نے اسی سنپولئے کو بلایا اور مدینہ کے حالات معلوم کر لئے۔ اس نے بتایا کہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے حرہ کا علاقہ موزوں ہے کیونکہ دوسرے اطراف میں اہل مدینہ نے اپنی حفاظت کے لئے خندق کھود رکھی تھی۔

مدینہ کے اندر کے معاملات عثمان بن ابی سفیان کو نکالنے کے بعد حضرت عبداللہ بن حنظلہ کی سربراہی میں چل رہے تھے۔ یزید نے مسلم بن عقبہ کو حکم دیا کہ اہل مدینہ کو تین دن تک اطاعت قبول کرنے کی دعوت دیتے رہو، پھر وہ نہ مانیں تو ان سے جنگ کرنا اور جب فتح پالو تو تین دن کے لئے مدینہ کو فوج کے لئے مباح کر دینا۔ اسی ہدایت پر فوج گئی، جنگ ہوئی، مدینہ فتح ہوا اور اس کے بعد یزید کے حکم کے مطابق فوج کو اجازت دے دی گئی کہ شہر میں جو کچھ چاہے کرلے۔ تین دنوں میں شہر میں ہر طرف لوٹ مار کی گئی، شہر کے باشندوں کا قتل عام کیا گیا۔ امام زہری کی روایت کے مطابق سات سو معززین اور 10 ہزار عوام مارے گئے۔ اور ظلم بالائے ظلم یہ کہ وحشی فوجیوں نے گھروں میں گھس کر بے دریغ عورتوں کی عصمت دری کی۔ کہا جاتا ہے کہ ان دنوں ایک ہزار عورتیں، مدینہ منورہ کی پاک دامن عورتیں، زنا بالجبر سے حاملہ ہوئیں۔

بالفرض یزید کے نقطہ نظر سے اہل مدینہ کی بغاوت ناجائز تھی مگر کیا کسی باغی مسلمان آبادی بلکہ غیر مسلم باغیوں اور حربی کافروں کے ساتھ بھی اسلامی قانون کی رو سے یہ سلوک جائز تھا اور یہاں تو معاملہ کسی اور شہر کا نہیں، خاص مدینۃ الرسول ﷺ کا تھا جس کے متعلق نبی ﷺ کے یہ ارشادات متعدد صحابہ سے منقول ہیں:

1- مدینہ کے ساتھ جو بھی شخص برائی کا ارادہ کرے گا اللہ اسے جہنم کی آگ میں سیسے کی طرح پگھلا دے گا۔

2- جو شخص اہل مدینہ کو ظلم سے خوفزدہ کرے گا، اللہ اسے خوفزدہ کرے گا، اس پر اللہ اور ملائکہ اور تمام انسانوں کی لعنت ہے، قیامت کے بعد اللہ اس سے کوئی چیز اس گناہ کے فدیے میں قبول نہیں فرمائے گا۔

حرم کعبہ پر سنگباری اور آتش باری اور یزید کی موت

مدینہ سے فارغ ہو کر مسلم بن عقبہ اپنی فوج لے کر مکہ کی جانب روانہ ہوا۔ مسلم پہلے سے بیمار تھا، راستے میں بیماری نے زور پکڑا اور یہ خونخوار بھیڑیا مقام ابوا کے قریب موت کے منہ میں چلا گیا۔ موت سے پہلے وہ فوج کی کمان حصین بن نمیر کو دے چکا تھا۔ مسلم بن عقبہ کے قتل عام کی وجہ سے کئی لوگ فرار ہو کر مکہ پہنچ چکے تھے۔ غرض حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد تمام حجاز نے عبداللہ بن زبیرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یہ واقعہ ذوالحج 63 ہجری کا ہے۔

مکہ پہنچ کر حصین بن نمیر نے عبداللہ بن زبیرؓ کو پیغام بھیجا کہ یزید کی بیعت کا اعلان کرو ورنہ جنگ ہوگی اور مکہ پر حملہ ہوگا اور محاصرہ بھی ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر نے جنگ کی تیاری کی ہوئی تھی۔ بالآخر 27 محرم 63 ہجری کو فریقین میں جنگ شروع ہوگئی۔ حصین بن نمیر نے مکہ کو محاصرے میں تو پہلے ہی لے رکھا تھا، اب اس نے کوہ ابوقبیس پر منجنیق نصب کر کے خانہ کعبہ پر سنگباری شروع کر دی جس سے خانہ کعبہ کی دیواروں اور چھت کو نقصان پہنچا۔ تین دن بعد شامیوں نے روئی، گندھک اور رال کے آتشیں گولے خانہ کعبہ پر پھینکے جس سے خانہ کعبہ کا غلاف تک جل گیا اور بچی کھچی دیواریں سیاہ ہو گئیں۔ کئی منجنیقیں

Marfat.com

دن رات گولہ باری اور آتش باری میں مصروف تھیں۔ خانہ کعبہ کی دیواریں بھی گر گئیں اور لوگوں کا گھروں سے نکلنا بھی ناممکن بنا دیا گیا۔ شامیوں نے مکہ کا محاصرہ، سنگ باری اور آتشیں گولہ باری جاری رکھی تا آنکہ 10 ربیع الاول کو یزید نے مقام حوران میں تین سال اور آٹھ ماہ کی حکومت اور 38 یا 26 سال کی عمر میں انتقال کیا۔ یزید کے مرنے کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ نے بلند آواز سے شامیوں کو کہا کہ بدبختو اب کیوں لڑ رہے ہو، تمہارا گمراہ سردار مر گیا ہے۔ حصین بن نمیر نے اس خبر کی تصدیق کے بعد محاصرہ اُٹھالیا۔ ابن نمیر کا یہ عمل یزید کی فردِ جرم میں ایک اور ظلم کا اضافہ کر گیا۔

یزیدی دور کے اثرات اور نتائج

1- یزید اپنے اعمال اور کردار کے لحاظ سے بہت گرا ہوا تھا، وہ ہمیشہ لہو ولعب اور سیر وشکار میں مصروف رہتا تھا، خواجہ سراؤں کو اس نے اپنی خدمت گزاری کے لئے مامور کیا، رقص وسرود کی محفلوں میں اکثر شریک ہوتا، یہ اور اس طرح کے دیگر عیوب میں گرفتار شخص کو کسی طرح بھی مسلمانوں کا سردار اور خلیفہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔

2- مغیرہ بن شعبہؓ کی اکساہٹ پر حضرت امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی ہی میں یزید جیسے فاسق وفاجر کو ولی عہد بنایا اور پھر اس کے لئے ہر حیلے سے بیعت لینے کی کوشش کی۔ یہ عمل سراسر خلافتِ راشدہ کی سنت کے خلاف اور مسلمانوں کے سوادِ اعظم کے ضمیر سے متعارض تھا، اسی وجہ سے پورا حجاز ایک دم یزید کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور سب سے پہلے حضرت حسینؓ میدان میں اترے اور جامِ شہادت نوش کیا۔ اس کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ نے بھی یہی راستہ اختیار کیا۔ الغرض حضرت حسینؓ اور ان کے رفقا پوری انسانیت کو سبق دے گئے کہ باطل کو قبول کر کے زندہ رہنا مردانِ حر کے لئے عار ہے۔ حضرت حسینؓ کی شہادت آج بھی پکار پکار کر آواز دے رہی ہے کہ یزیدی نظام انسانیت کے لئے نہ کل باعث خیر تھا اور نہ آج باعثِ خیر ہے اور نہ آئندہ باعثِ خیر ہوگا۔

3- حضرت امیر معاویہؓ کا خلافت کو ملوکیت اور ولی عہدی میں تبدیل کر دینا راہ حق سے اتنا بڑا انحراف تھا جسے تاریخ نے آج تک ہضم نہیں کیا۔ اس کے باوجود جو بری رسم اس وقت شروع ہوئی تھی مسلمان آج بھی اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ یزید چار سال سے بھی کم وقت میں اہلِ اسلام کو اتنے گہرے زخم لگا گیا کہ ان کی ٹیس قیامت تک کم نہ ہوگی اور یہی ٹیس یزید کے لئے قیامت تک لعنت ونفرین وصول کرنے کے لئے کافی ہے۔

4- حکمرانی جب خلافت کا لباسِ فاخرہ اتار کر بادشاہت وملوکیت کا چولا پہن لیتی ہے تو اپنے آپ کو بچانے اور قائم رکھنے کے لئے تمام حدود وقیود پھلانگ جاتی ہے۔ اس کے لئے خونِ حسینؓ، حرم مدینہ اور حرم کعبہ بے معنی الفاظ بن کر رہ جاتے ہیں۔ العیاذ باللہ۔

عبد الملک بن مروان

(23 تا 85 ہجری)

مسلمانوں پر حکومت کرنا دراصل مسلمانوں کی خدمت اور راحت رسانی کا دوسرا نام ہے۔ حکمران کی سب سے پہلی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ عامتہ المسلمین کے اتفاقِ رائے سے برسرِ اقتدار آیا ہو، دوسری صفت یہ ہے کہ عوام کو معصیت کی زندگی سے باز رکھے اور آخرت کی زندگی کے لئے تیار کرے، تیسری صفت یہ کہ وہ مسلمانوں کے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرے اور اس کے ساتھ ان کے جان و مال کا امین ہو۔ مسلمانوں کے مال کو ایسا سمجھے کہ یتیم کا مال اس کی تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ اگر وہ صاحب حیثیت ہے تو بلا معاوضہ یتیم کے مال کی حفاظت کرے، اگر ایسا نہیں ہے تو بقدر راشد ضرورت اس کے مال میں تصرف کرے۔ چوتھی صفت یہ ہو کہ مسلمانوں کے درمیان ہر نزاع کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایت کے مطابق کرے۔ پانچویں صفت یہ کہ ہر حال میں مسلمانوں کے ساتھ رحمت و شفقت کا برتاؤ کرے، کسی بھی طریقے سے مسلمانوں کے خونِ ناحق سے ہاتھ نہ رنگے۔ غرضیکہ مسلمانوں کے لئے وہ بمنزلہ شفیق باپ اور طبیب کے ہو، وہ مسلمانوں پر رحمت بھیجے اور مسلمان اس کے لئے دعا گو ہوں۔ المختصر مسلمانوں پر حکمرانی کرنا سب سے مشکل کام ہے۔ حکمران کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا صحیح معنوں میں خلیفہ اور نائب ہونا چاہیے۔

اس کے برعکس ایسے حکمران جو امت مسلمہ کو لہولہان کر کے اس کی گردنوں پر سوار ہو گئے، ان سے مال و دولت حاصل کر کے بیت المال کی رونق بڑھائی اور اسے ہر انداز سے ذاتی خزانہ سمجھا۔ انصاف اور عدل و احسان سے دلوں کو رام کرنے کی بجائے تلوار سے مسلمانوں کے سر اڑا دیے یا جھکا دیے، یہ طرز عمل ان کے دورِ حکومت میں برابر جاری رہا اور یہ لوگ کبھی بھی نیابت رسول ﷺ کے اعلیٰ و ارفع معیار کی طرف رجوع نہ کر سکے۔ ایسے حکمرانوں نے خواہ کتنے ہی ملک فتح کئے ہوں وہ کبھی بھی ہمارے ہیرو نہیں کہلا سکتے، ان کا شمار یقیناً امت کے ایسے ظالموں میں ہو گا جن کے لئے اکابرین امت ہمیشہ بددعا کرتے رہیں گے۔

اس وقت ہمارے پیش نظر عبد الملک بن مروان کی شخصیت ہے جسے مورخین دولت بنی امیہ کا مجدد بھی کہتے ہیں، ہم کوشش کریں گے کہ عبد الملک بن مروان کی زندگی کے تمام گوشے قارئین کے نظر میں لائیں تا کہ اس کی شخصیت کے

Marfat.com

متعلق صحیح فیصلہ کر سکیں۔

عبدالملک بن مروان بن حکم بن ابو العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی بن کلاب، رمضان 23 ہجری میں پیدا ہوا۔ اس کی کنیت ابو ولید تھی، وہ ابو الملوک کے نام سے بھی مشہور ہے، کیونکہ اس کے کئی بیٹے یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ اس کے ہم عصروں کا کہنا ہے کہ مدینہ میں کوئی جوان عبدالملک کی مانند چست و چالاک، قرآن وحدیث کا واقف اور عابد و زاہد نہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول تھا کہ ہمارے بعد مسائل کے لئے مروان کے فقیہہ بیٹے عبدالملک سے رجوع کرنا۔ امام شعبی کہتے ہیں کہ میں جس شخص کی صحبت میں بیٹھا وہ میرے علم کا قائل ہو گیا مگر عبدالملک کے علم و فضل کا میں قائل ہوں۔ میں نے جب اس سے کوئی حدیث بیان کی تو اس نے اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ کر دیا اور جب کوئی شعر پڑھا تو اس نے اس مضمون کے بہت سے اشعار پڑھ دیئے۔

عبدالملک بن مروان کی خلافت سے پہلے کے ہم عصر یحییٰ غسانی کہتے ہیں کہ ولید بن عقبہ یزید کی فوج کا ایک سپہ سالار مدینہ پہنچا تو میں مسجد نبوی گیا اور عبدالملک کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تو بھی ولید کی فوج میں ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ عبدالملک نے کہا تو نے ایسے شخص کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہیں جو ظہورِ اسلام کے بعد پیدا ہوا۔ آنحضرت ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی اور صحابی حضرت زبیرؓ اور ابو بکرؓ کی بیٹی حضرت اسماءؓ کی اولاد ہے۔ جس کو آنحضرت ﷺ نے تحنیک کی اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں جب بھی اسے دن میں ملا ہوں اسے روزہ دار پایا اور جب رات کو ملا ہوں تو نماز ہی پڑھتے دیکھا۔ یاد رکھو! جو اس کے مخالف ہو کر لڑے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اوندھے منہ دوزخ میں گرائے گا۔

واقعہ حرہ

واقعہ حرہ کی پوری تفصیل ہم یزیدی عہد کے واقعات میں بیان کر چکے ہیں۔ عبدالملک کے حالات کو قید تحریر میں لاتے ہوئے ہم اس تضاد کو سامنے لانا چاہتے ہیں جو عبادت گزار اور تابعین کی مجالس میں بیٹھ کر تفقہ فی الدین کا رتبہ حاصل کرنے والا عبدالملک کس طرح مدینہ شہر اور عزت مآب دخترانِ مدینہ کی تباہی کا سبب بنا۔ جب مسلم بن عقبہ نے آدمی بھیج کر نوجوان عبدالملک کو مدینہ پر حملہ آور ہونے کی خاطر رہنمائی کے لئے بلایا تو وہ بخوشی تیار ہو گیا۔ مسلم بن عقبہ سے داد وصول کی اور حرہ کے باغات کے رستے مسلم بن عقبہ کے لشکر کو مدینہ میں گھس کر حرم نبوی ﷺ کی تباہی دس ہزار سے زیادہ مدینۃ النبی ﷺ کے پاکباز فرزندوں کا قتل اور ایک ہزار سے زیادہ حرم مدینہ کی پاکباز مستورات کی آبروریزی کا سبب بنا۔ اس وقت عبدالملک پورے سن شعور کو پہنچ چکا تھا۔ حرہ کے واقعہ کے بعد عبدالملک نے پوری زندگی مدینہ منورہ کی تباہی کے حصے دار بننے پر کبھی افسوس کا اظہار کیا، نہ پشیمان ہوا اور نہ توبہ و استغفار کا دامن تھا۔ عبدالملک کا یہ جرم شاید دونوں جہانوں میں ناقابل معافی ہے۔

عبدالملک بن مروان کی حکومت قائم ہو گئی۔ اہل مدینہ کو حسن ظن تھا کہ وہ اپنی مذہبی زندگی میں خاص امتیاز رکھتا تھا۔ اس کا سلوک ممتاز صحابیوں کے ساتھ کیسا تھا۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہم بوڑھے اور نابینا صحابی حضرت جابر بن عبداللہؓ کا

Marfat.com

واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ حضرت جابرؓ مدینہ سے چل کر دمشق صرف اس لئے آئے کہ واقعہ حرہ کے بعد انتقاماً مدینہ منورہ والوں پر جو ظلم توڑے جا رہے تھے ان کو بند کرنے کی درخواست کریں۔ اس وقت نبی اکرم ﷺ کے پڑوسیوں پر زندگی کے تمام ذرائع بند کر دیئے گئے تھے، ہر شخص گویا اپنے گھر میں قیدیوں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ رسول ﷺ کے صحابی عبدالملک کے پاس سفارش لے کر آتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں:

''امیر المومنین! مدینہ منورہ جس حال میں ہے آپ دیکھ رہے ہیں، وہ ''طیبہ'' ہے، یہ نام حضور ﷺ نے اس کا رکھا تھا۔ اس کے باشندے آج کل قیدیوں کی طرح محصور ہیں۔ امیر المومنین کو اگر صلہ رحمی کا خیال ہو اور ان کے حق کو وہ پہچانیں تو ایسا کرنا چاہیے۔''

عبدالملک نے اس درخواست کو قصداً سمجھنے کی کوشش نہ کی، اس کے سینے میں غصہ کی آگ بھڑکنے لگی، چہرہ سرخ ہو گیا۔ حضرت چونکہ نابینا تھے اس لئے ان کو اس کی ناراضگی کا پتہ نہ چلا۔ آپ بار بار اسی بات کو دہرا رہے تھے، قریب تھا کہ ان کے ساتھ بھی کوئی سخت واقعہ پیش آ جائے لیکن اتفاق سے دربار میں ان کے ایک شاگرد قبیصہ موجود تھے، انہوں نے حضرت کو خاموش کیا، ہاتھ پکڑ کر باہر نکالا اور حضرت کو سمجھانے لگے: ''حضرت یہ لوگ (بنی امیہ) اب بادشاہ بن گئے ہیں۔''

قبیصہ پر عبدالملک بہت بھروسہ کرتا تھا اور یہ بات مشہور ہو چکی تھی۔ اس لئے حضرت جابرؓ نے یہ سن کر قبیصہ سے فرمایا، مگر تم کو کوئی عذر کا موقع حاصل نہیں ہے کیونکہ تمہارا صاحب تمہاری بات تو سنتا ہے۔ اس پر قبیصہ نے جو بات کہی اس سے ان خلفا کے طرزِ عمل کی کیسی اچھی تشریح ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا: ''حضرت وہ سنتا بھی ہے اور نہیں بھی سنتا، جو بات منشا اور مرضی کے مطابق ہوتی ہے، بس اسی کو سنتا ہے۔''

ولی عہد عمرو بن سعید کا قتل

جابیہ کے مقام پر مروان بن حکم کی خلافت کے لئے بنی امیہ کے سرکردہ افراد کا اجلاس ہوا تھا۔ جس میں مروان کو اس شرط کے ساتھ خلیفہ بنایا گیا تھا کہ اس کے بعد خالد بن یزید اور اس کے بعد عمرو بن سعید تخت نشین ہوں گے۔ مروان نے بجائے ان دونوں کے اپنے دو بیٹوں عبدالملک اور عبدالعزیز کو ولی عہد بنا دیا اور سابقہ ولی عہدوں کو معزول کر دیا۔

عمر بن سعید ہر لحاظ سے حکومت کرنے کا اہل تھا۔ مروان کے بعد جب عبدالملک بادشاہ بنا تو اس نے عمرو کے ساتھ بظاہر بہت اچھا سلوک روا رکھا۔ اسے اپنے ساتھ ساتھ رکھتا تھا۔ عمرو اور عبدالملک قرقیسیا کی مہم پر جا رہے تھے تو رستے میں عمرو بن سعید نے عبدالملک سے کہا کہ اس کی ولی عہدی کا رسمی اعلان کر دیا جائے تاکہ وہ اور عوام مطمئن ہو جائیں۔ عبدالملک نے جو آج تک منافقت سے کام لیتا آ رہا تھا، عمرو کی ولی عہدی سے صاف انکار کر دیا۔

عمرو عبدالملک سے علیحدہ ہو کر دمشق پہنچا۔ وہاں کے حاکم کو نکال دیا اور فوج لے کر عبدالملک کے مقابلے میں کھڑا ہو گیا۔ عبدالملک قرقیسیا کی مہم کو نامکمل چھوڑ کر دمشق پہنچا اور دونوں میں جنگ شروع ہو گئی، یہ جنگ کئی ماہ جاری رہی۔ جس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، بالآخر عمائدین نے صلح کروا دی اور عبدالملک نے بادل نخواستہ عمرو کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا۔ عمرو نے

عبدالملک کے پاس بے دھڑک آنا جانا شروع کر دیا۔ایک دن ایسا ہوا کہ عبدالملک نے پہلے سے چھپائے ہوئے آدمیوں سے حملہ کروا دیا اور عمرو نے شور مچایا کہ یہ دھوکا ہے۔عبدالملک نے کہا کہ ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے۔لہٰذا تمہارا قتل ضروری ہے۔یہ واقعہ 65 ہجری کا ہے۔

عمرو بن سعید کے قتل کے بعد اس کا بھائی یحییٰ ایک ہزار آدمی لے کر عبدالملک کے محاصرہ کے لئے پہنچ گیا۔ عبدالملک نے اشرفیوں کا ڈھیر عمرو کے سر کے ساتھ دیوار کے اوپر سے باہر گرا دیا۔لوگ اشرفیوں کو اکٹھا کرنے میں لگ گئے اور یحییٰ ایک طرف کھڑا رہ گیا۔بالآخر یحییٰ کو گرفتار کرلیا گیا۔اس کے ساتھ عمرو کے لڑکوں کو بھی جیل بھیج دیا گیا۔عمرو کے لڑکوں کو مصعب بن زبیر کے قتل کے بعد رہائی ملی۔

عبدالملک نے اپنے اصلی ولی عہد کو قتل کر کے جہاں اپنی خون آشامی کا ثبوت دیا وہاں بہت بڑی بدعہدی کی مثال بھی قائم کر دی۔

ہم یزید کے معاملات کو قیدِ تحریر میں لاتے ہوئے رقم کر چکے ہیں کہ عبدالملک بن مروان شروع میں عبداللہ بن زبیرؓ کے متعلق کیسے پاکیزہ خیالات کا مالک تھا۔عبدالملک کی بدقسمتی اور خیرہ چشمی تھی کہ اس نے حکومت سنبھالتے ہی شام جا کر ان افراد کو تلاش کیا جو مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ پر حملہ آور ہو کر عبداللہ بن زبیرؓ کی فوجوں سے ٹکرا سکیں۔یوں لگتا ہے عبدالملک نے اقتدار کی خاطر مدینہ طیبہ میں سیکھا ہوا سارا علمِ دین بالکل ہی پس پشت ڈال دیا۔

عبدالملک نے حجاج بن یوسف،جو پہلے واقعہ حرہ میں حصہ لے چکا تھا اور ایک اور بدقسمت طارق نامی جرنیل کو دونوں مقدس مقامات (حرم نبوی اور حرم کعبہ) کو پامال کرنے کے لئے منتخب کیا۔طارق نے مدینہ منورہ پر چڑھائی کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ کے گورنر کو تبدیل کر کے ایک شامی کو مدینہ کا گورنر بنایا اور خود حجاج کی امداد کے لئے مکہ پہنچ گیا اور اپنی فوج بھی ساتھ لے گیا۔حجاج نے مکہ کا محاصرہ کرلیا۔اس نے دورانِ محاصرہ کس طرح اہل مکہ کو اذیت سے دوچار رکھا اور کس طرح خانہ کعبہ کی چھت اڑا دی،اس کا تفصیلی ذکر ہم حجاج کے سیاہ کارناموں کے ذیل میں کریں گے۔لیکن یہاں اس حقیقت کو بیان کئے بغیر رہا نہیں جا سکتا کہ عبدالملک بن مروان اول سے آخر تک حکومت کا خواہش مند تھا۔حکومت واقتدار بھی ایسا کہ جس نے فساد فی الارض کی بھرپور مثال قائم کر دی۔

ابن اشعث کے خروج اور شہادت کے بعد حجاج نے جن لوگوں کا قتل عام کیا،ان میں صحابہ کرام کی سیرت کے حامل بزرگ سعید بن جبیرؒ جیسے مشہور تابعی بھی شامل تھے۔حضرت انس بن مالکؓ،حضرت عمر بن عبداللہؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کرام کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک حجاج نے روا رکھا وہ تاریخ کا سیاہ باب ہے۔ان واقعات کا تفصیلی ذکر ہم حجاج کے باب میں کریں گے۔یہاں یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ سب عبدالملک کی مرضی،منشا اور ناک کے نیچے ہوتا رہا۔اس نے نہ تو حجاج کو سزا دی اور نہ ہی عہدے سے ہٹایا۔حجاج کے تمام انسانیت سوز مظالم اور جرائم کا اصل محرک عبدالملک بن مروان ہی تھا۔عبدالملک کی ایک تقریر حجاج کے نام لکھے گئے خط کا جواب اور اپنے بیٹوں کے نام وصیت کے ذکر کے بعد عبدالملک کی داستان خون آشام کو ختم کرتے ہیں۔

Marfat.com

تقریر

تم مجھ سے مہاجرین جیسے طرزِ عمل کی توقع رکھتے ہو اور خود اس پر عمل نہیں کرتے۔ یاد رکھو! میں تمہیں سخت عذاب سے ہلاک کروں گا اور تلوار ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔

مستند کتب تاریخ کے حوالوں سے جو واقعات تحریر کئے گئے ہیں ان سب کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عبدالملک کی تربیت مروان نے اس نہج پر رکھی تھی کہ وہ خود پسند، چیرہ دست، خون آشام اور اقتدار کی خاطر دین و دنیا کے ہر ضابطے کو پامال کرنے والا حکمران بن کر سامنے آیا۔

عبدالملک 15 شوال 85 ہجری کو انتقال کر گیا اور دمشق میں دفن ہوا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر باسٹھ سال تھے۔ اس کی بیعت کے وقت سے لے کر وفات تک مدتِ خلافت اکیس سال بنتی ہے جس میں ابن زبیرؓ کی شہادت کے بعد والے تیرہ سال بھی شامل ہیں۔

Marfat.com

خلافتِ بنو امیہ پر ایک نظر

حضرت علیؓ کی شہادت اور خلافت سے حضرت حسنؓ کی دست برداری کے بعد حضرت امیر معاویہؓ بلا شرکت غیرے پوری دنیائے اسلام کے حکمران اور خلیفہ بن گئے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ عالم اسلام کی بدنصیبی اور خلافت بنو امیہ کی بربادی کا سامان بھی حضرت امیر معاویہؓ کے ہاتھوں میں پیدا ہوا۔ انہوں نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنایا اور یہ ولی عہدی کی وبا ایسی پھیلی کہ آج تک ملتِ اسلامیہ اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکی۔ خلافتِ راشدہ کا نظام نوع انسانی کے لئے ہر لحاظ سے نافع اور جمہوریت جو اسلام نے قائم کی تھی، اس کا بہترین نمونہ تھا۔ حضرت معاویہؓ کے طرزِ عمل سے یہ نظام ضائع ہوگیا اور خاندانی حکومتوں کا انسانیت سوز نظام دوبارہ مسلط ہوگیا۔ بلکہ صحابہ کے الفاظ میں ایک ہرقل کے بعد دوسرا ہرقل آنے لگا۔

حضرت امیر معاویہؓ، عبدالملک مروان، ولید بن عبدالملک، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور ہشام بن عبدالملک تھے جن کے ہاتھوں قوم کا مجموعی مزاج اسلام سے دور نہ ہوا۔ ان کے بعد جتنے خلفا آئے وہ سب شراب نوشی، موسیقی کے رسیا اور مسلمانوں کے بیت المال کو ذاتی جاگیر سمجھنے والے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سوا اوپر ذکر کئے گئے خلفا میں بھی خلافتِ راشدہ والی احتیاط اور جزرسی نہ تھی بلکہ اپنی ذات کو بڑی حد تک عیش اور تنعم کا عادی بنائے رکھا، ان کے بعد آنے والوں نے ساری حدیں ہی توڑ دیں۔

اسلام نے جس قبائلی عصبیت اور حمیت جاہلیہ کو ختم کر کے تمام شعوب وقبائل کو ایک لڑی میں پرو کر امت واحدہ بنا دیا تھا، امویوں نے ان تمام عصبیتوں کو دوبارہ زندہ کر کے مسلمانوں میں افتراق و انتشار کو اتنی ہوا دی کہ بالآخر عباسیوں نے اسی منفی جذبے سے کام لے کر اموی خلافت کو برباد کیا اور اسلامی تمدن میں سفاکی اور خون ریزی کے نئے رستے کھول دیئے۔

بنو امیہ نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے ظلم، تشدد اور قتل سے کام لیا۔ جتنا کوئی شخص عوام کو ذلیل، قتل اور خوار کرنے میں نمایاں ہوتا تھا اتنا ہی وہ حکومت کا بڑا عہدے دار بن جاتا۔ بڑا عہدہ اور بڑا ظلم لازم وملزوم تھے۔ بنو امیہ کے اسی طرزِ عمل نے اپنے لئے عوام کے دلوں میں نفرت وحقارت کے الاؤ جلا دیئے۔ بالآخر اسی تنفر کی آگ نے دولت بنو امیہ کو بھسم کر کے رکھ دیا۔

بنو امیہ قبائل قریش اور ملک عرب میں ایک نامور اور سردار قبیلہ کے طور پر مشہور رہے۔ جہانداری کے اصولوں سے بھی عام قبائل میں ممتاز تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان میں کوئی نالائق پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ گویہ تجویز کہ بنو امیہ سے ہی عوام کسی کو

Marfat.com

خلیفہ منتخب کرنے کی طرح ڈالتے۔ اگر چہ یہ تجویز بھی ناقص اور روح اسلامی کے خلاف تھی لیکن بنوامیہ کی ولی عہدی کی سکیم سے اتنا نقصان نہ پہنچتا جتنا انہوں نے پہنچایا۔ ایک خلیفہ بنتا۔ اپنے بھائی یا کسی عزیز کو بالترتیب ولی عہد بناتا اور بعد میں اس عہد سے منحرف ہو جاتا۔ بھائی کی جگہ بیٹا، پھر اس کا بیٹا ولی عہدی کی قطار میں آجاتا اور حکمران اپنے طے کردہ ولی عہد کو یا قتل کرا دیتا یا کسی اور طریقہ سے ذلیل وخوار کرتا۔ یہ رسم دولتِ امویہ کو برباد کرنے میں کلیدی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

آئندہ صفحات میں وہ خلیفے جو دولتِ امویہ کی بربادی کا سبب بنے اور ان کے کارندے، عمال اور متوسلین جو اس کارِ بد میں شریک تھے۔ بالخصوص وہ کردار جنہوں نے زوال کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ ہماری تحریر کا موضوع بنیں گے۔

Marfat.com

حجاج بن یوسف ثقفی

(41ھ/661ء تا 95ھ/714ء)

مسلم معاشرہ جب منہاجِ نبوت پر قائم ہوتا ہے اور پھر اسی منہاج پر قائم رہتا ہے تو اس معاشرے کے افراد سوائے اللہ کے نہ کسی سے خوفزدہ ہوتے ہیں نہ کسی کو کسی بھی حالت میں فریادرس سمجھتے ہیں۔ اپنے ضمیر کے مطابق اپنی رائے کا اظہار ہر حال میں کرتے رہتے ہیں، خواہ مدمقابل کتنا ہی قاہر و جابر کیوں نہ ہو۔ انہیں انصاف کے لئے کسی سے بھیک نہیں مانگنی پڑتی، ان کا مال اور جان بغیر حق کے کسی بھی دوسرے کے لئے مباح اور حلال نہیں ہوتے۔ زندگی گزارتے ہوئے کسی بھی مرحلے پر باطل کے سامنے سرنگوں ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ فرمانروا یا فرمانروا کا کوئی فرستادہ اسلامی معاشرے کے افراد سے ان کے یہ حقوق چھین لیتا ہے یا ان حقوق پر حملہ آور ہوتا ہے، وہ اسلامی معاشرے کا دشمن اولیں شمار ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ شخص اپنی قہرمانیوں کے ذریعے معاشرے میں بزدلی، مصلحت پسندی، باطل نوازی، حق کے معاملے میں مداہنت، ضمیر فروشی اور ظلم و بربریت کا چلن عام کرنے کا سبب بنتا ہے۔ غرض اسلامی روح اور حریت پسندی معاشرے سے دور چلی جاتی ہے۔ حجاج بن یوسف انہی افراد کا سرخیل ہے جنہوں نے اسلامی معاشرے کے ان تمام خصائص کو مٹانے کی کوشش کی اور بھرپور کوشش کی۔ تاریخ انہیں ہمیشہ برے نام سے ہی یاد کرتی رہے گی۔

حجاج بن یوسف بن حکم بن ابی عقیل ثقفی ابومحمد بنوامیہ کا ایک جرنیل اور گورنر اپنے وقت کا بہت بڑا ساس قبیلہ بنوثقیف سے تھا۔ طائف کے ایک گھرانے میں پیدا ہوا۔ جس کا ذریعہ معاش سنگ برداری اور معماری تھا۔ اس کی والدہ فارعہ قبیلہ ثقیف سے تھی اور مغیرہ بن شعبہؓ کی مطلقہ تھی، جنہیں امیر معاویہ نے کوفہ کا گورنر بنایا تھا۔ حجاج جوانی کے زمانے میں طائف میں ایک مدرس بھی رہا۔

خواجہ حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ حجاج پستہ قد، اس کی ایک آنکھ بڑی تھی اور ایک چھوٹی، میرے سامنے اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیاں نکالیں، انگلیاں ایسی تھیں جنہیں حجاج نے کبھی اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے باگ پکڑ کر پسینہ سے تر نہ کیا ہو۔

حجاج عبدالملک کا مصاحب کیسے بنا؟ یہ سارا واقعہ تاریخی عجائبات میں سے ایک ہے۔ عبدالملک کو اپنی فوج کے متعلق نظم و ضبط کی سخت شکایت تھی۔ روح بن زنباع، عبدالملک کا ایک وزیر تھا۔ عبدالملک نے روح سے اس شکایت کا اظہار کیا۔

Marfat.com

روح نے کہا کہ میرے فوجی سٹاف میں ایک سپاہی حال ہی میں بھرتی ہوا ہے، اگر نظم وضبط کا کام اس کے سپرد کر دیں تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس شکایت کا پوری طرح ازالہ کر دے گا۔ حجاج اپنے سابقہ پیشے سے دستبردار ہو کر فوجی سپاہیوں میں شریک ہو چکا تھا اور کسی حد تک فوج کے نظم وضبط سے روشناس بھی ہو چکا تھا۔ عبد الملک نے حجاج کو بلایا اور نظم وضبط کا کام اس کے سپرد کر دیا اور حکم دیا کہ امیر المومنین کی سواری جونہی روانہ ہو، اسی وقت فوج کو کوچ کرنا چاہئے۔ حجاج تعمیل حکم کا وعدہ کر کے روانہ ہوا۔ عبد الملک کی سواری اسی دن روانہ ہوئی۔ حجاج فوج میں اعلان کرتا پھر رہا تھا کہ امیر المومنین کے ساتھ ہی ادنیٰ و اعلیٰ سب کو سوار ہو جانا چاہئے۔ گھومتے ہوئے حجاج وزیروں کے سٹاف میں پہنچا، دیکھا کہ ابھی ان میں کوئی سویا پڑا ہے اور کوئی کھانا پکا رہا ہے۔ حجاج نے کڑک کر آواز دی کہ اب تک تم لوگ سوار کیوں نہیں ہوئے، ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ یہ آدمی نہیں درندہ ہے۔ بے تکلفی میں لوگوں نے کہا کہ اے کیا بک بک لگا رکھی ہے، بیٹھو ہم لوگوں کے ساتھ تو بھی کچھ کھا لے۔ ان لوگوں کی بات ابھی پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ حجاج نے ہر ایک کے سر اور پیٹھ پر بے تحاشہ کوڑے برسانا شروع کر دیئے۔ حجاج نے اسی پر قناعت نہ کی بلکہ وزیر اور اس کے رفقا کے خیموں کو آگ لگا دی۔ دربار سے جب روح واپس آیا تو اس حال کو دیکھ کر رونے لگا۔ سیدھے عبد الملک کو آ کر شکایت کی کہ اس سپاہی نے تو ہمارے ہی آدمیوں پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ عبد الملک نے حجاج کو بلا کر پوچھا تو اس نے جواب میں اس حرکت سے صاف انکار کر دیا۔ پوچھا گیا کیا تم نے کوڑے نہیں مارے، تم نے آگ نہیں لگائی۔ بولا قطعاً نہیں۔ پھر وزیر کے آدمیوں کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا۔ حجاج نے کہا حضور نے۔ عبد الملک نے حیرت سے پوچھا میں نے؟ جی ہاں، آپ نے۔ اس کے بعد کہنے لگا امیر المومنین! مجھ غریب کی کیا مجال تھی کہ یہ کر سکتا تھا لیکن جو کچھ بھی ہوا آپ کے حکم سے ہوا۔ میرا ہاتھ، میرا ہاتھ، میرا کوڑا، میرا کوڑا باقی نہیں رہا، اب وہ آپ کا ہاتھ ہے اور آپ کا کوڑا ہے۔ عبد الملک حجاج کی باتیں سن کر اچھل پڑا، کہنے لگا کہ اس قسم کے آدمی کی مجھے ضرورت تھی۔ اس کے بعد بتدریج حجاج آگے بڑھتا گیا حتیٰ کہ کوفہ کی گورنری تک پہنچ گیا۔ عبد الملک نے اسے اتنا شوخ دیدہ بنا دیا تھا کہ رسولِ اکرم ﷺ کے مشہور صحابی اور خادم خاص حضرت انسؓ کی بھرے دربار میں توہین کی، ان کی گردن مبارک پر مجرموں والی مہر لگائی۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی قرأت کا مذاق جن الفاظ میں اڑایا کرتا تھا ان کا نقل کرنا بھی دشوار ہے۔ عبد الملک نے حجاج سے ایک دفعہ پوچھا تو اس نے اپنے متعلق کہا کہ سچی بات یہی ہے کہ میں سخت کینہ پرور، حاسد اور کاٹ کھانے والا آدمی ہوں۔ عبد الملک نے سن کر کہا کہ تب تیرا رشتہ شیطان سے ملتا ہے۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ حجاج ولید کے زمانے میں جب مر رہا تھا تو کہتا جاتا تھا، ولید کی اطاعت پر زندہ رہا اس کی اطاعت پر مر رہا ہوں اور اس کی اطاعت پر قیامت میں اٹھوں گا۔ عباسی خلیفہ منصور کے دربار میں حجاج کے قول کا جب تذکرہ ہوا تو اس نے کہا کہ اس کو دراصل شیعہ (پارٹی) کا آدمی کہتے ہیں، اس کو افسوس تھا کہ جو شیعہ (پارٹی) اس نے قائم کی تھی اس میں ایسے افراد نہ تھے۔

ہر انسان اللہ کی مخلوق ہے اور کوئی انسان بھی سراپا شر نہیں ہوتا، اس کے اندر خیر کے پہلو بھی ہوتے ہیں۔ حجاج بن یوسف ایک انسان تھا، ہم کوشش کریں گے کہ اس کی شخصیت کے تمام پہلو سامنے لائیں اور نتیجہ قارئین کرام پر چھوڑ دیں۔

Marfat.com

مکہ کا محاصرہ

3 رمضان المبارک 65 ہجری کو مروان کی بیوی ام خالد بیوہ یزید اول نے مروان کو قتل کر دیا۔ اسی دن عبدالملک بن مروان نے دمشق میں لوگوں سے بیعتِ خلافت لی۔ 71 ہجری کے آخر میں عبدالملک ابن مروان نے شامی سرداروں سے عبداللہ بن زبیرؓ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے انتخاب کرنا چاہا۔ حجاج بن یوسف کے سوا کسی نے بھی اس کی حامی نہ بھری۔ حجاج اس سے پہلے الحرہ اور الزتبہ کی جنگوں میں حصہ لے کر حرمین شریفین کی حرمت کو پامال کرنے میں حصہ دار بن چکا تھا۔ اس لئے اس نے خانہ کعبہ کی حرمت کو دوبارہ پامال کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کی۔ پانچ ہزار کی فوج کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کر دی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ حرم کعبہ میں قلعہ بند ہو گئے۔ حجاج نے مکہ کے محاصرہ کے بعد سنگباری شروع کر دی۔ کئی مہینے تک محاصرہ مسلسل قائم رہا اور بڑی شدت کی سنگ باری ہوتی رہی۔ ابن زبیرؓ بڑی شجاعت اور استقلال کے ساتھ مدافعت کرتے رہے لیکن ان کے لئے بیرونی امداد کے تمام رستے بند ہو چکے تھے۔ مکہ کے محصورین کی حالت ازحد خراب ہو چکی تھی۔ لوگوں نے اپنے گھوڑے ذبح کر کے کھانا شروع کر دیئے۔ حجاج نے چالاکی اور زر پاشی کے ذریعہ مکہ میں ابن زبیرؓ کے دس ہزار حامیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ ابن زبیرؓ کے اپنے بیٹے بھی حجاج سے جا ملے۔ بالآخر ابن زبیرؓ مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور یہ جنگ ختم ہو گئی۔ جنگ میں خانہ کعبہ کی عمارت کو سخت نقصان پہنچا۔ حجاج کے لئے یہ عمل کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ابن زبیرؓ کی شہادت کے بعد حجاج خانہ کعبہ میں داخل ہوا۔ پتھروں کی بڑی کثرت تھی جو خانہ کعبہ میں پھینکے گئے تھے۔ فرشِ مبارک پر جا بجا خون کے نشانات تھے۔ پتھروں کو اٹھوایا اور خون کے دھبوں کو دھلا دیا۔ اہل مکہ سے عبدالملک کی بیعت لی۔ اس کے بعد مدینہ واپس ہوا اور تمام اہل مدینہ کو حضرت عثمانؓ کا قاتل سمجھ کر سختیاں شروع کر دیں۔ مدینۃ الرسول ﷺ میں قیام پذیر صحابہ کرام کو بڑی تکالیف سے دوچار کیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ بندہ (حجاج) صحابہ کرام اور تابعین عظام کے معاملہ میں کسی خاص کینہ اور دشمنی کو دل میں بسائے ہوئے تھا۔ ورنہ وہ ان نفوسِ قدسیہ کو آزار پہنچاتے وقت کچھ تو سوچ لیتا۔

ابن زبیرؓ کی شہادت کے بعد حجاج پورے حجاز کا گورنر بن چکا تھا۔ کئی غلط کاموں اور مظالم کے علاوہ اس نے کچھ جرائم ایسے کئے جن کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ کے کسی فرد کی زبان سے اس کے لئے کلمۂ خیر نکلنا بڑا ہی دشوار کام ہے۔

1- حضرت انس بن مالکؓ کو آپ کی والدہ ماجدہ نے کم عمری ہی میں آنحضور ﷺ کی خدمت کے لئے دربارِ رسالت میں پیش کر دیا تھا۔ حضرت انسؓ ہمہ وقت خدمتِ اقدس میں حاضر رہتے اور حضور ﷺ کے ارشاداتِ عالیہ سے اپنے دل و دماغ کو نورِ رسالت سے منور کرتے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نعلین مبارک اتارتے تو حضرت انسؓ انہیں اپنی گود میں رکھ لیتے۔ آپ ﷺ بھی جناب انسؓ سے حد درجہ شفقت سے پیش آتے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ جب تک حضور ﷺ کی خدمت عالیہ میں رہا مجھے کبھی بھی یہ نہیں فرمایا گیا کہ انسؓ تم نے یہ کام کیوں کیا اور کیوں نہیں کیا۔ حضرت انسؓ 12 سال کی عمر میں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور تادمِ وصال مبارک والدہ کے حکم کی تعمیل میں خدمتِ اقدس ہی کو حرزِ جان بنائے رکھا۔ وصال مبارک کے وقت حضرت انسؓ کی عمر اکیس سال تھی۔ حضرت انسؓ

Marfat.com

فرماتے ہیں کہ اس پورے 9 سال کے عرصہ میں آنحضور ﷺ نے مجھے ایک دفعہ کہا کہ انسؓ میرا جی چاہتا ہے تمہیں مسواک سے ماروں۔ رحمتِ عالم ﷺ کے لاڈلے اور خادم کی حجاج نے مشکیں کسوائیں، کوڑوں سے پٹوایا۔ ان کی گردن پر مجرموں والی مہر لگوائی اور پھر تشہیر کرائی۔

2- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کبار صحابہ میں سے تھے۔ کوفہ جسے علم و آگہی کا گہوارہ کہا جاتا تھا، اس میں علم و دانش کی روشنی کا سبب حضرت عبداللہ بن مسعود ہی بنے تھے۔ آپ نے قال اللہ اور قال الرسول ﷺ کے لئے مدینہ طیبہ چھوڑا اور کوفہ کو اپنا مسکن بنالیا۔ عبداللہ بن مسعودؓ کی قرات قرآن سے حجاج کو ضد تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر میرے ہاتھ آجائیں تو انہیں قتل کر کے زمین کی پیاس بجھاؤں۔

3- حضرت عبداللہؓ عمر فاروقؓ کے صاحبزادے سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ غزوات میں شریک رہنے والے، تفقہ فی الدین میں تخصیص رکھنے والے عمر رسیدہ صحابیؓ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ حجاج نے ایک آدمی کو مقرر کیا کہ ابن عمرؓ کے پاؤں میں برچھا مارے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ برچھا پاؤں کو چیرتا ہوا زمین پر جا لگا۔ ابن عمرؓ شدید زخمی ہو گئے اور گھر چلے گئے۔ حجاج ان کے گھر عیادت کے لئے پہنچ گیا۔ ابن عمرؓ نے ملامت کی کہ تم نے طواف کے دوران لوگوں کو ہتھیار بند کیوں ہونے دیا۔ حالانکہ ساری کارستانی اس کی اپنی تھی۔ اس بندہ ظلم و طغیان نے یہ سب اس لئے کیا کہ وہ اسے ظلم و تعدی پر ٹوکتے تھے۔ عبدالملک بن مروان بھی اس کے افعال شنیعہ میں برابر کا شریک تھا۔ اس نے حجاج کو اتنے اونچے عہدوں پر پہنچایا جہاں اسے سوائے ظلم کو کچھ یاد نہ رہا۔

عبداللہ بن زبیرؓ کے ہاتھوں تعمیر کعبہ اور حجاج

عبداللہ بن زبیر کی خلافت 9 سال رہی لیکن ایک دن بھی انہیں سکون سے کام کرنے کا موقع نہ ملا۔ اس کے باوجود انہوں نے خانہ کعبہ کی تعمیر نو کر کے بڑا اہم اور قابل ذکر کارنامہ سرانجام دیا۔ بعثت نبوی سے پہلے قریش نے ایک مرتبہ خانہ کعبہ کی عمارت جو بوسیدہ ہو چکی تھی، کی از سر نو تعمیر کی تھی لیکن سرمایہ کی کمی کی وجہ سے اس کا تھوڑا سا حصہ جسے اب حطیم کہتے ہیں، چھوٹ گیا تھا۔ یہ چھوڑا ہوا حصہ اصل بنیادِ ابراہیمی کا تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ کی خواہش تھی کہ اسے بھی شامل کر کے بنیادِ ابراہیمی پر عمارت دوبارہ تعمیر کی جائے اور اس کا دروازہ جسے قریش نے عمداً اس لئے زمین سے اونچا رکھا تھا تاکہ بغیر اجازت کوئی شخص اس کے اندر داخل نہ ہو سکے، زمین کے برابر کر دیا جائے اور مشرق و مغرب کی جانب دروازے کھول دیئے جائیں لیکن ابھی لوگوں کے دلوں سے اوہام جاہلیت پوری طرح دور نہیں ہوئے تھے۔ اس ترمیم سے قریش کے بھڑک جانے کا خطرہ تھا، اس لئے آپ ﷺ اس خواہش پر عمل نہ کر سکے۔

بنی امیہ اور ابن زبیرؓ کے معرکوں میں خانہ کعبہ کی عمارت کو شدید نقصان پہنچ چکا تھا اس لئے ابن زبیرؓ نے سرکار دو عالم ﷺ کی پسند کے نقشے کے مطابق خانہ کعبہ از سر نو تعمیر کرا دیا۔ اس تعمیر میں ابن زبیرؓ نے حطیم کو بھی عمارت میں شامل کر لیا اور عمارت کے طول میں دس ہاتھ کا اضافہ بھی کر دیا۔ علاوہ ازیں مشرق و مغرب کی جانب دو دروازے زمین کے برابر کر کے کھول دیئے تاکہ اندر جانے میں زحمت نہ ہو۔

Marfat.com

ابن زبیرؓ کی طرف سے تعمیر کے وقت ایک نشانِ عبرت بھی سامنے آیا۔ ولادتِ نبوی ﷺ سے پہلے جو کعبہ حبشہ کے بادشاہ ابرہہ اشرم نے یمن میں بنایا تھا تاکہ اصل بیت اللہ کی حرمت کو بے اثر کر سکے۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے اس عمارت کو گرا کر اس کے نقشی پتھر اور دوسرے عمارتی سامان کو بیت اللہ کی تعمیر میں لگا دیا۔ حجاج کی بدقسمتی تھی کہ اس نے حجاز کا گورنر بنتے ہی اس نو تعمیر شدہ عمارت کو ڈھا دیا اور محض ابن زبیرؓ کی دشمنی میں ایک حصہ (حطیم) کم کر کے دوبارہ تعمیر کروا دیا۔

فتنۂ خوارج

74 اور 75 ہجری میں عبدالملک کے دور میں خوارج نے بہت بڑی شورش پیدا کر دی۔ بالخصوص اس شورش کی وجہ سے سقوطِ عراق کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس وقت حجاج کی عمر 35 سال تھی۔ عبدالملک نے اسے حجاز، یمن اور یمامہ کی گورنری سے ہٹا کر عراق کا گورنر مقرر کر دیا۔ مہلب بن ابی صفرہ خارجیوں کے خلاف ابن زبیرؓ کے وقت سے صف آرا تھا۔ ان کی شہادت کے بعد مہلب عبدالملک کے ساتھ مل گیا تھا۔

حجاج نے پہلے تو کوفہ میں آتے ہی بڑی آتش بار تقریر کی اور اعلان کیا کہ اہلِ کوفہ مہلب کی فوج میں جا کر شامل ہو جائیں۔ تین دن کے بعد جو گھر میں نظر آیا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ یہ حکم اتنا سخت تھا کہ ایک بوڑھے شخص نے جسے بشر بن مروان نے بیماری کی وجہ سے جنگ سے استثنیٰ دے رکھا تھا، حجاج کے سامنے اپنا استثنیٰ پیش کیا۔ حجاج نے اسے فوراً قتل کروا دیا۔ اس کے علاوہ ایک اور بوڑھے شخص نے بھی اپنی جگہ جنگ کے لئے اپنا لڑکا پیش کیا تو اس بوڑھے کا حشر بھی وہی ہوا جو پہلے بوڑھے کا ہوا تھا۔ ایک طرف مہلب بن ابی صفرا کی فوج میں بھیجنے کے لئے اتنی سختی، دوسری طرف اس نے فوجیوں کی تنخواہ میں سو درہم فی کس کمی کر دی۔ حالانکہ یہ تنخواہ فوجیوں کو مصعب بن زبیر اور بشر بن مروان کے دور سے مل رہی تھی۔ اس پر فوج میں بغاوت پھیل گئی جس کی قیادت عبداللہ بن جارود نامی سردار کر رہا تھا۔

عبداللہ بن جارود کے ہاتھ پر فوجیوں نے بیعت کی کہ حجاج کو گورنری سے معزول کرانے یا اسے قتل کرنے سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوں گے۔ چنانچہ عبداللہ بن جارود کے آدمیوں نے حجاج کے خیمے کو گھیر لیا۔ قریب تھا کہ حجاج کو اس کے آدمیوں سمیت قتل کر دیا جاتا۔ رات ہو گئی اور عبداللہ نے یہ کام اگلے دن کے لئے ملتوی کر دیا۔ اس دوران رات کے عرصہ میں ابن جارود کے آدمیوں میں پھوٹ پڑ گئی اور حجاج کی امداد کے لئے کچھ فوجی دستے دمشق سے پہنچ گئے۔ صبح ہوتے ہی ابن جارود اپنے آدمیوں کو دوبارہ اپنے ساتھ ملا کر حملہ آور ہوا۔ حجاج کی شکست قریب تھی کہ ایک تیر ابن جارود کو لگا جس سے وہ ختم ہو گیا اور یہ بغاوت بھی ختم ہو گئی۔

اس طرح عبدالملک کی حکومت اس انقلاب سے تو بچ گئی لیکن حجاج کی سختی اور درشتگی اور بڑھ گئی۔ قریباً دو سال کے عرصہ میں خوارج کا فتنہ فرو ہو گیا۔ اسی دوران حجاج نے مہلب بن ابی صفرہ کی بیٹی سے شادی کر لی۔

عبدالرحمٰن بن اشعث کا خروج اور شہرِ واسط کی تعمیر

697ء میں حجاج نے عبدالرحمٰن بن اشعث کو سجستان کی مہم پر بھیجا۔ اس کی وجہ سجستان میں بغاوت کے آثار تھے اور

Marfat.com

حجاج اس پر دوبارہ مضبوطی سے قابض ہونا چاہتا تھا، جس کے لئے ابن اشعث جیسا مضبوط عرب سرداری موزوں تھا۔ ابن اشعث نے یہ مہم بڑی احتیاط سے سر کرنا چاہی لیکن حجاج نے بے صبری کا مظاہرہ کیا، اس نے کئی خطوط میں ابن اشعث کو حکم دیا کہ وہ بلا تاخیر پیش قدمی کرے اور دھمکی دی کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں فوج کی قیادت اس کے بھائی اسحاق بن اشعث کو دے دی جائے گی۔ چنانچہ ابن اشعث نے اپنی فوج کے بڑے افسران سے مشورہ کیا جو اس علاقے کو فتح کر چکے تھے۔ سب کا مشورہ تھا کہ اس سال مفتوحہ علاقے کا انتظام مستحکم کیا جائے اور اگلے سال مہم دوبارہ شروع کی جائے۔ حجاج کو یہ بات پسند نہ آئی اور بات ابن اشعث کی بغاوت تک پہنچ گئی۔ چنانچہ ابن اشعث نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ کوفہ اور بصرہ پر قبضہ کر کے بصرہ کے نواح میں گورنر کا محاصرہ کر لیا۔ لشکریوں نے تقاضا کیا کہ گورنر اور خلیفہ دونوں معزول ہو جائیں۔ خلیفہ نے حجاج کی معزولی کا پروانہ اس شرط کے ساتھ ابن اشعث کے پاس بھیجا کہ ابن اشعث کی مرضی کا صوبہ گورنری کے لئے دیا جاتا ہے لیکن بغاوت ختم کر دی جائے۔ ابن اشعث اس پر تیار تھا لیکن لشکری خلیفہ اور گورنر کی معزولی سے کم پر راضی نہ ہوئے۔ چنانچہ لڑائی پھر چھڑ گئی۔ 83 ہجری 701ء میں ابن اشعث کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ابن اشعث شکست خوردہ بے خانماں ہو کر اسی علاقے میں پہنچ گیا جو پہلے فتح کر چکا تھا۔ اس علاقے کے حکمران رتبیل نے ابن اشعث کا سر کاٹ کر حجاج کے پاس بھیج دیا۔ حجاج کے خلاف عراقی عربوں کی یہ آخری بغاوت تھی جس پر حجاج نے شامی فوجوں کے ذریعہ قابو پایا اور ملک پر شامی فوجوں کی گرفت کو اور مضبوط کر دیا۔ حجاج نے ابن اشعث کا ساتھ دینے والوں کا بے دریغ قتل عام کیا۔ انہی مقتولین میں مشہور تابعی سعید بن جبیر اور آنحضرت ﷺ کے ماموں زاد محمد بن سعد بھی تھے۔

ابن اشعث کے استیصال کے بعد حجاج نے فیصلہ کیا کہ شامی لشکر جو بہت زیادہ تعداد میں موجود تھا اور جس نے ابن اشعث کی بغاوت کو فرو کیا تھا، اپنے پاس رکھے تاکہ کوفہ اور بصرہ کی طرف سے اطمینان رہے۔ یہاں بھی حجاج کی سنگ دلی اور اسلامی حدود کو پامال کرنے والا عمل سامنے آیا۔ اس نے اہل کوفہ کو حکم دیا کہ شامی فوجیوں کو اپنے گھروں میں ٹھہرائیں۔ چند ہی دنوں میں شامی فوجیوں نے عورتوں کے ساتھ زیادتیاں شروع کر دیں اور حجاج کے اعمال نامے میں ایک اور سیاہ کارنامے کا اضافہ ہو گیا۔ شامیوں کا یہ رویہ حجاج کے لئے ایک اور مصیبت کھڑی کر سکتا تھا۔ چنانچہ اسے جلد ہوش آ گیا اور اس نے فوجیوں کے لئے ایک الگ چھاؤنی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے تجربہ کار لوگوں کو مامور کیا کہ کوئی مناسب مقام تجویز کریں۔

جو مقام نئی چھاؤنی کے لئے منتخب کیا گیا اس کا قصہ بھی عجیب ہے۔ حجاج کے بھیجے ہوئے آدمی جب اس مقام پر پہنچے تو انہوں نے ایک راہب کو دیکھا جو اس مقام کو نجاست سے صاف کر رہا تھا۔ راہب سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا کہ ہم نے اپنی کتابوں میں پڑھ رکھا ہے کہ اس مقام پر ایک مسجد تعمیر کی جائے گی جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوگی۔ لہٰذا اس جگہ کو پاک صاف کر رہا ہوں۔ بھیجے ہوئے تجربہ کار لوگوں کی بیان کردہ کیفیت حجاج کو پسند آئی۔ حجاج نے اس خاص مقام پر مسجد بنا کر اس کے اردگرد فوجی چھاؤنی قائم کروی اور شامیوں کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا اور خود بھی وہیں منتقل ہو گیا۔ یہی شہر واسط کی ابتداء تھی۔

ابن جارود اور ابن اشعث کی بغاوتوں کو ختم کرنے کے بعد عبدالملک کا انحصار حجاج پر اور بڑھ گیا اور اس نے حجاج کو سارے عالم اسلام کا گورنر بنا دیا۔

حجاج عبدالملک حکومت کا شاہ دماغ تھا۔ عبدالملک نے حجاج کے مشورہ سے خالص سونے کے اسلامی سکے مضراب کروائے جس سے مسلمانوں کو معیشت ایرانی اور بازنطینی سکوں اور تسلط سے آزاد ہوگئی۔ عربی زبان کو سرکاری زبان قرار دینا بھی ان دونوں کا کارنامہ ہے۔

قرآن مجید کے نسخوں میں یکسانیت پیدا کرنے اور بعض متکلمین کے جھگڑوں کو ختم کرنے کے لئے حجاج نے ایک ہی متن مقرر کرنے کی پوری کوشش کی۔ قرآن پاک کو تیس پاروں میں تقسیم کرنا اور ان کو اجزا میں تقسیم کرنا اور قرآن کے اعراب لگانا بھی یقیناً اس کا کارنامہ ہے۔ اس کے طبعی تشدد اور سخت گیری نے اس کام کے حسن کو گہنا دیا۔

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ عبدالملک بن مروان کا زمانہ شورشوں اور بغاوتوں کا زمانہ تھا۔ ولید کا زمانہ ان خرخشوں سے پاک تھا۔ خوش قسمتی سے ولید کو قتیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نصیر، محمد بن قاسم اور مسلمہ بن عبدالملک جیسے نامور جنگجو، فاتح سپہ سالار مل گئے۔ ولید نے حجاج کے مشورہ سے ان جرنیلوں کو اکنافِ عالم میں فتوحات کا سلسلہ وسیع کرنے کے لئے پورے وسائل مہیا کئے۔ چنانچہ ترکستان، چین، اسپین اور ہندوستان کی فتوحات نے اسلامی قلمرو کو اتنی وسعت دی کہ آج ہم دمشق سے ہزاروں میل دور انہی فتوحات کی بدولت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایات کو زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھنے پر مسرور ہیں۔

86 ہجری تا 96 ہجری ولید کا دورِ حکومت اندرونی لڑائیوں سے قریباً پاک ہو چکا تھا لیکن حجاج کا ظلم و جور عجیب انداز میں سامنے آیا۔ ولید نے اپنی خلافت کے اولیں دنوں میں اپنے چچازاد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو حجاز کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے گورنری اس شرط پر قبول کی تھی کہ ان سے کسی پر ظلم نہیں کروایا جائے گا۔ چنانچہ عمر نے حجاز کے لوگوں کی خدمت اور راحت رسانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ حجاز کے لوگ ولید کو خطوط لکھ کر عمر کی تعیناتی پر مبارکباد اور دعائیں دیتے تھے اس کے نتیجے میں حجاج کے ستائے ہوئے لوگ حجاز میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ علاوہ ازیں حضرت عمر نے ولید کو خط لکھا کہ حجاج اپنی حد سے بڑھ گیا ہے اور اس نے عراق کے لوگوں کو ستا رکھا ہے۔ حجاج کو جب اس خط کا حال معلوم ہوا تو اس نے ایک خط عمرؒ کی شکایت میں ولید کو لکھا کہ اکثر فتنہ پرداز اور منافق لوگ عراق سے جلاوطن ہو کر عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس جاتے ہیں اور عمر ان کی گرفتاری میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ یہ بات حکومت و سلطنت کے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے، مناسب یہ ہے کہ آپ عمر بن عبدالعزیزؒ کو حکومت سے معزول کر دیں۔

جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے، حجاج دولت مروان کا مربی، محسن اور بازوئے شمشیر زن تھا۔ اس کی بات کو رد کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ عمر بن عبدالعزیز جیسے شریف النفس اور خدا ترس گورنر کو معزول کر کے خالد بن عبداللہ کو مکہ مکرمہ اور عثمان بن حیان کو مدینہ کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ خالد نے مکہ میں جاتے ہی تمام اہل عراق کو نکال باہر کیا اور ان لوگوں کو بھی دھمکایا جنہوں نے اپنے مکانات اہل عراق کو کرائے پر دے رکھے تھے جو لوگ حجاج کے ظلم و جبر سے بچنے کے لئے مکہ مکرمہ آ گئے تھے۔ ان میں سعید بن جبیرؒ مشہور تابعی اور مفسر قرآن بھی تھے۔ سعید بن جبیرؒ کی خطا یہ تھی کہ وہ ابن اشعث کے ہمنوا تھے۔ حجاج کی نظر میں

Marfat.com

یہ خطا کوئی معمولی خطا نہ تھی۔ خالد نے ان کو گرفتار کر کے حجاج کے پاس بھیج دیا اور حجاج نے ان کو قتل کرا دیا۔ سعید بن جبیرؒ بالکل بے گناہ تھے۔ اسی طرح خالد بن عبداللہ اور عثمان بن حیان دونوں گورنروں نے اہل عراق کو حجاز سے نکالا اور حجاج جیسے خونخوار بھیڑیئے کے آگے ڈال دیا اور ان میں اکثریت سعید بن جبیرؒ جیسے انجام سے دو چار ہوئی۔

حجاج کی موت ایک عبرت آموز واقعہ

95 ہجری کے اوائل میں حجاج مرض زمہریر کا شکار ہو گیا۔ اس مرض میں مریض ہر دم اور ہر لحہ سردی محسوس کرتا رہتا ہے۔ آگ کا قرب بھی اسے کوئی راحت یا آرام نہیں دے سکتا۔ کچھ عرصہ گزرا کہ حجاج کے پیٹ میں شدید درد شروع ہو گیا۔ زمہریر کی طرح درد بھی مزمن تھا۔ حجاج کے علاج کے لئے طبیب کو بلایا گیا، طبیب نے حجاج کی حالت کے پیش نظر ایک دھاگے سے گوشت کا ٹکڑا باندھ کر حجاج کو اسے نگلنے کے لئے کہا۔ گوشت کا ٹکڑا دھاگے کی مدد سے باہر نکالا گیا تو وہ کیڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ طبیب کے مطابق یہ نشانی معدے کی سرطان کی تھی، جس سے بچ جانا ناممکن تھا۔ اس حالت کو دیکھ کر حجاج کی والدہ نے حجاج کے مظالم یاد دلائے اور اللہ سے معافی مانگنے کی تاکید کی۔ حجاج نے اپنی ماں سے سوال کیا کہ اگر میری فردِ جرم آپ کو دے دی جائے تو آپ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔ ماں نے کہا میں تمہیں معاف کر دوں گی۔ اس پر حجاج نے کہا تو پھر اللہ تعالیٰ کی شفقت ستر (70) ماؤں سے بھی زیادہ ہے وہ بھی مجھے معاف کر دے گا۔

بالآخر حجاج کے تمام جبر و استبداد کے باوجود موت نے اسے اپنے چنگل میں لے لیا اور وہ اپنے ہی بسائے ہوئے شہر واسط میں دفن ہوا۔ ایک زمانہ حجاج کا دشمن تھا اور اس سے نفرت کرتا تھا۔ اس لئے اس کی قبر کا نشان مٹا دیا گیا۔ یہ واقعہ 95 ہجری کے آخری دنوں کا ہے۔ مرنے کے وقت حجاج کی عمر 52 سال تھی۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ حجاج کے کردار کو بالوضاحت قارئین کرام کے سامنے حتی الامکان مستند روایات کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔ ہم اس داستانِ خونچکاں کو ختم کرنے سے پہلے مولانا مودودیؒ کی مشہور کتاب "خلافت و ملوکیت" سے ایک اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اپنے ظلم و جور سے دولتِ مروان کے زوال کی قبر کھودنے والے "ہیرو" کی شخصیت پوری طرح کھل کر سامنے آ جائے۔

> "عبدالملک اور اس کے بیٹے ولید کے زمانے کی سب سے بڑی لعنت حجاج کی گورنری تھی جسے بیس سال تک ظلم و ستم کی کھلی چھٹی ملی رہی۔ اگرچہ کوئی انسان دنیا میں مجسم شر نہیں ہوتا، حجاج بن یوسف بھی خیر سے بالکل خالی نہ تھا۔ قرآن پر اعراب لگوانا اس کی وہ نیکی ہے جس کی تعریف رہتی دنیا تک کی جائے گی۔ سندھ کی فتح بھی اس کے کارناموں میں سے ہے جس کی بدولت آج اس سرزمین پر اللہ کا نام لینے والے پائے جاتے ہیں۔ مگر کسی شخص کی ساری نیکیاں بھی ایک مومن کے قتل ناحق کی ہم وزن نہیں ہو سکتیں جس کا ارتکاب اس نے اپنے دورِ حکومت میں کیا۔ مشہور امام قرأت عاصم بن ابی النجود کہتے ہیں کہ "اللہ کی حرمتوں میں سے کوئی حرمت ایسی نہیں رہ گئی جس کا ارتکاب اس شخص نے نہ کیا ہو۔" حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کہتے ہیں کہ "اگر دنیا کی تمام قومیں خباثت

Marfat.com

کامقابلہ کریں اور اپنے سارے خبیث لے آئیں تو ہم تنہا حجاج کو پیش کر کے ان پر بازی لے جا سکتے ہیں۔" حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو وہ سردار منافقین کہتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ اگر ابن مسعودؓ کی قرأت پر کوئی شخص قرآن پڑھے گا تو میں اس کی گردن مار دوں گا اور مصحف سے اس قرأت کو اگر سور کی ہڈی سے بھی چھیلنا پڑے گا تو چھیل دوں گا۔ اگر ابن مسعودؓ مجھے مل جاتے تو میں ان کے خون سے زمین کی پیاس بجھاتا۔

اس نے حضرت انسؓ بن مالک اور حضرت سہل بن سعد ساعدی جیسے بزرگوں کو گالیاں دیں اور ان کی گردنوں پر مہریں لگوائیں۔ اس نے عبداللہؓ بن عمر کو قتل کی دھمکی دی۔ وہ علانیہ کہتا تھا کہ اگر میں لوگوں کو مسجد کے ایک دروازے سے نکلنے کا حکم دوں اور وہ دوسرے دروازے سے نکلیں تو میرے لئے ان کا خون حلال ہے۔ اس کے زمانہ میں جو لوگ قید کی حالت میں کسی عدالت کے فیصلے کے بغیر قتل کئے گئے صرف ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ جب وہ مرا ہے تو اس کے قید خانوں میں 80 ہزار بے قصور انسان کسی مقدمے اور کسی عدالتی فیصلے کے بغیر سڑ رہے تھے اور یہ ظالم گورنر تھا جس کے حق میں عبدالملک نے اپنی اولاد کو مرتے وقت وصیت کی تھی کہ حجاج بن یوسف کا ہمیشہ لحاظ کرتے رہنا کیونکہ وہی ہے جس نے ہمارے لئے سلطنت ہموار کی، دشمنوں کو مغلوب کیا اور ہمارے خلاف اٹھنے والوں کو دبا دیا۔ یہ وصیت اس ذہنیت کی پوری نمائندگی کرتی ہے جس کے ساتھ یہ لوگ حکومت کر رہے تھے۔ ان کی نگاہ میں اصل اہمیت ان کے اپنے اقتدار کی تھی اس کا قیام و استحکام جس ذریعہ سے بھی ہو وہ ان کے نزدیک مستحسن تھا۔ قطع نظر اس سے کہ شریعت کی تمام حدیں اس کی خاطر توڑ ڈالی جائیں۔ یہ ظلم و ستم اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں ایک مرتبہ عمر بن عبدالعزیز چیخ اٹھے کہ: "عراق میں حجاج، شام میں ولید، مصر میں قُرۃ بن شریک، مدینہ میں عثمان بن حیان، مکہ میں خالد بن عبداللہ القسری' خداوند تیری دنیا ظلم سے بھر گئی ہے۔ اب لوگوں کو راحت دے، سیاسی ظلم کے علاوہ یہ لوگ عام دینی معاملات میں بھی بڑی حد تک انحراف پسند ہو گئے تھے۔ نماز میں غیر معمولی تاخیر ان کا معمول تھا۔ جمعہ کا پہلا خطبہ بیٹھ کر دیتے تھے۔ عیدین میں نماز سے پہلے خطبہ دینے کا طریقہ مروان نے اختیار کیا اور اس کے خاندان کے لئے یہ مستقل سنت بن گیا۔"

Marfat.com

خالد بن عبداللہ القسری

ابن النصرانیہ

خالد بن عبداللہ القسری ایک یمنی سردار تھا جو عرصہ دراز تک دولتِ مروان کا کل پرزہ ہی نہیں بڑے مہروں میں سے ایک تھا۔ خالد کو عام طور پر لوگ ابن النصرانیہ بھی کہتے تھے۔ خالد کا باپ عرب قبیلہ بجیلہ سے تعلق رکھتا تھا اور ماں ایک رومیہ نصرانیہ تھی یعنی یوروپین عیسائی عورت تھی۔ خالد کی ماں آخری دم تک اپنے مذہب عیسائیت پر قائم رہی۔ خود خالد تو بظاہر مسلمان ہی تھا لیکن اس کے زمانہ ولایت میں اس کے زیرنگیں علاقے میں عملاً غیر مسلموں کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔

ہشام بن عبدالملک، یزید بن عبدالملک کے انتقال کے بعد 25 شعبان 105 ہجری کو 35 سال کو عمر میں تخت نشین ہوا۔ ہشام نے تخت نشین ہوتے ہی مشہور سردار ابن ہبیرہ کو عراق کی حکومت سے معزول کر کے خالد القسری کو عراق کا گورنر بنا دیا۔ خالد اس عہدے پر پندرہ سال متمکن رہا۔

ہم حجاج بن یوسف کے باب میں عرض کر آئے ہیں کہ حجاج کی شکایت پر جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو حجاز کی گورنری سے ہٹایا گیا تو مکہ کو خالد کے حوالے کر دیا گیا۔ اس نے عراقی پناہ گزینوں کو گرفتار کر کے حجاج کے حوالے کر دیا جس نے انہیں بے دردی سے قتل کروا دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جن پانچ ظالموں کی شکایت اللہ سے کی تھی، ان میں سے ایک یہی خالد القسری بھی تھا۔ عراق کا گورنر بننے سے پہلے ہی خالد کا ظلم و جور ہشام پر ظاہر ہو چکا تھا۔ اسی لئے اس نے دولتِ مروان کے اصول کے مطابق یعنی ''جتنا بڑا ظالم، اُتنا بڑا عہدہ'' اسے فوراً گورنر بنا دیا۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ خالد نے مسلمانوں کی مسجدوں کے میناروں کو منہدم کروانے کا حکم دیا۔ وجہ یہ بتائی تھی کہ ان پر چڑھ کر موذن لوگوں کی بہو بیٹیوں کو جھانکتے ہیں۔ ادھر موذنوں پر الزام عائد کر کے کوفہ کی مسجدوں کے مینارے ڈھائے جا رہے تھے اور دوسری طرف ستم ظریفی کی حد تھی کہ کوفہ میں اپنی ماں کے نام سے ایک گرجا بھی تعمیر کرا دیا۔ اس کے طرزِ عمل سے مسلمانوں میں بے چینی کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ خالد نے شکایت کو سن کر عذر پیش کیا کہ منجملہ دوسری باتوں کے اس کا یہ تاریخی فقرہ اب تک مسلسل کتابوں میں نقل کیا جا رہا ہے کہ ''خدا کی لعنت ان عیسائیوں کے دین پر، اگر ان کا دین تمہارے دین سے بدتر ہے۔''

بیان کرنے والے یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی شانِ اقدس میں اپنے آقاؤں (بنوامیہ) کو خوش کرنے کے لئے صلواتیں سنایا کرتا تھا لیکن یہ عمل بھی اسکا طریقہ واردات تھا۔ بنی امیہ میں سے ایک شخص نے ابن النصرانیہ سے کچھ امداد چاہی۔ بیچارے کو صاف جواب دے دیا گیا۔ اپنے مطلب کی خاطر خالد داد و دہش میں ہاتھ کھلا رکھتا تھا۔ بعض اوقات بنی امیہ کے دشمنوں بنی ہاشم کے ساتھ حسن سلوک کیا کرتا تھا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی، اس قسم کے لوگوں کا قاعدہ ہے کہ اپنے عیوب کی پردہ پوشی کے لئے ''دہن دوزی'' کے نسخہ پر عمل کرتے ہیں۔ خالد کے اس منافقانہ وطیرہ کی وجہ سے یہ مشہور ہوگیا تھا کہ ''لین دین کا تعلق تو خالد ہاشمیوں سے رکھتا ہے، ہمارے لئے تو اس کے پاس علیؓ کی صلواتیں رہ گئی ہیں۔''

یہ لطیفے کی بات ہے کہ خالد تک جب یہ بات پہنچی تو اس کی زبان سے نکلا، سننے والے کا جی چاہے تو کچھ عثمانؓ کو بھی سنا دوں۔ اصل میں خالد قسری کو نہ حضرت علیؓ سے کوئی تعلق تھا اور نہ عثمانؓ سے۔ وہ سب کچھ دنیاداری کے لئے کرتا تھا۔ حضرت علیؓ کی مذمت میں مبالغہ سے کام لیتا۔ لوگ کہتے کہ خالد اہل بیت سے میل جول رکھتا ہے، اس بدنامی کا ازالہ حضرت علیؓ کو گالیاں دے کر کیا کرتا تھا۔

مشہور مورخ ابن اثیر کا بیان ہے کہ خالد ہشام کے ساتھ عقیدت میں انتہائی غلو سے کام لیتا تھا۔ العیاذ باللہ اسے رسولوں سے بھی آگے کا درجہ دیا کرتا تھا اور بوقت ضرورت لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اس کی توہین بھی کر دیا کرتا تھا۔

سطور بالا میں ہم نے کسی حد تک خالد قسری کی عجیب و غریب دھوکہ دہی پر مبنی کافرانہ عقائد کی تفصیل بیان کی ہے۔ جب خالد گورنر بنا تھا اس وقت حضرت امام اعظم کی عمر 25 سال تھی اور جب یہ معزول ہوا تو اس وقت آپ 40 سال کے تھے۔ حضرت سلم بن سالم خاندان فاروقی کے چشم و چراغ تھے وہ شہادت دیتے ہیں کہ میں نے بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات کی لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کا احترام اور ہمدردی ابوحنیفہ کے دل میں جتنی پائی اس کی نظیر دیکھنے میں نہیں آئی۔ عام رعایا خالد کے نظریات سے از حد بیزار اور مبتلائے کرب رہتی تھی، تو امام اعظم کے دل پر کیا گزرتی ہوگی؟ یہی وجہ ہے کہ اموی حکومت ایک صدی بھی پوری نہ کر سکی اور ڈھیر ہوگئی۔ عوام کی رائے سے بے فکر ظلم کی چکی کو خلیفہ اور ان کی متوسلین رکنے ہی نہ دیتے تھے۔

اب ہم اس داستان کا اہم ترین حصہ بیان کرتے ہیں کہ خالد قسری نے مسلم معاشرے کو کس طرح لوٹا کس طرح اسلامی شعائر کا عملاً مذاق اُڑایا کس طرح جھوٹ اور فریب کو اپنی ڈھال بنایا اور بالآخر کس ذلت سے موت کا نوالہ بنا۔

حالات کی ستم ظریفی سمجھئے یا دولتِ مروان کے بادشاہوں کی سنگدلانہ پالیسیاں، حکمرانوں کو عوام پر ظلم توڑنے کے لئے ایسے ''نابغہ روزگار'' لوگ مل جایا کرتے تھے جو خدا کی مخلوق کی گردنیں نیچی کرنے اور اگر نیچی نہ ہوں تو اڑانے کے لئے ہر دم تیار رہتے تھے اور ان کا ضمیر انہیں کوئی کچوکہ نہیں لگاتا تھا۔ ابن اثیر لکھتے ہیں کہ ہشام نے خالد کے نام بصیغہ راز یہ فرمان بھیجا کہ جب تک امیر المومنین (ہشام) کا غلہ فروخت نہیں ہو جاتا اس وقت تک کسی دوسرے کو اپنا غلہ بیچنے کی اجازت نہ دی جائے۔ خالد نے اس کے مطابق تمام جگہ احکام نافذ کر دیے۔ نتیجہ ظاہر تھا کہ علاقہ میں غیر معمولی گرانی پھوٹ پڑی۔ لکھا ہے کہ کوفہ کے بازار میں ایک کیلجہ (غلہ کا سب سے چھوٹا پیمانہ) ایک درہم میں بکنے لگا۔ خلق خدا اسی گرانی سے چیخ اٹھی، عوام کا

Marfat.com

الزام خالد پر تھا کہ اس نے کاشتکاروں کو غلہ فروخت کرنے سے روک دیا ہے۔ خالد سخت ذہنی کوفت میں مبتلا تھا۔ ہشام کے راز کو بھی ظاہر نہیں کرسکتا تھا اور صبح و شام لوگوں کی گالیاں، لعنت ملامت بھی اس کے لئے ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھیں۔ آخر ایک دن اس نے بر سرِ منبر دل کا بخار ان الفاظ میں نکالنا شروع کیا: ''تم لوگوں کا خیال ہے کہ اناج کو میں نے گراں کر رکھا ہے تو میں تمہارے سامنے کہتا ہوں کہ جس کی وجہ سے یہ گرانی آئی ہے اس پر خدا کی لعنت۔''

یعنی اشارہ ہشام کی طرف کر رہا تھا کہ میرا کیا قصور، خود تمہارے امیر المومنین کا حکم یہ ہے کہ پہلے سرکاری غلے کا ایک ایک دانہ (من مانی قیمتوں) پر فروخت ہوجائے تب بازار میں دوسرے بیچنے والوں کو مال لانے کی اجازت دی جائے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خالد کتنا بے ضمیر تھا، جس ہشام کو وہ رسول سے بھی زیادہ اہمیت دیتا تھا آج بر سرِ منبر اسے گالیاں سنا رہا تھا۔

ہشام کی والدہ ابو جہل کے بھائی کی اولاد میں سے تھی اور وہ حد درجہ احمق تھی۔ خالد قسری نجی مجالس میں ہشام کا ذکر ابن الحمقی کے نام سے کرتا، ہشام کا نام لئے بغیر وہ کہتا ابن الحمقی کا یہ حکم آیا ہے یا ابن الحمقی نے یہ نیا شوشہ چھوڑا ہے۔ ایسا آدمی نہ بادشاہ کا وفادار نہ عوام کا دوست، بظاہر لالچی، بباطن اپنی ذات اور اولاد کا دشمن ہی ہوسکتا ہے۔

خالد بن عبد اللہ القسری کی جاگیر

خالد قسری 15 سال تک عراق کا گورنر رہا۔ اسے بیس ہزار سالانہ کی جاگیر بطور تنخواہ ملی تھی۔ خالد نے مسلمانوں کے بیت المال سے بے بہا خرچ کرکے اس جاگیر میں متعدد نہریں بنوائیں اور بیس ہزار سالانہ کی جاگیر پندرہ سال میں ایک کروڑ تیس لاکھ کی آمدنی دینے لگی۔ ان حالات نے اس کے دماغ کو بے قابو کردیا تھا۔ جوش میں آکر اپنے بیٹے کو کہتا کہ ہشام کے بیٹے مسلم سے تو آخر کس بات میں کم ہے۔ کبھی کہتا بیٹا وہ کیا مزے کا زمانہ ہوگا جب ہشام بھی تیرا محتاج بن کر رہے گا۔ آخر میں وہ سارے عراق کو اپنی موروثی جائیداد قرار دینے لگا۔ حضرت عمرؓ پر الزام لگایا کرتا تھا کہ میری قوم بجیلہ سے انہوں نے عراق چھین لیا اور مسلمانوں کے حوالے کردیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں مظلوم ہوں، میرے پاؤں کے نیچے کوئی حصہ زمین ایسا نہیں ہے جو میرا نہ ہو۔

کوفہ میں خالد اور اس کے حواریوں کا ہر روز روزِ عید اور ہر شب شب برأت ہوتی تھی۔ خالد کا ایک ملازم طارق تھا۔ اس نے اپنے بچے کی ختنہ کی تقریب میں جو خرچ کیا سو کیا۔ جو تحفے اپنے آقا خالد کے سامنے پیش کئے ان میں علاوہ قیمتی تھانوں اور دوسری چیزوں کے ایک ہزار لونڈی اور ایک ہزار غلام بھی تھے۔ تاریخ نویس لکھتے ہیں کہ خالد کا چھوٹا بھائی اسد بن عبد اللہ تھا۔ جسے خالد نے خراسان کا حاکم بنادیا تھا۔ اس زمانے میں وہ بلخ میں تھا کہ مجوسیوں کی عید آگئی۔ ہرات کے ایک دہقان نے جو مجوسی تھا۔ اسد کے پاس عید کی عیدی پیش کی جس کی مالیت لاکھوں میں بنتی تھی۔

الغرض، یہ تھا وہ تماشہ بنی امیہ کی حکومت کا جسے حساس دل رکھنے والے تابعین اور دل گرفتہ مسلمان اپنے وطن مالوف کوفہ میں دیکھ رہے تھے۔ مسلمانوں پر گورنر نے کافروں کو مسلط کر رکھا ہے، مسلمانوں کی مسجدوں کے مینارے ڈھائے جارہے ہیں اور گرجوں کی تعمیر مسلمانوں کی رقوم سے ہورہی ہیں۔ مسلمانوں کے رسول ﷺ پر خلیفہ کو ترجیح دی جارہی ہے، علیؓ پر لعنت

Marfat.com

بھی جارہی ہے، عثمانؓ کو بھی بخشا نہیں جارہا مسلمانوں کے دین کے ساتھ تمسخر کیا جارہا ہے۔ یہ تو گورنر کررہا ہے، خود خلیفہ اس فکر میں ہے کہ خواہ رعایا پر کتنی بڑی مصیبت آجائے لیکن اس کا مال اچھے داموں میں فروخت ہو کر درہم و دینار کی صورت میں اس کے پاس پہنچ جائے۔ مسلمانوں کے امیر کا نوکر ایک بچے کے ختنہ پر وہ ولولے دکھائے کہ شاید بادشاہوں کے لڑکوں کے ختنہ پر بھی اتنی زرمستیاں نہ دکھائی جاتی ہوں، مگر ساری دنیا چپ ہے۔ بنی امیہ کی تلوار بے پناہ و بے اماں نے خون کی جو ندیاں بہائی ہیں اور ظلم کے جو آتش کدے کھود رکھے ہیں ان کو دیکھ کر بھلا کس کا گردہ اور کس کا جگر تھا کہ آہ نیم شبی کے سوا اور کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ مسلسل دیکھا جارہا تھا کہ زبان سے بات نکلی نہیں کہ سرتن سے جدا ہو گیا۔

خالد اپنی آمدنی بڑھا بڑھا کر دراصل اپنی قبر کھود رہا تھا۔ جس چیز کے عشق میں ہشام مبتلا تھا اسی کا سودا خالد کے سر میں سمایا۔ ہشام کی جاگیر خالد کی جاگیروں کے قریب تھی۔ شاہی جاگیر کے داروغہ نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ خالد شاہی جاگیر کے بند کو توڑ رہا ہے۔ یہیں سے معاملات کی خرابی کی ابتداء ہوئی۔ ایک خائن اور حدود و قیود کا سرکش آدمی ہمہ پہلو بددیانت اور متمرد ہوتا ہے۔ خالد کی جاگیرداری اور جاگیر سازی کے قصے کو فی الحال یہیں چھوڑتے ہیں اور اس کی سرکش شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے لاتے ہیں اور وہ ہے نومسلموں سے زبردستی جزیہ وصول کرنا۔

خالد نے ہشام کے حکم کے مطابق اپنے چھوٹے بھائی اسد بن عبداللہ القسری کو خراسان کی حکومت سنبھالنے کا پروانہ دیا۔ حکومت سنبھالتے ہی اس نے ہرات اور غور کی طرف حملے شروع کر دیے۔ وہاں سے فتح کے علاوہ مسلمانوں کو بہت سا مال ملا، ان معرکوں میں دو سردار ایسے تھے جنہوں نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور بڑی ناموری حاصل کی۔ ان سرداروں میں سے ایک کا نام نصر بن یسار اور دوسرے کا مسلم بن احور تھا۔ اسد بن عبداللہ نے چند ہی روز میں ایسے اخلاق کا مظاہرہ کیا کہ یہ لوگ بددل ہو گئے اور وحشت زدہ رہنے لگے۔ اس نے نصر بن یسار کو سو درے لگوائے اور اس کے ایک ساتھی عبدالرحیم بن نعیم کا سر منڈا دیا اور ان دونوں کو اپنے بھائی خالد کے پاس بھیج دیا کہ یہ لوگ میرے قتل کی سازش میں شریک تھے۔

اسی طرح اسد اہل خراسان کو بہت لعن طعن کرتا تھا اور سختی سے پیش آتا تھا۔ ان باتوں کا حال ہشام کو معلوم ہوا تو اس نے دمشق سے خالد بن عبداللہ کو لکھا کہ اپنے بھائی کو خراسان کی حاکمیت سے معزول کر دو اور خود ہشام بن عبدالملک نے براہ راست اشرس بن عبداللہ سلمی کو خراسان کی حکومت پر مامور کر کے بھیج دیا اور خالد کو اطلاع دے دی۔ اشرس نے سمرقند اور ماوراءالنہر کی طرف دو نمائندے بھیجے کہ لوگوں کو اسلام کی خوبیاں سمجھائیں اور شرک کی برائیوں سے آگاہ کریں۔ ساتھ ہی اشرس نے اہل خراسان کے ساتھ حسن سلوک سے ان کے دل جیت لئے۔ دونوں نمائندوں کی کوشش سے لوگوں کو اسلام کی حقانیت اور راست روی کا علم ہوا۔ انہوں نے جرائم اور شرک سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور جوق در جوق اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ اس معروف عمل سے ذمیوں کی تعداد کم ہونے لگی اور مسلمان اکثریت میں آنے لگے۔ نتیجتاً جزیہ کی آمدنی میں کمی واقع ہونا شروع ہو گئی جو ہشام بن عبدالملک اور خالد بن عبداللہ کو بہت گراں گزری۔ اشرس بن عبداللہ سلمی نے عمرو کندی کو افسر مال مقرر کر رکھا تھا۔ اشرس نے عمرو سے تکرار کیا کہ ہو سکتا ہے کچھ لوگ محض جزیہ کی وجہ سے مسلمان ہو گئے ہوں۔

Marfat.com

ان کے ختنے دیکھو، اگر انہوں نے ختنہ کروالیا ہے اور نماز پڑھتے ہیں تو جزیہ معاف ورنہ جزیہ ہر حال میں لیا جائے۔ بیشک مسجد بھی بنوائے اور نماز بھی پڑھے۔ عمرو کندی نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا تو اشرس نے اسے معزول کر کے ایک اور شخص ہانی بن ہانی کو افسرِ مال مقرر کیا۔ ہانی نے نومسلموں سے جزیہ وصول کرنا شروع کر دیا جس پر ایک سردار ابوالصیدا نے مسلمانوں کو جزیہ دینے اور ہانی کو جزیہ لینے سے روک دیا۔ ان وجوہات کی بنیاد پر ہانی نے اشرس کو خط لکھا کہ لوگ مسلمان ہیں، مسجدیں بناتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، ان سے ختنہ دیکھنے کے غیر اسلامی حکم کے تحت جزیہ نہیں لیا جا سکتا۔ اس پر اشرس کا حکم آیا کہ جزیہ ہر حال میں لو، بیشک مسلمان ہو جائیں۔ اس پر ابوالصیدا نے نومسلموں کو ملا کر قریباً سات ہزار کی جمعیت تیار کر لی۔ ابوالصیدا کا موقف مضبوط تھا، اس لئے اور لوگ بھی اس کے ساتھ مل گئے اور اس قضیے نے باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اشرس نے وعدہ وعید کر کے ابوالصیدا سے صلح کر لی اور جزیہ معاف کرنے کا وعدہ کر لیا لیکن جلد ہی وعدے سے پھر گیا تو بہت سارے نومسلم مرتد ہو گئے اور خاقانِ چین سے امداد کے طالب ہوئے۔ خاقان اور اشرس میں باقاعدہ جنگ ہوئی۔ فریقین کے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ بالآخر صلح ہو گئی۔ یہاں یہ امر بالکل ثابت ہو جاتا ہے کہ ظالم مسلمان امراء نے بزورِ شمشیر نومسلموں سے جزیہ لینا چاہا تو وہ مرتد ہو گئے۔ لہٰذا ان کے ارتداد کی وجہ شمشیر تھی نہ کہ اسلام، شمشیر اسلام میں داخل نہیں کرتی بلکہ باہر نکال دیتی ہے۔

جیسا کہ ہم خالد بن عبداللہ قسری (زیرِ بحث شخصیت) کے عقائد، زراندوزی اور حیلہ سازی کو تفصیل سے بیان کر آئے ہیں۔ اسی طرح نومسلموں سے جزیہ لینا اور انہیں مرتد بنا دینا بھی خالد قسری کی فردِ جرم کا اہم حصہ ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ دولتِ مروان کے حکمرانوں کو صرف اور صرف اپنے اقتدار اور مال و زر سے محبت تھی۔ اسلامی شعائر کی پاسداری ان کے نزدیک ثانوی حیثیت سے بھی نچلے درجے پر آتی تھی۔

پندرہ سال گزر گئے، خالد قسری نے بطور گورنر عراق ملتِ اسلامیہ کے ہر فرد کو اذیت سے دوچار کیا، تمدن کے بنت کو کمزور کیا، لوگ خوشامدی اور دولت پرست بن کر رہ گئے، اشرافیہ اتنی کمزور ہو گئی کہ برائی کو برائی کہنے سے بھی ڈرتی تھی۔ بالآخر خالد قسری معزول کر دیا گیا، وہ بھی اس لئے کہ وہ خلیفہ کی جاگیروں پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا۔

120 ہجری تک لوگوں کی شکایات اور خالد کے اپنے طرزِ عمل نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ آخرکار خود ہشام اس کا دشمن ہو گیا اور ہشام کے ہاتھوں ہی خالد کا زوال وقوع پذیر ہوا۔ خالد کی معزولی کے بعد یوسف بن عمر ثقفی کو عراق کا گورنر مقرر کیا گیا۔ یوسف بن عمر کے ذمے دو کام لگائے گئے۔ جاگیرداری اور خالد سے حکومتی سرمائے کی وصولی، جو کروڑوں میں تھی۔ یوسف کو حکم تھا کہ وصولی کے لئے خالد کو قتل کرنے کے علاوہ ہر اذیت سے دوچار کیا جا سکتا ہے۔

یوسف بن عمر نماز روزے کا پابند اور اللہ کے سامنے آہ و زاری کرنے والا فرد تھا۔ نمازِ فجر کے بعد چاشت تک کسی سے بات نہیں کرتا تھا، قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہتا اور غریبوں کی دادرسی کرتا۔ ان تمام خوبیوں کے برعکس وہ جنون اور متلون مزاجی کا شکار تھا۔ کوئی حکم دیتا تو اس کے اقرار اور انکار کرنے والے دونوں کو کوڑے پڑتے۔ بہرحال اس نے خالد کو حکومت کے پچاس کروڑ سے بھی زیادہ روپے کیلئے اذیت سے گزارنا شروع کر دیا۔ عزت دار آدمی پہلے تو دوسروں کا مال

لوٹتا ہی نہیں اور اگر کسی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے تو جلد از جلد اس سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے، بے شک سارا مال چلا جائے۔ خالد قسری اس قماش کا آدمی نہ تھا۔ یوسف بن عمر کو جب خالد نے کوئی رستہ نہ دیا تو بالآخر اس نے پوچھا کہ اتنی رقم تم نے چھپائی کہاں ہے یا کس کو دی ہے؟ اس نے مدینہ منورہ کے تین آدمیوں کے نام لئے کہ یہ رقم میں نے انہیں دی ہے۔ ان میں سے ایک معروف ترین شخصیت حضرت زید بن علی بن حسینؓ بن علیؓ کی تھی۔

زید بن علی اپنے وقت کے سب سے خوبصورت انسان تھے۔ صوری خوبیوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے خاندانِ نبوت کے اس شہزادے کو علم و فضل کی دولت بھی وافر عطا کر رکھی تھی۔ حضرت زید امام ابوحنیفہ کے ہم عصر تھے۔ آپ بھی حضرت زید کو زمانے کا بہترین انسان اور عالم گردانتے تھے۔ حضرت زیدؒ ہشام کے دور میں کس بے دردی سے شہید کر دیے گئے وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ الغرض خالد نے حضرت زید کو اپنا شریک جرم بنانے کی کوشش کی۔ زید کا نام اس کام کے لئے استعمال کرنا گویا چاند پر تھوکنے کے مترادف تھا۔ کسی نے بھی خالد کی بات کو تسلیم نہ کیا۔ بالآخر حضرت زید نے خالد سے اس کرتوت کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ میرا خیال تھا کہ آپ کی برکت سے میری سختی معاف ہو جائے گی اور میں بچ جاؤں گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ہشام بن عبدالملک کی خلافت میں خالد کی معزولی کے بعد یوسف ہی گورنر رہا۔ ہشام کی وفات کے بعد ولید بن یزید بن عبدالملک حکمران بنا۔ اس نے بھی یوسف بن عمر کو بطور گورنر عراق بحال رکھا۔ اس پورے عرصے میں خالد یوسف کی تحویل میں یا قید میں رہا۔ ولید بن یزید نے خالد قسری سے 50 کروڑ کا حساب اور شدت سے مانگا۔ جس کے لئے وہ کوئی وضاحت پیش نہ کر سکا۔ بالآخر خالد کو یوسف بن عمر کے ہاتھوں ولید نے قتل کروا دیا۔

مسلمانوں کو بھوکا مارنے والا، بیت المال کو لوٹنے والا، نومسلموں کو مرتد بنانے والا بالآخر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

Marfat.com

ولید ثانی بن یزید بن عبد الملک

(125 تا 126ھ بمطابق 743 تا 744ء)

شجرہ ولید ثانی

ابوالعباس ولید بن یزید بن عبدالملک بن مروان بن حکم 90 ہجری میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں حجاج بن یوسف کی بھتیجی اور محمد بن یوسف کی بیٹی تھی۔ یزید بن ولید کی وفات کے وقت وہ کم سن تھا اور ہشام بن عبدالملک کے بعد ولایت میں اس کا نمبر آتا تھا۔

چال چلن اور عقاید

ولید کا چال چلن شروع سے ہی خراب تھا۔ فسق وفجور اور عیش پرستی میں مصروف رہنے کی وجہ سے لوگ اس پر انگلیاں اٹھاتے تھے۔ ولید نے نہ صرف موجودہ غلط کاریوں پر اکتفا کیا بلکہ حکومت حاصل ہونے کے بعد اپنے عقاید اور آزاد مشربی کے اعلان واظہار سے رعایا کی اکثریت کو برافروختہ کر دیا۔ وہ اپنے ناشدنی عقاید وخیالات کی اشاعت کرتا اور مے نوشی اور زنا کے جرموں کا مرتکب ہوتا تھا۔ اس کی ان حرکتوں نے اس کے عمال کے دل سے اس کا رعب اور عوام کے دلوں سے ہمدردی اور عزت ومحبت بالکل ختم کر دی۔

ولید کے پیشرو ہشام بن عبدالملک نے اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے اسے ولی عہدی سے محروم کرنے کا پروگرام بنایا۔ تاکہ عوام ولید کی بدکرداری کی اذیت ناکی سے محفوظ رہ سکیں لیکن حکومت کے مشیروں نے شدید مخالفت کی اور ولید ولی عہدی سے خارج نہ کیا جا سکا۔

طرز حکمرانی

ولید بن یزید نے حکومت حاصل ہوتے ہی ان لوگوں سے جنہیں وہ بزعم خود اپنا مخالف سمجھتا تھا، چن چن کر انتقام لینا شروع کر دیا۔ کسی کا وظیفہ بند کر دیا، کسی کو قید کیا، کسی کو قتل کرا دیا۔ سلیمان بن ہشام نے اپنے چچا اور بھائی کو پکڑ کر کوڑوں سے پٹوایا اور ڈاڑھی منڈوا کر تشہیر کرائی۔

Marfat.com

یزید بن ہشام اور ولید بن عبد الملک کے کئی بیٹوں کو قید کر دیا۔ غرض تخت نشین ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے خاندان کے افراد کی اکثریت کو اپنا دشمن بنالیا۔ پھر ہشام بن اسماعیل مخزومی والی مدینہ کے لڑکوں اور خالد بن عبد اللہ قسری سابق والی عراق جسے ہشام نے بد دیانتیوں کے باوجود سیاسی مصلحت کے تحت قتل سے بچا رکھا تھا۔ یوسف بن عمر والی عراق جو اپنی سفاکی میں مشہور تھا۔ کے ہاتھوں اور خالد سمیت بہت سے شرفا کو بھی اذیت ناک طریقے سے مروا ڈالا۔

ستم بالائے ستم ولید نے اپنی حکومت کے پہلے سال ہی اپنے دو بیٹوں حکم اور عثمان کو ولی عہد کی سند بھی دے دی۔ ولید کے اس فعل نے اسے قبول عام کی بجائے نفرت اور حقارت کا شکار کر دیا۔

نصر بن یسار خراسان کا حکمران تھا۔ حضرت یحییٰ بن زید بن علی بن حسینؑ بن علیؑ نے اپنے باپ زید کے خروج اور شہادت کے بعد خراسان میں خروج کیا اور مناسب جمعیت اپنے ساتھ جمع کر لی۔ نصر نے ولید کے حکم پر یحییٰ کا پیچھا کیا اور بالآخر وہ پیشانی پر تیر لگنے سے شہید ہو گئے۔ نصر نے ان کا سر کاٹ کر ولید کے پاس بھیج دیا اور لاش سولی پر لٹکا دی۔ جو سات سال لٹکی رہی۔ جسے بنو امیہ کے خاتمے کے بعد ابو مسلم خراسانی نے اتارا اور پھر نصر کو معزول کر کے خراسان کے مالی معاملات کے حساب کے بہانے دمشق بلا لیا۔

ولید کی بداعمالیوں، کبائر سے رغبت، اپنے خاندان کے لوگوں کے لئے اذیت اور قتل کا اہتمام، رعایا سے بالکل لاپرواہی اور اس وقت آلِ رسول ﷺ کے چشم و چراغ حضرت یحییٰ کا قتل، غرض پوری دنیائے اسلام کے خلاف عملی طور پر اعلانِ جنگ تھا۔ ان تمام عناصر نے مل کر ولید کے لئے وقت اور زمین تنگ کر دی۔ چنانچہ ولید کا چچازاد بھائی یزید بن ولید۔ ولید بن یزید کی مخالفت میں اسے معزول یا قتل کرنے کے درپے ہو گیا۔ یزید ایک عمر رسیدہ اور نیک نہاد اموی تھا۔ اسی وجہ سے عوام اور فوج نے اس کا ساتھ دیا۔

بالآخر 27 جمادی الثانی 126ھ بروز جمعہ خروج کے لئے یزید بن ولید نے فیصلہ کر لیا اور فوج لے کر بعد از نماز عشاء دمشق میں داخل ہوا۔ اول کوتوالِ شہر کو گرفتار کیا پھر سرکاری اسلحہ خانہ پر قبضہ حاصل کیا۔ ولید کو قبل ازیں ان سارے اقدامات کی خبر نہ تھی۔ چنانچہ وہ دارالامارۃ کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گیا اور اپنے تئیں حضرت عثمانؓ کی سنت کے مطابق قرآن شریف کھول کر پڑھنے لگا۔

ولید محاصرے میں تھا اور لوگ جوق در جوق یزید بن ولید کی بیعت کر رہے تھے۔ فوج کے ایک اہم سردار منصور بن جمہور کے آدمی دارالامارۃ کی دیواریں پھلانگ کر ولید تک پہنچ گئے اور اس کا سر کاٹ کر منصور بن جمہور کو لا دیا۔ یزید بن ولید نے تشہیر کرائی اور اخیر میں ولید کے بھائی سلیمان بن یزید کو دے دیا۔ اس طرح ولید ایک سال چار ماہ کی پرتشدد خلافت کے بعد موت کی آغوش میں چلا گیا۔

Marfat.com

محاکمہ: ولید بن یزید بن عبدالملک (تخت نشینی سے موت تک)

چند حقائق کا اثبات

ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو مدینہ کا گورنر بنایا گیا۔ انہوں نے مدینہ کے نامور اور صالح ترین تابعین کرام کی ایک مجلس بنائی جو سات حضرات پر مشتمل تھی۔ مدینہ کے معاملات کو چلانے کے لئے ان ''اصحاب'' سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ لوگ عمر کے طرزِ عمل سے اتنے خوش تھے کہ انہوں نے ولید کو شکرانے اور مبارک باد کے خطوط لکھے۔ کیونکہ عمر کی پارسائی، بے داغ جوانی اور سلامت روی اہل مدینہ کے لئے راحت وسکون کا سبب بن گئی تھی۔

99 ہجری میں حضرت عمرؒ سلیمان بن عبدالملک کے بعد خلیفہ بنائے گئے۔ ان کی خلافت ½2 سال رہی۔ دولتِ مروانیہ کو قائم ہوئے 35 سال گزر چکے تھے۔ لوگ خاص طرزِ زندگی اور طرزِ معاشرت کے عادی ہو چکے تھے۔ حجاج کی خونریزیاں اور خون آشامیاں بھی ان کی نظر میں تھیں۔ غرضیکہ پورا معاشرہ اور تمدن بنی مروان کی تلواروں اور جبر کے سائے میں ایک خاص ڈگر پر چلے جارہا تھا کہ عمر اچانک میدان میں اتر آئے اور ½2 سال میں پوری سوسائٹی سے ظلم و جبر کا خاتمہ کر دیا۔ خزانے میں کسی طرح بھی غیر شرعی طریقہ سے حاصل کیا گیا مال آنا بالکل بند ہو گیا۔ حضرت علی پر لعن طعن اور تبرا موقوف کر دیا گیا۔ خواہ کتنا ہی بڑا جرم ہو شرعی سزا کے علاوہ ہر سزا ختم کر دی گئی۔ عاملین زکوٰۃ کے لئے متقی اور پرہیزگار حضرات کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مایوسی و نامرادی کے گڑھے میں گرنے والی حکومت اور معاشرہ اور تمدن یکدم سنبھل گئے۔ ایک نیک نہاد، خداترس، متقی بندے کی اللہ نے مدد کی اور لوگ اتنے امیر ہو گئے کہ تلاش کے باوجود زکوٰۃ لینے والا کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ دولتِ مروان کے خلاف اٹھنے والے طوفان خود بخود تھم گئے۔

اس کے برعکس، جب دولتِ مروان کو استحکام پکڑے 60 سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا تو ولید بن یزید بن عبدالملک کا ظہور ہوا، جیسا کہ ہم بیان کرتے آرہے ہیں۔ ولید ایک ایسا کردار تھا جس نے بنی مروان کی قائم کردہ تمام صالح روایات پر پانی پھیر دیا۔ پہلی دفعہ بنی مروان کے دارالامارۃ میں شرعی احکام کے پابند خلیفہ کی بجائے ایک متمرد، سرکش، زنا کا ارتکاب کرنے والا، شراب کا رسیا، غرض سراپا جہل اور منکرات کا عادی شخص متمکن ہوا۔ خدا رسول ﷺ کے باغی شخص نے یہی کچھ کرنا تھا جو ولید نے کیا۔ لہٰذا یہ حقیقت ثابت ہو گئی کہ شخصیات ہی معاشرے کے عروج کا سبب بنتی ہیں اور شخصیات ہی اسے قعر مذلت میں اتار دیتی ہیں۔ شخصیات کا زہد و تقویٰ معاشرہ کے تمدن کے عروج کا راستہ صاف کرتا ہے اور شخصیات کے بے عنوانیاں ہی اسے زوال آشنا کرتی ہیں۔ اسی لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ کام جو قرآن نہیں کر سکتا، ایک صالح حکمران کرتا ہے۔

ولید کی والدہ مشہور اموی درندے حجاج بن یوسف کی بھتیجی تھی اور محمد بن یوسف کی بیٹی تھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ولید میں ثقفی خون کا اثر تھا کہ اس نے ایک سال کی مدت میں 6 عشروں سے زیادہ مدت کی جمی جمائی خلافت اور معاشرے کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ اس کے برعکس حضرت عمر نجیب الطرفین تھے، ایک طرف مروان کے سب سے شریف فرزند عبدالعزیز

Marfat.com

بن مروان کے نورِ چشم اور دوسری طرف عاصم بن عمر فاروق ؓ کے نواسے تھے۔ مدینہ کی روح پرور فضاؤں میں دینی تربیت حاصل کی اور اپنے کارناموں کی بدولت خلفاء راشدین میں اپنا نام لکھوایا۔ شریف النسبی بھی ایک نعمت اور رحمت ہے۔

اثرات

ولید کی کج فہمی، ناہنجاری اور متلون مزاجی کا یہ اثر ہوا کہ پورا ملکِ اسلام اس کے خلاف ہوگیا۔ خانہ جنگیوں نے دمشق کا رستہ دیکھ لیا، چودہ پندرہ ماہ میں ولید نے دولتِ مروان کا وہ حال کر دیا کہ اس کے بعد اس کا زوال یقینی صورت اختیار کرگیا۔ ولید کے بعد 3 خلیفے آئے لیکن پورے سات سال ولید کے بوئے ہوئے تھور کی فصلیں کاٹتے رہے۔

ولید نے یحییٰ بن زید کو قتل کر کے عباسی داعیان کے ہاتھ میں ایسا ہتھیار دے دیا جس کی مدد سے انہوں نے اموی خلافت کو برباد کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی۔

نتائج

خلیفہ کو قتل کرنے کی رسم کا آغاز ہوگیا اور یہ رسم ایسی چلی کہ آئندہ آنے والے عباسی خلفاء بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ دوسرے لفظوں میں خلافت کا جو ایک بھرم اور تقدس تھا وہ ختم ہوگیا۔

ولید کے بعد زوال کے پتھر کے لڑھکنے کی رفتار اتنی تیز ہوگئی کہ بعد کے تینوں خلفاء کو زوال کا بھاری پتھر روندتا اور کچلتا ہوا سب کچھ غارت کرگیا۔ نہ حکومت رہی نہ خاندان رہا، صرف تاریخ کی کتابوں میں ایک کہانی رہ گئی۔

فاعتبروا یااولوالابصار

ابو جعفر عبداللہ بن محمد المقلّب بہ منصور

ابو جعفر منصور 95 ہجری میں پیدا ہوا۔ یہ ایک بربری لونڈی سلالہ کے بطن سے تھا۔ اس کی ماں کا بیان ہے کہ جب ابو جعفر کا وجود میرے بطن میں آیا تو میں نے ایک خواب دیکھا کہ میرے اندر سے شیر نکل پڑا، جیسے دونوں ہاتھوں پر ٹیک لگا کر شیر بیٹھتا ہے وہ بیٹھ گیا اور دھڑ وکے لگانے لگا، دم بھی پٹکتا جاتا تھا۔ اتنے میں دیکھا کہ ہر طرف سے نکل نکل کر بہت سے شیر اس کے گرد جمع ہو گئے لیکن جونہی وہ میرے اندر سے نکلنے والے شیر کے قریب آئے، سجدے میں گر گئے۔ سچ پوچھئے تو منصور کی پوری زندگی کی یہی تصویر ہے۔

منصور مروجہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے سرگرداں رہتا تھا۔ ایک روز کسی منزل پر اترا تو چوکیدار نے اس سے دو درہم محصول مانگا اور کہا کہ جب تک محصول نہ دو گے اس منزل پر ٹھہر نہ سکو گے۔ منصور نے کہا میں بنو ہاشم سے ہوں، مجھے معاف کر دو۔ مگر وہ نہ مانا۔ منصور نے کہا میں قرآن مجید جانتا ہوں، مجھے معاف کر دو، اس نے پھر بھی نہ سنا۔ منصور نے کہا میں عالم، فقیہہ اور ماہر فرائض ہوں، پھر بھی نہ مانا۔ آخر منصور کو دو درہم دینے پڑے۔ اسی روز سے منصور نے ارادہ کر لیا تھا کہ اسے مال و دولت جمع کرنا چاہیے اور آخری عمر تک دولت جمع کرتا گیا۔ زندگی کے معاملات میں وہ بڑی جزرسی سے کام لیتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر میرے پاس 100 اونٹ ہوں تو میں تمام اونٹوں کی نگہداشت اس طرح کروں گا جیسے میرے پاس ایک ہی اونٹ ہو۔ اس کی یہ عادت بخالت کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اس لئے اسے المنصور دوانیق بھی کہتے ہیں، یعنی سکے جمع کرنے والا۔

منصور سے پہلے اس کا چھوٹا بھائی عبداللہ سفاح 132 ہجری سے 136 ہجری تک خلیفہ رہا اور چیچک کے مرض میں مبتلا ہو کر 29 سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ جب منصور نے حکومت سنبھالی اس وقت اس کی عمر 41 سال تھی۔ منصور وقت کے مروجہ علوم کا ماہر، فصیح و بلیغ اور بہت بڑا سیاس تھا۔ اس نے اپنے مخالفین پر ہر حربہ اختیار کر کے فتح حاصل کی۔ عملاً دولت عباسیہ کا بانی منصور ہی تھا۔

جیسا کہ ہم ابو مسلم خراسانی کے باب میں عرض کریں گے کہ منصور نے اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے بنو عباس کے

Marfat.com

سب سے بڑے داعی اور حکومت کے بانی ابومسلم کو بڑے حیلے بہانوں سے قتل کرایا۔اس کے بعد اس کی داستانِ حیات میں کہیں بھی عفو و درگزر نہیں۔دینی علوم کا ماہر ہونے کے باوجود سارے فیصلے تلوار سے کرتا تھا اور اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو کسی بھی مذہبی یا دنیاوی اخلاق یا حکم کو ذہن میں لائے بغیر بے دریغ تلوار سے کام لیتا تھا۔چنانچہ ابومسلم کے باب میں ہم منصور کے برتاؤ کو اپنے چچا عبداللہ بن علی کے معاملے کو بھی زیر بحث لائیں گے اور پوری تفصیل بیان کریں گے۔

منصور نے قریباً 22 سال حکومت کی۔ہم ترتیب زمانی کے حساب سے ان کارروائیوں کا ذکر کریں گے جن سے اس کا اقتدار تو ضرور مستحکم ہو گیا لیکن ملت اسلامیہ کا سارا جسم لہولہان بھی ہو گیا۔اموی حکومت قریباً 92 سال تلوار کے زور سے چلتی رہی۔عباسیوں کی حکومت بغیر کسی اخلاقی یا مذہبی جواز کے برسرِ اقتدار آئی تھی۔منصور کے زمانے میں ممالکِ محروسہ میں جگہ جگہ باغیوں نے سر اٹھایا۔منصور نے کئی جگہ باغیوں کو دبالیا اور کئی جگہ انہیں امان دے کر اپنے پاس بلایا۔ہر دو صورتوں میں منصور نے نام نہاد باغیوں کو قتل ہی کروایا۔

منصور کی خون آشامی اور شقیقکی پوری طرح کھل کر اس وقت سامنے آئی جب نفس ذکیہ اور نفس رضیہ کا خروج ہوا۔خروج کے اسباب کیا تھے اور منصور نے حضرت حسنؓ کی اولاد اور اپنے محسنوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اسے ہم قدرے تفصیل سے بیان کریں گے۔

حسنی سادات

سادات کی تگ و دو اور کشمکش ایک تو وہ تھی جس کا زیدی دور میں حضرت حسینؓ کے ہاتھوں آغاز ہوا اور ہاشم بن عبدالملک کے دور میں حضرت زید بن علی بن حسینؓ اور یحییٰ بن زید اس قافلہ تقدیس کے آخری افراد تھے جو حکومت کو نیابت رسول ﷺ کے تحت لانے کی جدوجہد میں شہید ہو گئے۔یعنی حسینی سادات کا قافلہ یہاں آکر رک گیا۔اس کے بعد امام جعفر صادق اور امام باقر اپنی زندگیوں کا رخ حکومت کے ساتھ موالات کی طرف متعین کر چکے تھے، حسنی سادات کی امنگیں ابھی زندہ تھیں۔جس زمانے کا ذکر ہم کر رہے ہیں، حسنی سادات میں سب سے سربرآوردہ ہستی حضرت عبداللہ بن الحسن بن علی بن طالب کی تھی۔

حضرت عبداللہ بن الحسن کے ایک صاحبزادے کا نام محمد بن عبداللہ تھا۔بچپن ہی سے بعض غیر معمولی آثار رشد و اصلاح کے ان کی شخصیت میں نمایاں نظر آتے تھے۔ان کی یہی خصوصیت ان کو لوگوں میں نفس ذکیہ کے نام سے مشہور کرنے کا باعث بنی۔چونکہ ان کا نام محمد والد کا نام عبداللہ اور والدہ کا نام غالباً آمنہ تھا، اس لئے لوگوں نے ان کو ان احادیث کا مصداق سمجھنا شروع کر دیا، جن میں امام مہدی کے ظہور اور خروج کی پیش گوئی کی گئی ہے۔جیسے عباسیوں میں مشہور تھا کہ بنی امیہ سے منتقل ہو کر حکومت ان کے ہاتھ میں آئے گی، اسی طرح یہ حُسنِ ظن سادات میں بھی پھیل چکا تھا کہ پیدا ہونے والا مہدی ان کے خاندان میں پیدا ہو چکا ہے اور بنی عباس سے حکومت کا جائزہ وہی لیں گے۔

الغرض خیالات بتدریج واقعات میں ڈھلنے لگے۔جس وقت منصور حکومت کا وارث ہوا، اس کے زمانے میں حسنی تحریک کی سیاسی تدبیریں تکمیل کے مراحل طے کر رہی تھیں۔نفس ذکیہ کے والد عبداللہ الحسن زندہ تھے اور نفس ذکیہ کے علاوہ ان

Marfat.com

کے کئی جوان بیٹے اور بھی تھے۔ یہ طے پایا کہ خروج کا مرکز تو مدینہ بنایا جائے لیکن ہر ہر صوبہ میں خاندان کے افراد بھیجے جائیں جو وہاں کے لوگوں کو عباسیوں کے خلاف ایک دم خروج کے لئے تیار کریں۔ اس طرح سات برگزیدہ اور نیک افرادِ خاندان کو مصر سے لے کر خراسان، یمن، افریقہ اور موصل تک پہنچا دیا گیا۔ قبل اس کے کہ ہم دولتِ عباسیہ کو ختم کرنے کی سب سے بڑی تحریک کی جہتوں اور معاونین کو زیرِ بحث لائیں، ہم ایک مجلس کی طرف چلتے ہیں جو خلافتِ بنوعباس کے قائم ہونے سے پہلے منعقد ہوئی تھی۔ 131 ہجری میں جب امویوں کی حکومت ختم ہو رہی تھی، اس مجلس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ عبداللہ بن حسن کے بیٹے محمد بن عبداللہ (مہدی نفس ذکیہ) کو خلیفہ تسلیم کر لیا جائے۔ اس فیصلے کے مطابق منصور عباسی نے بھی محمد بن عبداللہ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی تھی۔ جب حکومت ملنے کا وقت آیا عبداللہ سفاح خلیفہ بن گیا۔ یہ 133 ہجری کا واقعہ ہے۔ عبداللہ بن حسن مثنیٰ کئی اور علویوں کو لے کر کوفہ میں عبداللہ سفاح کے پاس پہنچے اور اعتراض کیا کہ خلافت ہمارا حق ہے، آپ کیسے مالک بن بیٹھے۔ اس موقع پر سفاح نے وہی کیا جو علویوں کو خاموش کرانے کے لئے امیر معاویہ نے کیا۔ یعنی عبداللہ حسن اور ان کے ساتھیوں کے آگے دولت کے انبار لگا دیے اور انہیں اپنی خلافت کے دوران اس دہن دوزی سے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

136 ہجری میں منصور تخت نشین ہوا تو اس نے یہ پالیسی بدل دی۔ اپنی عادتِ بخالت کی وجہ سے حسنی سادات کو کوئی فائدہ پہنچانے سے انکاری ہو گیا اور ساتھ ہی ان کے پیچھے لگ گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ علوی ہی اس کی حکومت کو ختم کر سکتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف عباسیوں کا دعویٰ تھا کہ ان کی حکومت قیامت تک قائم رہنے کے لئے آئی ہے۔ حالانکہ علوی نفس ذکیہ کی قیادت میں منصور کی قہرمانی حکومت کو برباد کرنے کی منصوبہ بندی کر چکے تھے اور منصور کو بھی ممالکِ محروسہ میں پھیلے ہوئے جاسوسوں نے پل پل کی پیش رفت سے آگاہ رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ مدینہ کے گورنر کو حکم دیا گیا کہ نفس ذکیہ اور اس کے بھائی ابراہیم (نفس رضیہ) کو تلاش کر کے منصور کے پاس پہنچا دے۔ منصور نے نفس ذکیہ کو تلاش کرنے میں اس حد تک مبالغہ کیا کہ حجاز کے ہر ہر شخص کو معلوم ہو گیا کہ منصور کو محمد مہدی نفس ذکیہ کی بڑی تلاش ہے۔ عبداللہ حسن کو جب منصور کی طرف سے مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے بیٹے کو پیش کریں تو عبداللہ حسن نے منصور کے چچا سلیمان بن علی سے مشورہ کیا۔ سلیمان نے جواب دیا کہ اگر منصور درگزر کرنے کا عادی ہوتا تو اپنے چچا عبداللہ بن علی پر ظلم اور تشدد نہ کرتا۔ اسی مشورہ کے بعد عبدالرحمٰن نفس ذکیہ کو روپوش رکھنے میں اور بھی مبالغہ کرنے لگے۔

منصور نے حجاز میں نفس ذکیہ اور اس کے بھائی ابراہیم کو تلاش کرنے میں مدینہ کے گورنر پر گورنر تبدیل کئے لیکن دونوں بھائیوں کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ بالآخر مدینہ کے آخری گورنر رباح بن عثمان نے عبداللہ حسن کو بیٹوں کو پیش کرنے کے لئے بہت تنگ کیا، سارے مدینہ میں کھلبلی مچ گئی۔ بالآخر رباح نے حسنی سادات کے گیارہ سرکردہ افراد کو گرفتار کر کے مدینہ کی جیل میں ڈال دیا اور منصور کو اطلاع دے دی۔ اس پر منصور نے رباح کو لکھا کہ محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عثمان کو بھی گرفتار کر لو، کیونکہ اس کی اور عبداللہ حسن کی ماں ایک ہی ہے۔ یعنی یہ دونوں فاطمہ بنت حسین کے بیٹے ہیں، چنانچہ اس نے حکم کی تعمیل کر دی۔

Marfat.com

رباح گورنر مدینہ کے قید کردہ تمام علوی 142 ہجری تک مدینہ کی جیل میں رہے، اسی سال منصور حج کو آیا اور جاتے ہوئے رباح کو حکم دے گیا کہ ان تمام قیدیوں کو میرے پاس عراق بھیج دو۔ رباح نے تمام قیدیوں کو زنجیریں اور بیڑیاں پہنائیں اور بغیر کجاوے کے اونٹوں پر بٹھا کر عراق روانہ کر دیا۔ دورانِ سفر مہدی اور ابراہیم دونوں بھائی بدوؤں کے لباس میں اونٹ پر سوار اپنے والد عبداللہ حسن سے ملے اور خروج کی اجازت چاہی جس پر والد نے انہیں انتظار کا حکم دیا۔ جونہی یہ قافلہ عراق پہنچا تو منصور نے محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عثمان کو سامنے بلایا، گالیاں دیں اور سو کوڑے بھی لگوائے۔ منصور محمد بن عبداللہ کا اس لئے دشمن تھا کہ شام میں اس کے ہمدرد تھے اور اس وجہ سے شام میں ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ ان قیدیوں کے عراق منتقل ہو جانے کے بعد محمد مہدی تو حجاز میں رہے لیکن اپنے بھائی ابراہیم کو عراق و خراسان کی طرف روانہ کر دیا تاکہ اس علاقے میں لوگوں کو عباسیوں کے خلاف تیار کیا جا سکے۔ دوسری طرف منصور نے مہدی کے نام جعلی خطوط کا سلسلہ جاری کر دیا تاکہ کسی خط کا جواب آ جائے اور نفس ذکیہ تک پہنچنا آسان ہو جائے۔ ان خطوط کی بھرمار سے منصور کو کچھ نہ ملا لیکن نفس ذکیہ کو اپنے اعوان انصار کی تعداد میں مبالغہ کی حد تک غلط فہمی ہو گئی لیکن طرفہ تماشا یہ کہ منصور اپنے نوتعمیر کردہ شہر بغداد کے معائنے کے لئے آیا تو دونوں بھائی اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے لیکن کوئی جاسوس انہیں گرفتار نہ کروا سکا۔

گورنر خراسان نے 142 ہجری میں ایک تحریر منصور کے پاس بھیجی جس میں بتایا گیا کہ خراسان میں سازش بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے اور تمام اہل خراسان محمد مہدی کے خروج کا انتظار کر رہے ہیں۔ منصور نے اس تحریر کو پڑھتے ہی محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عثمان کو قید خانہ سے نکال کر جلاد کے حوالے کیا اور ان کا سر اتروا کر خراسان بھیج دیا۔ ان کے سر کے ساتھ چند آدمی ایسے بھیج دیے جنہوں نے جا کر قسم کھائی اور شہادت دی کہ یہ سر محمد بن عبداللہ نفس ذکیہ کا ہے اور ان کی دادی کا نام فاطمہ بنت رسول ﷺ ہے۔ اس طرح اہل خراسان کو دھوکا دیا گیا کہ محمد مہدی قتل ہو گئے ہیں اور یہ ان کا سر ہے۔ پھر منصور نے محمد بن ابراہیم بن حسن کو زندہ ایک ستون میں چنوا دیا۔ اس کے بعد عبداللہ بن حسن اور ان کے بھائی علی بن حسن کو قتل کر دیا گیا۔

دولتِ عباسیہ سے پہلے دولتِ مروان اور علویوں کی کشمکش پر نظر کریں تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ علویوں اور بنوامیہ کے درمیان باہمی رشتہ داریاں نہ ہونے کے باوجود امویوں نے ہر اس علوی کو ختم کر دیا جو جنگ کے لئے تیار ہوا حالانکہ علوی اور عباسی تو بڑے عرصے سے شیر و شکر چلے آ رہے تھے۔ اکٹھے مل کر امویوں کے خلاف تحریک چلائی اور انہیں ختم کر دیا لیکن منصور نے بلاوجہ اپنی کینہ پروری اور قساوتِ قلبی سے حسنی سادات کے تمام افراد تہہ تیغ کر دیے اس کا یہ جرم یزید کے ہاتھوں قتل حسینؓ سے بھی بڑا ہے کہ نہ تو وہ شمشیر بکف سامنے آئے اور نہ ہی کوئی اور جرم ان سے سرزد ہوا جو ان کے قتل پر منتج ہوتا۔

نفس ذکیہ کا خروج

آلِ حسن کی عراق منتقلی کے بعد ان میں سے سرکردہ افراد کو قتل کر دیا گیا اور کئی کو سخت تعذیب سے گزارا گیا۔ اس دوران نفس ذکیہ کے ساتھیوں نے اصرار کیا کہ سب مصیبتیں آپ کی وجہ سے ہیں۔ اب معاملے کو تعویق میں نہ ڈالیں اور منصور کے خلاف خروج کریں۔ چنانچہ رجب 145 ہجری میں وہ ایک بڑی جماعت کے ساتھ نکلے۔ مقامی جماعتوں کے

Marfat.com

علاوہ مختلف ملکوں کے وفود بھی ان میں شامل تھے۔ جس ملک کے لوگ نہ آسکے ان کے خطوط پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ نفس ذکیہ نے مدینہ پر قبضہ کر کے رباح کو گرفتار کرلیا، قید خانے سے کئی ساتھیوں کو رہا کیا۔ اسلحہ خانہ اور خزانے کو قبضے میں لیا اور اس کے بعد مکہ کا رُخ کیا۔ مکہ کے باشندے بھی نفس ذکیہ کے ساتھ مل گئے۔

منصور کو اس خروج کی اطلاع ملی تو اپنی تمام تر مستقل مزاجی کے باوجود گھبرا گیا اور نفس ذکیہ کو ایک خط بھیجا جس کے مضمون میں نفس ذکیہ کے لئے امان اور بہت سے مراعات کا اعلان بعض ضمانتوں کے ساتھ تحریر تھا۔ اس کے جواب میں نفس ذکیہ نے ایسی ہی امان منصور کے لئے دینے کا وعدہ کیا اور ساتھ ہی اپنی نسبی برتری کا معاملہ بھی اٹھایا۔ افسوس ناک پہلو اس خط وکتابت کا یہ تھا کہ صرف ڈیڑھ سو سال بھی نہ گزرے تھے کہ وہ اسلام جس نے نسلی برتریوں کا قلع قمع کر دیا تھا، وہی نسلی تعصب اور برتری وقت کے دو اہم سرداروں کے دامن کو گرفت میں لئے جا رہی تھی۔ یہ خط وکتابت بڑی طویل ہے، ہم اس پر تبصرہ کر کے اس خط وکتابت کے قصے کو ختم کرتے ہیں۔ تفاخرِ نسبی کے معاملے میں بے شک پہل نفس ذکیہ کی طرف سے ہوئی، منصور نے جو کچھ لکھا جواباً لکھا تھا۔ مگر منصور نے اپنے جواب میں حد سے تجاوز کیا۔ محمد مہدی نے حضرت عباسؓ کی نسبت کچھ نہیں لکھا تھا۔ منصور نے بلاوجہ حضرت علیؓ کی شان میں گستاخانہ الفاظ تحریر کئے۔ منصور نے یہ بھی سخت بہتان باندھا کہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کو خلافت حاصل کرنے کے لئے دن کے وقت باہر نکالا۔ حضرت حسنؓ کی شان میں بھی منصور نے بڑی بدتمیزی اور گستاخی کی تھی۔ انہوں نے خلافت کو فروخت نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے دو گروہوں میں لڑائی کو ختم کرواتے ہوئے اتفاق اور صلح قائم کر کے آنحضرت ﷺ کی پیش گوئی کو پورا کر دکھایا۔ حضرت عباس نے ضرور ابی طالب کی امداد کی تھی اور عقیل کو اپنے پاس رکھ کر پرورش کی لیکن ایسی باتوں کا اعلان واظہار زبان پر لانا اور طعنہ دینا شرفاء کا کام نہیں بلکہ اس قسم کے معاملات کو زبان پر لانا کمینے پن کی علامت ہے۔ منصور نے ان باتوں کو زبان پر لا کر اپنی کمینگی کا برملا اظہار کر دیا۔

محمد مہدی نفس ذکیہ کے خروج کا اعلان ہو چکا۔ فی الحال اس قصے کو یہیں چھوڑتے ہیں اور منصور کے دربار میں چلتے ہیں، جہاں خروج سے تھوڑا عرصہ پہلے منصور کی حکومت کے جواز کو منصور کے کہنے پر زیرِ بحث لایا جا رہا ہے۔ امام ابوحنیفہ شروع ہی سے محمد مہدی اور ابراہیم کے ساتھ رابطے میں تھے۔ اب جب حکومت کے جواز اور عدم جواز کا معاملہ زیرِ بحث آیا تو امام نے کھل کر اپنا موقف بیان کر دیا، حالانکہ اس وقت یہ موقف بیان کرنا اپنے سر کو تلوار سے اڑانے کی دعوت دینا تھا۔ بہرکیف منصور نے تین نابغہ روزگار ہستیاں اپنے دربار میں بلا کر ان کے سامنے یہ سوال رکھا کہ "یہ حکومت جو اللہ تعالیٰ نے اس امت میں مجھ کو دی ہے اس کے متعلق آپ لوگوں کا کیا خیال ہے، کیا میں اس کا اہل ہوں؟" امام مالکؒ نے کہا کہ آپ اس کے اہل نہ ہوتے تو اللہ اسے آپ کے سپرد نہ کرتا۔ ابن ابی ذئب نے کہا دنیا کی بادشاہی اللہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے مگر آخرت کی بادشاہی اس کو عطا کرتا ہے جو اس کا طالب ہو اور جسے اللہ اس کی توفیق دے، اللہ کی توفیق آپ سے قریب ہوگی اگر اس کی اطاعت کریں، ورنہ اس کی نافرمانی کی صورت میں وہ آپ سے دور رہے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت اہل تقویٰ کے اجتماع سے قائم ہوتی ہے اور جو شخص خود اس پر قبضہ کرے اس کے لئے کوئی تقویٰ نہیں ہے آپ اور آپ کے مددگار

Marfat.com

توفیق سے خارج اور حق سے منحرف ہیں۔اب اگر آپ اللہ سے سلامتی مانگیں اور پاکیزہ اعمال سے اس کا قرب حاصل کریں تو ہر چیز آپ کو نصیب ہوگی،ورنہ آپ خود ہی اپنے مطلوب ہیں۔

امام ابوحنیفہ کہتے ہیں جس وقت ابی ذئب یہ باتیں کہہ رہے تھے میں نے اور مالکؒ نے اپنے کپڑے سمیٹ لئے کہ شاید ابھی ان کی گردن اڑادی جائے گی اور ان کا خون ہمارے کپڑوں پر پڑے گا۔اس کے بعد منصور امام ابوحنیفہ کی طرف متوجہ ہوا اور بولا آپ کیا کہتے ہیں؟انہوں نے جواب دیا اپنے دین کی خاطر راہ راست تلاش کرنے والا غصے سے دور رہتا ہے،اگر آپ اپنے ضمیر کو ٹٹولیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ آپ نے ہمیں اللہ کی خاطر نہیں بلایا ہے بلکہ آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے ڈر سے آپ کی منشاء کے مطابق بات کہیں اور وہ عوام کے علم میں آجائے۔امر واقعہ یہ ہے کہ آپ اسی طرح خلیفہ بنے ہیں کہ آپ کی خلافت پر اہلِ فتویٰ لوگوں میں سے دو آدمیوں کا بھی اجتماع نہ ہوا،حالانکہ حکومت مسلمانوں کے اجتماع سے اور مشورے سے قائم ہوتی ہے۔دیکھئے ابوبکر صدیقؓ چھ مہینہ تک فیصلے کرنے سے رکے رہے جب تک کہ اہلِ یمن سے بیعت نہ آگئی۔

یہ باتیں کر کے تینوں صاحب اٹھ گئے۔منصور نے اپنے حاجب ربیع کو تین توڑے درہموں کے دے کر ان تینوں کے پاس بھیجا اور اس کی ہدایت کی کہ اگر مالکؒ لے لیں تو ان کو دے دینا،اگر ابوحنیفہ اور ابن ابی ذئب انہیں قبول کرلیں تو ان کا سر اتار لانا۔امام مالک نے یہ عطیہ لے لیا،ابن ابی ذئب کے پاس ربیع پہنچا تو انہوں نے کہا کہ میں اس مال کو خود منصور کے لئے بھی حلال نہیں سمجھتا،اپنے لئے کیسے حلال سمجھوں۔امام ابوحنیفہ نے کہا خواہ میری گردن ہی کیوں نہ ماردی جائے، میں اس کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔منصور نے یہ روداد سن کر کہا کہ اس بے نیازی نے دونوں کا خون بچادیا۔

ابومسلم خراسانی اور قحطبہ بن شبیب دو ایسے کردار ہیں جن میں سے پہلے کی ہوشیاری وعیاری نے اور دوسرے کے زورِ بازو نے دولتِ عباسیہ کو کھڑا کیا اور مضبوط بنایا۔منصور کے وقت حکومت کی افواجِ قاہرہ کا سپہ سالار قحطبہ کا بیٹا حسن تھا جہاں ایک طرف امام اعظم اپنے شاندار اور دلیرانہ طرزِ عمل سے حکومت کے خلاف تحریک کو ذہنی اور علمی خوراک مہیا کر رہے تھے،وہیں انہوں نے حسن بن قحطبہ پر توجہ مرکوز کی وہ شخص جو منصور کے لئے کشتوں کے پشتے لگاتا آرہا تھا،ایک اللہ والے امام اعظم کے زیرِ تربیت آیا تو اس نے منصور کے لئے کام کرنے سے توبہ کرلی اور امام کے ہاتھ پر توبہ کرتے ہوئے یہ عہد کیا کہ میں خود قتل ہونے کے لئے تیار ہو جاؤں گا لیکن پوری زندگی کسی کو ناحق قتل نہیں کروں گا۔پھر بار بار امام سے اپیل کرتا کہ میری بخشش کا کیا راستہ ہے،امام فرماتے اپنی توبہ پر قائم رہ،اللہ تمہاری مدد کرے گا۔

منصور نے حسنی سادات کے خلاف جو محاذ کھول رکھا تھا،اس کے جواب میں امام کی طرف سے حملہ اتنا بھرپور تھا کہ منصور سٹپٹا کر رہ گیا اپنی تمام تر خونخواری کے باوجود حسن پر ہاتھ نہ ڈال سکا۔کیونکہ ایسا کرنے سے بہت سے فوجی سرداروں کی بغاوت کا خطرہ تھا۔چنانچہ چاروناچار حسن کے چھوٹے بھائی حمید بن قحطبہ کو سپہ سالار بنادیا۔یہ سب کچھ امام نے اس لئے کیا کہ ان کے نزدیک بیرونی ممالک میں جہاد پر جانے سے بہتر ہے کہ اپنے ملک کے جو حکمران راہ راست سے علیحدہ ہو گئے ہوں۔ان کے خلاف ہر طرح کا جہاد کیا جائے۔چنانچہ خروج کے دوران امام علی الاعلان لوگوں کو منصور کے خلاف آمادہ پیکار

Marfat.com

ہونے کے لئے تیار کرتے رہے۔ عرصہ سے ان کی خواہش تھی کہ مخلص افراد کی مناسب تعداد اور کوئی ایسا لیڈر جس کے دین و مذہب پر اعتماد کیا جا سکے، اگر سامنے آئے تو اس کے خروج میں ضرور تعاون کریں گے۔

عباسیوں نے یہ بدعت ایجاد کر رکھی تھی کہ کوئی شخص اگر خلیفہ کی بیعت فسخ کر دے تو اس کی بیوی کو خود بخود طلاق ہو جاتی ہے۔ یہ تصور اتنا عام ہو چکا تھا کہ اہل مدینہ منصور کے خلاف محمد مہدی نفس ذکیہ کے ساتھ خروج کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ امام مالکؒ، امام دارالہجرت، امام مدینہ نے فتویٰ دیا کہ یہ زبردستی کی طلاق ہے اور زبردستی کی طلاق مؤثر نہیں ہوتی۔ لہٰذا فسخ بیعت کے بعد بھی ان کی بیویاں انہی کی رہیں گی۔

امام ابوحنیفہ کا منصور کے لئے خلافت کا عدم جواز، حسن بن قحطبہ کی فوج سے علیحدگی امام اعظم کی طرف سے خروج کے حق میں اعلانات و فتاویٰ اور سونے پر سہاگہ امام مالک کا فتویٰ، یہ سب عناصر و عوامل ایسے تھے جو مل کر خروج کے مقصد کو بے پناہ تقویت پہنچا رہے تھے۔

خروج کا معرکہ کارزار گرم ہوتا ہے

خط و کتابت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور منصور نے اپنے بھتیجے عیسیٰ بن موسیٰ اور حمید بن قحطبہ کو محمد مہدی نفس ذکیہ کو زیر کرنے کے لئے مدینہ روانہ کیا اور خود کوفہ میں مقیم ہو گیا۔ محمد مہدی نے مدینہ منورہ میں نبی اکرم ﷺ کی بنائی ہوئی خندق کو دوبارہ کھدوایا اور صاف کیا اور مدینہ میں رہ کر ہی منصور کی فوج کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اعلان کر دیا کہ مدینہ سے کوئی شخص باہر نہ جائے لیکن منصور کی افواج کے قریب پہنچنے پر مدینہ سے لوگوں کو نکلنے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ لوگ حملہ آور فوجوں سے لڑنے کی بجائے پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ نفس ذکیہ کے محاذ میں یہ پہلی کمزوری کا اظہار تھا۔ بنی امیہ نے جس طرح رعایا کی گردنیں اڑائی تھیں اور بالخصوص آلِ حسین سے جو سلوک روا رکھا تھا بحیثیت مجموعی علوی اس سے بہت سہمے ہوئے تھے۔ اب بھی انہیں خدشہ تھا کہ اگر عباسی غالب آ گئے تو ہمارے ساتھ وہی ظلم و ستم کی داستان دہرائی جائے گی۔ اس لئے وہ اس معرکے میں غیر جانبدار ہو گئے۔ بلکہ کچھ ایسے بھی تھے جو منصور کے طرف دار بن چکے تھے۔ عیسیٰ بن موسیٰ اور حمید بن قحطبہ کی فوجوں نے خندق عبور کر کے مدینہ پر عام حملہ کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نفس ذکیہ کے ساتھ بہت تھوڑے سے آدمی رہ گئے۔ یہ تھوڑے سے جانثار آخری دم تک لڑتے رہے۔ اپنے محاذ کی کمزوری دیکھ کر آپ کے ایک ساتھی عیسیٰ بن نصیر نے سب سے پہلے وہ رجسٹر نذر آتش کر دیا جس میں حمایت کرنے والے اور بیعت کرنے والے افراد کے نام تھے۔ اس کے بعد اس نے قید خانہ میں جا کر سابقہ گورنر رباح اور اس کے ساتھیوں کو قتل کیا اور خود بڑی جانسپاری سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ نفس ذکیہ بھی بڑے زور سے داد شجاعت دے رہے تھے کہ کسی نے دور سے نیزہ پھینکا اور وہ محمد مہدی کی کمر میں لگا اور آپ آگے کو جھک گئے۔ اس کے بعد حمید بن قحطبہ نے آگے سے نیزہ مارا اور آپ شہید ہو گئے۔ حمید نے فوراً آپ کا سر کاٹ کو عیسیٰ بن موسیٰ کو پیش کیا اور اس نے منصور کے پاس بھیج دیا۔ جس نے سر کی خوب تشہیر کرائی۔ یہ واقعہ 143 ہجری کے رمضان میں پیش آیا۔

Marfat.com

محمد مہدی نفس ذکیہ کے بھائی ابراہیم نفس رضیہ کا خروج اور شہادت

غالباً 142 ہجری کا اخیر تھا۔ منصور بغداد کی تعمیر کے سلسلے میں معائنہ پر آیا محمد مہدی اور ان کے بھائی ابراہیم کو داد دینی پڑتی ہے کہ وہ دونوں بھائی اس کے ساتھ موجود تھے اور وہ انہیں گرفتار نہ کروا سکا۔ وہ دونوں بچ کر اس کے عارضی دارالخلافہ کوفہ پہنچ گئے۔ محمد مہدی کوفہ سے مدینہ منتقل ہو گئے اور ابراہیم منصور کی تمام جاسوسیوں کے باوجود بصرہ پہنچ گئے۔ اس دوران محمد مہدی نے خروج کا حکم دے دیا۔ یہ رمضان 143 ہجری سے پہلے کا واقعہ ہے لیکن بصرہ پہنچ کر ابراہیم بیمار پڑ گئے اور محمد مہدی نفس ذکیہ کے حکم کے مطابق فوراً خروج نہ کر سکے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو منصور کی افواج قاہرہ دو محاذوں پر بٹ کر بے اثر ہو جاتیں اور شاید منصور بھی مٹ چکا ہوتا۔

بہرکیف ابراہیم نے یکم رمضان 143 ہجری کو خروج کیا اور پورا مہینہ ممالکِ محروسہ پر یلغار کرتے ہوئے فتح پر فتح حاصل کئے جا رہے تھے۔ جب محمد مہدی اخیر رمضان 143 ہجری کو شہید ہو گئے اس وقت تک بصرہ، فارس، واسط اور عراق کا بڑا حصہ منصور کے قبضہ سے نکل چکے تھے۔ شام کا ملک بھی قبضے سے نکلنے والا تھا۔ کوفہ والے ابراہیم کے منتظر بیٹھے تھے اور منصور کی حکومت کے باقی رہنے کی بظاہر کوئی صورت نہ رہ گئی تھی۔

رمضان کے آخر میں ابراہیم کو خبر پہنچی کہ محمد مہدی شہید کر دیے گئے ہیں۔ ابراہیم نے یکم شوال کو عید کی نماز پڑھائی۔ خطبہ دیا اور بھائی کی شہادت کا اعلان کیا۔ بہت سارے وہ لوگ جو منصور کی افواج کے ساتھ مختلف محاذوں پر لڑ رہے تھے۔ یہ خبر سن کر حوصلے چھوڑ بیٹھے۔ اس کے برعکس منصور کے آدمیوں میں ولولے کی نئی لہر دوڑ گئی۔ اس خبر کے بعد بصرہ والوں نے محمد مہدی کی جگہ ابراہیم کو خلیفہ تسلیم کر لیا اور فیصلہ کیا کہ بصرہ کو دارالخلافہ بنا کر وہاں سے تمام ممالکِ محروسہ میں فوجیں بھیجی جائیں لیکن کوفہ والوں کا اصرار تھا کہ منصور کی موجودہ جائے اقتدار پر حملہ کیا جائے اور اسے نیست و نابود کر دیا جائے۔ ابراہیم کے پاس اس وقت ایک لاکھ سے زیادہ فوج تھی۔ منصور نے مدینہ سے عیسیٰ بن موسیٰ اور حمید بن قحطبہ کو محمد مہدی کی شہادت کے فوراً بعد کوفہ بلا لیا۔ علاوہ ازیں دوسرے اطراف سے فوجوں کو بلا کر ایک لاکھ سے زیادہ فوج کوفہ میں جمع کر لی۔ ابراہیم کے ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ اپنی لشکرگاہ کے گرد خندق کھود لیں۔ زیادہ ساتھیوں نے کہا ہم غالب ہیں، مغلوب نہیں۔ خندق کی کوئی ضرورت نہیں۔ مشورہ دیا گیا کہ فوج کے دستوں کو بانٹ کر لڑایا جائے، اگر ایک دستہ شکست کھا جائے تو دوسرا تازہ دم دستہ میدان میں اتارا جائے لیکن یہ تجویز بھی رد کر دی گئی۔

جنگ شروع ہوئی تو حمید بن قحطبہ شکست کھا کر بھاگ نکلا۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے اسے آواز دی کہ اطاعت امیر کا تقاضا کیا ہے؟ اس نے جواب دیا مصیبت میں اطاعت امیر کیونکر ہو سکتی ہے؟ عیسیٰ بن موسیٰ کی فوج بھی شکست سے دوچار ہو رہی تھی کہ منصور کا بھیجا ہوا فوجی دستہ میدان میں آ گیا اور اس نے ابراہیم کی فوج پر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ یہ حالت دیکھ کر حمید اور عیسیٰ بھی سنبھل گئے اور انہوں نے ابراہیم کی فوج کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس پر ابراہیم کے ساتھی بے ترتیبی سے نکل کر بھاگنے لگے اور ابراہیم کے ساتھ صرف چار سو آدمی رہ گئے۔ گرمی کا موسم تھا، ابراہیم نے لڑتے ہوئے اپنی عبا کی گھنڈیاں کھول دیں۔ منصور کے آدمیوں میں سے کسی نے تیر چلایا، وہ سیدھا ابراہیم کی گردن میں لگا، ابراہیم گھوڑے سے گر گئے۔ حمید اور

اس کے ساتھیوں نے ابراہیم پر ہجوم کیا اور فوراً ان کا سر کاٹ کر منصور کے پاس بھیج دیا اور یوں یہ دونوں خروج انجام کو پہنچے۔ جب ابراہیم اپنی جان جانِ آفریں کے حوالے کر رہے تھے تو مسلسل یہ کہے جا رہے تھے کہ ہم نے کچھ چاہا مگر خدا نے کچھ اور چاہا (جو اللہ نے چاہا وہی ہوا۔)

ابراہیم کے خروج کے دوران کوفہ کے عوام اور منصور کی حالت

منصور اپنی تمام تر ہوشیاری، بیدار مغزی اور نام نہاد مستقل مزاجی کے باوجود ہر روز کئی بار مرتا اور کئی بار جیتا۔ اس نے اپنی اس کیفیت پر اپنے اقتدار کے زور پر بلا وجہ کوفہ کے عوام کو بھی اس کرب میں گرفتار کر رکھا تھا۔ اس کا اعلان تھا کہ جو شخص کالا لباس نہ پہنے وہ ہمارا دشمن ہے اور ابراہیم کا ساتھی ہے، اسے قتل کر دیا جائے۔ مجبوراً لوگوں نے کالا لباس پہننا شروع کر دیا۔ اگر رنگریزوں کے پاس رش ہوتا تو لوگ دواتوں سے کالی روشنائی سے کپڑوں کو رنگ لیتے تاکہ اس ناحق قتلِ عام سے بچ سکیں۔

کوفہ میں عشاء کے بعد کرفیو کا سماں ہوتا تھا۔ پانچ سو افراد کا دستہ کوفہ کی گلیوں اور بازاروں میں گشت کرتا رہتا۔ کوئی آدمی گھر سے باہر نظر آتا تو اسے اٹھا لیا جاتا۔ رات قیدیوں میں رکھا جاتا، صبح اسے چھوڑ دیا جاتا یا جیل بھیج دیا جاتا۔ بصرہ کی طرف جانے والے ہر شخص کو بغیر پوچھے قتل کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ ابراہیم نفس رضیہ کے ساتھ نہ مل جائے۔ یعنی بصرہ جانے والے ہر شخص کو ابراہیم کا ساتھی گردانا جاتا تھا۔ منصور کے جاسوس اگر کسی کی وفا کے متعلق شک کی خبر دیتے تو اسے گھر سے اٹھا لیا جاتا اور اس کی خبر لی جاتی۔ خبر لینے کا مطلب یہ تھا کہ اسے ٹاٹ میں لپیٹ کر قتل کر دیا جائے۔ قحطبہ کا ایک غلام تھا جس کا نام سلم تھا۔ اس کے پاس ایک سیڑھی تھی۔ کسی بھی مشکوک شخص کے گھر رات کو سیڑھی لگا کر اتر جاتا۔ اسے باہر لا کر قتل کر دیتا اور ثبوت کے طور پر اس کی انگوٹھی اتار لاتا۔ سلم کے بیٹے کو لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر تیرا باپ اور کچھ بھی چھوڑ تا صرف مقتولین کی انگوٹھیاں ہی چھوڑ جاتا تو تمہارے لئے وہی کافی تھیں۔

منصور کی حالت دورانِ خروج

منصور اپنے بھتیجے عیسیٰ بن موسیٰ کو دونوں بھائیوں کے خروج کو ختم کرنے کے لئے بھیجنے کے بعد کوفہ میں دارالامارۃ میں مقید ہو کر رہ گیا تھا۔ جب نفس ذکیہ کا خروج ہوا اسی دن سے وہ مصلے پر بیٹھ گیا اور جب تک دونوں بھائیوں کا آغاز کردہ سیل تندرو ختم نہیں ہو گیا اس نے اپنا لباس بھی تبدیل نہیں کیا۔ دو امیر آدمیوں نے منصور کی خدمت میں اپنی بیٹیاں ہبہ کر کے پیش کیں، منصور نے ان دونوں کو دیکھا تک نہیں۔ کسی کے سوال پر کہا کہ یہ کام فارغ اوقات کے ہیں۔ منصور نے کوفہ کے مختلف دروازوں پر تیز رفتار سواریاں، سانڈھنیاں اور گھوڑے باندھ رکھے تھے کہ اگر کوفہ والے بیان کردہ ایک لاکھ تلواروں کے ساتھ یکبارگی حملہ آور ہو جائیں تو جس طرف بھی رستہ نکل جائے بھاگ جاؤں۔ عملاً منصور رے کی طرف بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا کہ مشہور نجومی نوبخت کہیں سے آنکلا۔ اس نے منصور کو یقین دلایا کہ بھاگو نہیں، فتح تمہاری ہوگی اور جب تک فتح کی خبر نہیں آتی مجھے گرفتار کر لو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور نوبخت کو اس وقت چھوڑا گیا جب ابراہیم کا سر منصور کے پاس پہنچا دیا گیا۔

اس سے پہلے منصور ہر ملنے والے کو ایک ہی بات کہتا تھا کہ وقت آنے کو ہے جب میرا سر ابراہیم کے قدموں میں ہوگا یا ابراہیم کا سر میرے قدموں میں۔ فتح کے بعد منصور نے نجومی کو بہت بڑی جاگیر سے نوازا۔

اللہ کی حکمت اور مشیت کو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ اگر منصور کی ظالمانہ، جابرانہ اور اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات کے خلاف تاریخ کی سب سے بڑی حکومت ختم ہو جاتی تو منصور کو عالم برزخ سے پہلے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہ ملتی۔ منصور بہت بڑی دنیوی مصیبت سے بچ گیا۔ اس کے خاندان کی حکومت کا تسلسل بھی برقرار رہا لیکن اس ظالم اور کینہ پرور شخص نے سادات کے ساتھ درگزر کا رویہ رکھنے کی بجائے انہیں تلاش کر کر کے قتل کیا اور امام مالک جیسی بے غرض ہستی کو بھی اپنے انتقام کا نشانہ بنانے سے باز نہ آیا۔ جعفر بن سلیمان عباسی مدینہ کا گورنر بن کر آیا۔ اس نے امام مالک کو طلب کیا اور کہا کہ آپ کے فتوے کی وجہ سے ہماری حکومت کے ہمدردوں اور ساتھیوں میں بددلی پھیلی اور ہمارے بہت سے لوگ نفس ذکیہ کی بیعت میں چلے گئے۔ آپ نے ہماری حکومت کے خلاف بغاوت کا ارتکاب کیا ہے۔ سلیمان نے امام مالک کو کوڑے لگوائے جن کی تعداد کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ روایات میں کم از کم تیس اور زیادہ سے زیادہ سو کوڑے کی تعداد درج ہے۔ کوڑے کھاتے کھاتے امام مالک بیہوش ہو جاتے اور ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے یہ فقرہ دہراتے کہ اے اللہ میں نے کوڑے مارنے والے کو اللہ کے رسول ﷺ کی ہمسائیگی کے صدقے میں معاف کر دیا، انہیں تو بھی معاف کر دے یہ جانتے نہیں۔ کوڑوں سے پیٹنے کے علاوہ اس ظالم نے آپ کے دونوں ہاتھ شانوں سے اکھڑوا دیے جس کے نتیجے میں حضرت والا باقی ساری عمر نہ ہاتھ پوری طرح اٹھا سکتے تھے اور نہ بدن پر چادر اپنے دست مبارک سے درست کر سکتے تھے۔

ابراہیم کے حامیوں سے منصور کا انتقام

بصرہ کے سربرآوردہ افراد جنہوں نے کسی طرح بھی ابراہیم کی حمایت کی تھی یا مہم میں حصہ لیا تھا۔ بصرہ کے گورنر مسلم بن قیتبہ کو منصور نے حکم دیا کہ ان سب کے مکانات ڈھا دیے جائیں اور ان کے نخلستان کاٹ دیے جائیں۔ مسلم نے منصور کو لکھ بھیجا کہ پہل کس کام سے کروں۔ منصور نے محض اس "بے ادبی" پر مسلم کو معزول کر دیا اور لکھا کہ کل یہ بھی پوچھو گے کہ عام کھجوروں کو پہلے کاٹوں یا عجوہ کو۔ غرض بصرہ کو تباہ کر دیا گیا۔

محمد مہدی نے اپنے ایک بیٹے کو گھوڑے بیچنے والے کے لباس میں داعی کے طور پر سندھ بھیج رکھا تھا محمد مہدی کے اس بیٹے کا نام عبداللہ الاشتر تھا۔ الاشتر عربی میں اس شخص کو کہتے ہیں جس کی آنکھ کا کچھ حصہ لٹکا ہوا ہو اور رنج ہو۔ عبداللہ الاشتر گورنر سندھ کے پاس آرام سے رہ رہے تھے کہ منصور کو اس کی خبر ہو گئی۔ منصور نے عبداللہ کی حوالگی کا تقاضا کیا تو نیک دل گورنر نے عبداللہ سے کہا کہ میرے لئے آپ کو اپنے پاس رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ آپ کو ایک ہندو راجہ کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ وہ ہے تو ہندو لیکن سرکار دو عالم ﷺ اور آپ ﷺ کے خاندان کی بڑی عزت کرتا ہے۔ چنانچہ عبداللہ الاشتر اس راجہ کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے انہیں واقعی خاندان نبوت کا فرد ہونے کے ناطے بڑی عزت و تکریم سے نوازا۔ منصور کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے حکم دیا کہ اس راجہ کے ملک کو پامال کر دیا جائے۔ ابھی یہ نوبت نہیں آئی تھی کہ عبداللہ دریائے سندھ کے کنارے شکار کھیلنے کی نیت سے چند ہمراہیوں کے ساتھ موجود تھے اور منصور کے لشکر کے آدمیوں سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی اور عبداللہ

Marfat.com

الاشتر شہید ہو گئے۔ ان کا ایک بچہ تھا جسے سندھ سے بغداد لایا گیا اور بعد میں مدینہ بھیج دیا گیا۔ اسی بچہ سے عبداللہ الاشتر کی نسل چلی۔

ابراہیم کے علاوہ نفس ذکیہ کے دوسرے بھائی اور بیٹے مختلف ممالکِ محروسہ میں اپنے مشن کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف تھے۔ منصور نے ان سب کو قید کر لیا بعض کو جیلوں میں ڈالا اور اکثر کو قتل کروا دیا۔

منصور ملکی معاملات کو گفت و شنید کے ذریعے حل کرنے کی صلاحیت سے بڑی حد تک عاری تھی۔ جونہی کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف وقوع پذیر ہوتا منصور کا پہلا انتخاب اس کی تلوار ہوتی۔ 148ھ میں موصل کے لوگوں نے خارجی سردار حسان بن مجاہد کی فوجوں کا ساتھ دیا۔ منصور کی فوجوں کو شکست ہوئی تو اس نے نئے سرے سے فوج بھیجنے کا بندوست کیا۔ موصل والوں کی خوش قسمتی کہ منصور نے تین علمائے وقت امام ابوحنیفہؒ، ابن ابی لیلیٰ اور ابن بشرمہ کو مشورہ کے لئے بلایا۔ منصور نے ان کو بتایا کہ موصل والوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میرے خلاف بغاوت کریں گے تو مجھ پر ان کا مال اور ان کے خون کی کوئی ذمہ داری باقی نہ رہے گی۔ اس لئے اب میں بری ہو گیا ہوں۔ امام ابوحنیفہ کے علاوہ باقی دونوں حضرات نے منصور کی خوشنودی کے لئے گفتگو کی لیکن امام اعظم نے یہ بلیغ جواب دیا: ''امیر المومنین انہوں نے ایسی چیز جائز رکھی جس کے وہ خود مالک نہ تھے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی عورت بغیر نکاح اور مملوکیت کے خود کو کسی مرد کے سامنے پیش کر دے، کیا اس سے مقاربت جائز ہوگی؟'' منصور نے کہا نہیں! امام موصوف کے اس جواب کے بعد منصور نے موصل والوں سے مواخذہ کا خیال چھوڑ دیا اور بغاوت ختم ہوگئی۔

منصور کی وفات

158 ہجری میں منصور نے عامل مکہ کو لکھا کہ سفیان ثوری اور عباس بن کثیر کو قید کر کے بھیج دو۔ لوگوں کو سخت اندیشہ تھا کہ اپنی طبیعت کے مطابق کہیں ان کو قتل نہ کر دے۔ حج کے دن قریب آ گئے تھے۔ منصور نے خود حج کا ارادہ کیا، اس سے اہل مکہ کی تشویش میں اضافہ ہو گیا کہ یہ ظالم مکہ میں آ کر نہ جانے کس کس کو قید اور قتل کرے گا۔ اہل مکہ منصور کے ظلم کے معاملہ میں دعائیں اور التجائیں کرنے لگے۔ اہل مکہ کی دعائیں قبول ہوئیں اور منصور مکہ تک پہنچنے سے پہلے ہی دنیا چھوڑ گیا۔ ملتِ اسلامیہ کو اس عذابِ مسلسل سے جو 22 سال سے ان پر مسلط تھا نجات مل گئی۔

عبدالملک بن مروان اور منصور کا موازنہ

اپنے اخلاق و عادات اور اعمال کے اعتبار سے منصور عباسی عبدالملک اموی سے بہت مشابہ تھا۔ وہ بھی دولتِ مروانیہ کا دوسرا خلیفہ تھا اور منصور بھی دولتِ عباسیہ کا دوسرا بادشاہ تھا۔ عبدالملک نے بھی دولتِ بنی مروان کو تباہ و برباد ہونے سے بچایا منصور نے بھی دولتِ عباسیہ کو اپنے مخالفین کی دست برد سے محفوظ کیا۔ عبدالملک اور منصور دونوں عالم اور محدث تھے، دونوں بخیلی کی حد تک کفایت شعاری کی وجہ سے بدنام تھے، دونوں نے قریباً مساوی مدت تک حکومت کی۔ دونوں میں فرق صرف اتنا تھا کہ عبدالملک نے اپنے ولی عہد کو قتل کیا جبکہ منصور نے زبردستی دستبردار کروایا۔ منصور اور عبدالملک دونوں

نے اپنے اقتدار کے دوران اہل مدینہ پر فوج کشی کی، انہیں اذیت سے گزارا اور اپنی آخرت برباد کی۔

ابو مسلم خراسانی

دولتِ عباسیہ کا معمار — ملتِ اسلامیہ کا قاتلِ اعظم

(81ھ تا 137ھ بمطابق 700ء تا 755ء)

بنی معاویہ اور بنی مروان عملاً ایک ہی خاندان تھا، جسے تاریخ نے بنو امیہ کے نام سے محفوظ رکھا ہے۔ اس خاندان نے حکومت حاصل کرنے کے لئے سازش، رشوت، خفیہ کارروائیاں، قتل وغارت غرض ہر وہ کام کیا جس سے خدا کی مخلوق کو راہِ حق سے ہٹا کر اپنے سامنے جھکایا جا سکتا تھا۔ اموی حکومت کو مضبوط کرنے کے لئے مسالہ انسانی گوشت اور خون سے تیار کیا گیا۔ چنانچہ انسانوں کی گردنیں تو ان کے سامنے جھک گئیں لیکن دل ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی طرف مائل نہ ہوئے۔ سوائے عمر بن عبدالعزیزؒ کے ڈھائی سالہ دورِ خلافت کے بنو امیہ کی حکومت کا ہر دن زوال کو کھینچ کر قریب لاتا گیا۔ امیوں نے 92 سال حکومت کی۔ ان کی رعایا کے لوگوں نے اللہ اور رسول ﷺ اور خلافتِ راشدہ کا زمانہ دیکھا ہوا تھا۔ اگر اموی اپنی رعایا کو رسول اللہ ﷺ اور خلافتِ راشدہ کے بنائے ہوئے اصول وقوانین پر چلاتے تو بنو امیہ زوال کا شکار ہوتے نہ ان کی لاشوں کو قبروں سے نکال کر جلایا جاتا، نہ ان کے نیم مردہ لاشوں پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا جاتا اور نہ اسلامی معاشرہ اس تباہی سے دوچار ہوتا کہ باطل کے خلاف آواز اٹھانے والے تلاش کرنے سے نہ مل سکتے تھے۔ اگر کوئی مل بھی جاتا تو فوراً تہہ تیغ کر دیا جاتا۔

ایسی غیر انسانی، غیر اخلاقی، خون ریز اور خون آشام حکومت کا اس سے آگے قائم رہنا مشیت ایزدی کے خلاف تھا۔ امویوں کے ساتھ جو کچھ ہوا، بہت برا ہوا، نہ جانے یہ بھی اصولِ خداوندی ہے کہ ظالم کا استیصال کرنے کے لئے اس سے بڑا ظالم اور جابر میدانِ عمل میں اُتار دیا جاتا ہے تاکہ ظالم کو پورے پورے بدلے سے ہمکنار کیا جا سکے۔

بنو امیہ کو ختم کرنے کے لئے عرب کی سرزمین سے ہی ہاشمی اور عباسی خاندانوں کے چشم وچراغ رزم گاہ میں کود پڑے۔ حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ان کا سرخیل ایک ایرانی النسل کو بنا دیا گیا، تاریخ جسے ابو مسلم خراسانی کے نام سے یاد کرتی ہے۔

ابو مسلم کا نام ابراہیم بن عثمان بن بشار تھا۔ یہ ایرانی النسل تھا اور مشہور ہے کہ بزرجمہر کی اولاد سے تھا۔ اصفہان میں پیدا

Marfat.com

ہوا تھا۔ ماں باپ نے کوفہ کے متصل ایک گاؤں میں آ کر سکونت اختیار کر لی تھی۔ ابومسلم کے باپ عثمان کے انتقال کے وقت اس کی عمر سات سال تھی۔ عثمان نے وصیت کی تھی کہ عیسیٰ بن موسیٰ سراج اس کی پرورش اور تربیت کرے گا۔ عیسیٰ اس کو کوفہ لے آیا۔ عیسیٰ سراج چارجامہ دوزی کا کاریگر تھا۔ عیسیٰ نے ابومسلم کو بھی وہ کام سکھا دیا۔ عیسیٰ بن موسیٰ اپنے چارجامے اور زین فروخت کرنے کے لئے خراسان جزیرہ اور موصل کے علاقوں میں لے جاتا۔ اس سفر میں ابومسلم بھی اس کا ہم سفر ہوتا تھا اور دورانِ سفر ہر طبقہ کے افراد سے ملتا۔ عیسیٰ بن موسیٰ کے متعلق سرکاری جاسوسوں کو شبہ ہوا کہ وہ علویوں اور بنو ہاشم کا نقیب ہے۔ علاوہ ازیں عیسیٰ کے خاندان کے دوسرے افراد بھی اس شبہ سے نہ بچ سکے۔ چنانچہ یوسف بن عمر ثقفی گورنر کوفہ نے عیسیٰ بن موسیٰ، اس کے چچازاد بھائی ادریس بن معقل اور ان دونوں کے چچا عاصم بن یونس عجلی کو اس قید خانہ میں ڈال دیا جس میں سابق گورنر کوفہ خالد قسری کے گرفتار شدہ عمال بھی قید تھے۔

ابومسلم عیسیٰ بن موسیٰ کی وجہ سے اکثر قید خانے جایا کرتا تھا جہاں تمام قیدی ایسے تھے جنہیں بنو امیہ کی حکومت سے نفرت تھی یا دورانِ قید نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ جو ایک فطری عمل تھا۔ ان میں بعض قیدی ایسے تھے جو واقعی بنوعباس اور بنو ہاشم کے نقیب تھے۔ ان لوگوں کی باتیں سن کر ابومسلم کے قلب پر بڑا اثر ہوا اور اس نے ان لوگوں کا ہمدرد بن کر بہت جلد ان کی نگاہ میں اعتماد و اعتبار حاصل کر لیا۔ قحطبہ بن شبیب جو امام ابراہیم کی طرف سے خراسان میں کام کر رہا تھا۔ لوگوں کو خلافت بنوعباس کے لئے دعوت دیتا تھا۔ خراسان سے حمیمہ جاتے ہوئے کوفہ کی جیل کے مذکورہ قیدیوں سے بھی ملا۔ یہاں اس کو معلوم ہوا کہ عیسیٰ اور عاصم کا خادم ابومسلم بہت ہوشیار اور جوہر قابل ہے۔ اس نے ابومسلم کو عیسیٰ سے مانگ لیا اور اپنے ساتھ لے کر حمیمہ کی طرف روانہ ہو گیا اور اسے امام ابراہیم کی خدمت میں پیش کیا۔ تھوڑے عرصہ کے لئے ابومسلم امام ابراہیم کے زیر مطالعہ اور زیر تربیت رہا۔ امام کو جب ابومسلم کی صلاحیتوں کے متعلق اطمینان ہو گیا تو اپنے ایک مشہور نقیب عمران بن اسمٰعیل کی لڑکی سے اس کا عقد کر دیا۔ اس عقد سے یہ فائدہ حاصل کرنا مقصود تھا کہ ابومسلم کو شیعانِ علیؓ کی حمایت حاصل رہے اور اس کی طاقت کمزور نہ ہونے پائے۔ اس انتظام و اہتمام کے بعد امام ابراہیم نے ابومسلم کو خراسان کی طرف روانہ کر دیا اور تمام دعاۃ اور نقباء کو اطلاع دے دی کہ ہم نے ابومسلم کو خراسان کے تمام علاقے کا مہتمم بنا کر روانہ کیا ہے۔ سب کو دعوت بنو ہاشم کے کام میں ابومسلم کی فرمانبرداری کرنا ہو گی۔ جب ابومسلم خراسان پہنچا تو اکثر نقباء نے حکم بجالانے کی یقین دہانی کرائی لیکن سلیمان بن کثیر نے ابومسلم کو دیکھ کر کہا کہ یہ نوعمر ہونے کی وجہ سے ہماری تحریک کو نقصان پہنچائے گا۔ سب تجربہ کار اور جہاندیدہ لوگ ہیں۔ ایک نوجوان ان کا افسر و مہتمم بنانا خلاف مصلحت ہے۔

شیعانِ علیؓ میں ایک اہم نقیب ابوداؤد خالد بن ابراہیم شیبانی تھا۔ اسے پتہ چلا کہ امام ابراہیم کے خط کے باوجود سلیمان بن کثیر نے ابومسلم کو نوعمر ہونے کی وجہ سے واپس بھیج دیا ہے تو اسے بڑا دکھ ہوا۔ اس نے تمام دعاۃ اور نقباء کو جمع کر کے کہا کہ آنحضرت ﷺ کو اللہ نے تمام اولین و آخرین کا علم دیا۔ آپ کی عترت اور اہل بیت اس علم کے وارث ہیں اور معدنِ علم ہیں۔ کیا تم لوگوں کو اس میں کوئی شبہ ہے؟ حاضرین نے کہا نہیں! ابوداؤد نے کہا پھر تم نے کیوں شک و شبہ کو دخل دیا۔ اس شخص کو امام نے کچھ سوچ سمجھ کر اور اس کی قابلیت کو جانچ کر ہی تمہاری طرف بھیجا ہو گا۔ اس تقریر کو سن کر سب کو ابومسلم

Marfat.com

کے واپس کرنے کاافسوس ہوااور اسی وقت آدمی روانہ کیا گیا۔ وہ ابو مسلم کو راستے سے ہی لوٹا کر واپس لایا۔ سب نے اپنے تمام کاموں کا متولی اور مہتمم ابو مسلم کو بنا دیا اور بخوشی اس کی اطاعت کرنے لگے۔ چونکہ سلیمان بن کثیر نے اول اس کو واپس کر دیا تھا۔ ابو مسلم سلیمان بن کثیر کی طرف سے ہمیشہ کبیدہ خاطر رہا۔ ابو مسلم نے نقباء کو ہر طرف شہروں میں پھیلا دیا اور تمام ملک خراسان میں خلافتِ بنو عباس کی تحریک تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

امام ابراہیم عباسی

ابو مسلم کے واقعات کے تسلسل میں امام ابراہیم کا ذکر بار بار آ رہا ہے اور آئے گا۔ اس لئے چند سطور امام ابراہیم کے متعلق ان کے تعارف کے لئے لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد آپ کے خلف الصدق حضرت امام زین العابدین سیاسی جھگڑوں سے بالکل کنارہ کش ہو گئے تھے اور طرفدارانِ اہل بیت جن کا اسلامی نام شیعہ (گروہ) تھا۔ ان کی امامت اور رہنمائی محمد بن حنفیہ کی طرف منتقل ہو گئی جو حضرت علیؓ کے غیر فاطمی صاحبزادے تھے۔ اس وقت سے حضرت علیؓ کی اولاد کے لئے دو نئی اصطلاحیں قائم ہو گئیں۔ ایک فاطمی اور دوسرے علوی جو حضرت علی کی دوسری بیویوں سے تھے۔ بہر حال اس طرح یہ سلسلہ فاطمی اہل بیت سے علویوں میں منتقل ہو گیا۔ محمد بن حنیفہ کے بعد ان کے لڑکے ابو ہاشم عبداللہ ان کے قائم مقام ہوئے۔ ابو ہاشم عبداللہ حمیمہ (ملک شام) میں تھے کہ انہیں مرض الموت پیش آگیا۔ جہاں جعفر بن عباسؓ کی اولاد کے سوا کوئی دوسرا رکن اہل بیت موجود نہ تھا۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پوتے محمد بن علی تھے۔ اس لئے ابو ہاشم نے یہ امانت محمد بن علی کے سپرد کر دی اور ان کو اپنا جانشین بنایا اور اپنے خراسانی اتباع و انصار کو وصیت کی کہ میرے بعد محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس میرے جانشین ہوں گے تم لوگ ان کی طرف رجوع کرنا۔ اس وصیت کے مطابق ابو ہاشم کی وفات کے بعد خراسانیوں نے محمد بن علی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس طرح خلافت و امامت کا استحقاق حضرت علی کی اولاد سے حضرت عباس کی اولاد میں منتقل ہو گیا۔ یہ گویا عباسی حکومت کا بنیادی پتھر تھا۔

126 ھ میں محمد بن علی نے وفات پائی اور ان کے لڑکے ابراہیم ان کے جانشین ہوئے۔ ان دونوں کے زمانے میں عباسی دعوت و تحریک کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ابراہیم کے زمانے میں تحریک کا راز فاش ہو گیا اور بنی امیہ نے ان کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ امام ابراہیم نے قید ہی میں وفات پائی۔ ابراہیم کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی ابو العباس عبداللہ بن محمد بن علی نے ان کی جگہ لی۔ ان کے زمانے میں عباسیوں میں کافی طاقت آچکی تھی۔ اس لئے وہ علانیہ بنی امیہ کے مقابلہ میں آگئے اور بنی عباس کے داعی اعظم ابو مسلم خراسانی نے بنی امیہ کا خاتمہ کر دیا۔ یہی ہمارا موضوعِ سخن ہے۔

129 ھ میں امام ابراہیم نے ابو مسلم کو لکھ بھیجا کہ اس سال موسم حج میں مجھ سے آ کر ملو تا کہ تم کو تبلیغ و دعوت کے متعلق مناسب احکام دیئے جائیں۔ یہ بھی لکھا کہ قحطبہ بن شبیب کو بھی ساتھ لے آنا اور جس قدر مال و اسباب اس کے پاس جمع ہو گیا ہے وہ بھی لیتا آئے۔ اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان خفیہ سازشوں کے لئے ایام حج بہترین موقع تھا۔ مکہ مکرمہ میں دنیا کے ہر حصہ سے لوگ آتے تھے، کسی کو کسی کے آنے پر شبہ کا کوئی موقع نہ ملتا تھا اور سازشی لوگ بآسانی مل کر ہر

Marfat.com

قسم کی گفتگو کر سکتے تھے اور اس موقع کو کبھی فوت نہ ہونے دیتے۔ چنانچہ ابو مسلم قحطبہ بن شبیب کے علاوہ کئی اور نقباء کو ساتھ لے کر مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابو مسلم شام مقوقس پہنچا تو امام ابراہیم کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ تم فوراً خراسان کی طرف واپس ہو جاؤ اگر خراسان سے نکلنے میں مشکل ہو تو وہیں مقیم رہو اور اب اپنی دعوت کو پوشیدہ نہ رکھو بلکہ علانیہ دعوت دینی شروع کر دو۔ اس خط کو پڑھتے ہی ابو مسلم مرو کی جانب لوٹ گیا اور قحطبہ بن شبیب امام ابراہیم کی خدمت میں مال و اسباب سمیت حاضر ہو گیا۔
اب جبکہ ابو مسلم کو علانیہ طاقت کا مظاہرہ کرنے کی اجازت مل چکی تھی، اس نے عربوں کی مخالفت اور بیخ کنی کے لئے ہر حربہ اختیار کیا۔ مصری، یمنی اور ربیعہ میں سے کبھی ایک کے ساتھ ہو جاتا اور دوسرے کو پٹواتا، کبھی دوسرے کے ساتھ ہو کر پہلے کو ذلیل و رسوا کرواتا۔ بنی مروان کے آخری خلیفہ مروان الحمار کا خلافت سے دم واپسیں تھا، اس میں اپنے ہمراہیوں کے لئے فوجیں بھیجنے کے لئے کوئی دم خم اور جرأت نہ تھی۔ چنانچہ عربوں کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے ابو مسلم نے مروان کی حکومت کو قریباً ختم کر دیا تھا کہ امام ابراہیم کا ایک خط ابو مسلم کے نام اموی حکومت نے پکڑ لیا۔ امام ابراہیم نے خط میں ابو مسلم کو لکھا تھا کہ خراسان میں بھی عربی زبان بولنے والے کسی شخص کو زندہ نہ چھوڑے۔ اموی حکومت نے قاصد کو دس ہزار روپے دے کر ابو مسلم کے پاس بھیجا کہ اس کا جواب لکھوا کر لائے اور امام ابراہیم کے خلاف کارروائی نہ کرنے کے لئے مؤثر ثبوت مل جائے۔ چنانچہ اس خط کی بنیاد پر امام ابراہیم کو گرفتار کر لیا گیا۔ سازش کو ان کے سامنے رکھا گیا تو امام نے واقعہ سے انکار کیا۔ جب گواہ کے ساتھ خط کو پیش کیا گیا تو سازش کو تسلیم کرنا پڑا۔ چنانچہ امام کو قید کر دیا گیا اور وہ قید خانہ میں فوت ہو گئے۔

Marfat.com

امام ابراہیم کی وفات کے وقت حمیمہ میں ان کے مندرجہ ذیل افراد موجود تھے۔ ابو العباس، عبداللہ سفاح، ابو جعفر منصور اور عبد الوہاب۔ یہ حضرات امام کے چچا تھے۔ امام ابراہیم نے گرفتار ہونے سے پہلے اپنے بھائی ابو العباس سفاح کے لئے وصیت کی تھی کہ کوفہ میں جا کر قیام کریں۔ چنانچہ اس وصیت کے مطابق ابو العباس سفاح مذکورہ بالا اہلِ خاندان حمیمہ سے روانہ ہو کر کوفہ آیا اور ایک عباسی داعی ابو مسلمہ خلال کے ہاں ٹھہرے۔ کوفہ آنے کی اطلاع پر ابو مسلم خراسان سے کوفہ چلا آیا اور ابو العباس عبداللہ سفاح کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسے ابراہیم کا جانشین بنا دیا۔ ابو العباس اپنے بھائی کے قتل سے بہت متاثر تھا۔ اس نے حکم دیا کہ خراسان میں جو عرب عباسی دعوت کو قبول نہ کرے اسے بے دریغ قتل کر دیا جائے۔ یہ حکم لے کر ابو مسلم خراسان گیا اور پورے خراسان کا دورہ کیا۔ اس دورے کے دوران ایک تاریخ مقرر کر دی کہ اس دن پورے خراسان میں بیک وقت تمام عباسی اٹھ کھڑے ہوں اور امام ابراہیم کے غم میں سیاہ لباس عباسیوں کا نشان قرار دیا۔ غرضیکہ پورے خراسان کے سیاہ پوش عباسی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے ڈنڈے تھے جن کا نام "کافر کوبات" رکھا تھا۔ اس طرح ایک لاکھ سے زیادہ انسان ابو مسلم کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ ابو مسلم کی طرف سے طاقت کا یہ مظاہرہ بے دم ہوتے ہوئی اموی حکومت کی موت کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ اس کے بعد اموی (مروانی) لشکر ابو مسلم کے سامنے ڈھیر ہوتا گیا۔ اس دوران جن شہروں پر قبضہ ہوتا گیا، ابو مسلم کے حکم سے ان میں بے دریغ قتل عام کیا گیا۔
خلافت، راشدہ ختم ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ نفوسِ قدسیہ جن کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف اللہ کے نام کی

سر بلندی اور سنت رسول ﷺ کی پیروی تھا۔ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کے اخلاف ان کے وارث ہوئے تو پرجوش نوجوان طبیعتیں عہدوں کی حرص میں مبتلا ہو گئیں۔ خصوصاً قریشی نوجوان اس عظیم الشان اسلامی حکومت کو، جس کے قائم کرنے میں عرب کے تمام قبائل کی کوششیں برابر شریک تھیں، تنہا مالک سمجھنے لگے۔ یہ چیز آزاد اور مساوات پسند عربوں پر سخت شاق گزری۔ اس کے علاوہ مفتوحہ قومیں بھی مسلمانوں کی محکومی سے گلو خلاصی کے لئے موقع کی منتظر تھیں۔ شام و مصر کو عربوں نے رومیوں سے لیا تھا۔ رومیوں کی حکومت شام اور مصر کے لئے غیر قوم کی حکومت تھی۔ لہٰذا ان ہر دو ممالک کے باشندوں کو زیادہ غم نہیں تھا۔ بلکہ وہ رومیوں کی غلامی سے نکل کر خود عربوں کے برابر ہو گئے تھے۔ اس کے برعکس کسریٰ یعنی ایران کی حکومت ان کی اپنی تھی۔ مسلمانوں نے بزور شمشیر انہیں غلام بنایا تھا۔ یعنی مصر، شام کو رومیوں سے آزادی دلوائی اور ایرانیوں کے نقطہ نظر سے انہیں غلام بنایا گیا تھا۔ جس کا اثر مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا رہا۔ کبھی حضرت عمرؓ کو شہید کرنے کے لئے ابولولو ایرانی مقرر ہوا۔ کبھی ابن سبا کو کوفہ سے حمایتیوں کی بڑی جمعیت مل گئی اور بالآخر عربوں کی حکومت کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لئے ابومسلم خراسانی جیسا بیدار مغز اور ہوشیار داعی پیدا ہو گیا۔ لہٰذا ہم آگے دیکھیں گے کہ ابومسلم نے عجمیت اور عباسی دعوت کے پردے میں کیا کچھ تباہی مچائی۔

ابومسلم آخری اموی خلیفہ مروان الحمار کے وقت کے اہم عربی سرداروں سے اس حد تک رابطے استوار کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ لوگ اس کی معیت کو اپنے لئے پناہ گاہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ نصر بن یسار، یزید ابن ہبیرہ اور ابوسلمہ کے نام ان سرداروں میں نمایاں ہیں جو ابومسلم کی خون آشامی کے نشانہ بنے۔ ابوعباس سفاح کی خلافت (حکومت) شروع ہوتے ہی مع ان کے ساتھیوں کے قتل کروا دیا گیا۔ حالانکہ یہ لوگ عباسی دعاۃ میں شامل ہو چکے تھے۔ ابومسلم کے مشورہ سے ہی ان کا کام تمام ہوا۔

132ھ میں ابوالعباس سفاح تخت نشین ہوا۔ اموی سردار اپنی حکومت ختم ہونے کے بعد سفاح کی مجلس طعام میں مدعو تھے۔ ابومسلم خراسانی کے بھیجے ہوئے شاعر نے ایسے اشعار پڑھے جس سے عباسیوں کی رگ جاہلیت بڑے زور سے پھڑکی اور اس وقت عرب سرداروں کو قتل کر کے ان کی لاشوں کو برابر کیا اور ان پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا۔ اب جبکہ ابومسلم کے پروردہ لوگ اقتدار پر قابض ہو چکے تھے اور سارا کاروبار حکومت اس کی خواہش اور نگرانی میں چل رہا تھا۔ قتال امت میں ابومسلم نے دل کے ارمان نکالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ امام ابراہیم اپنی زندگی ہی میں اس کو عربوں کے قتل کا حکم دے چکے تھے اور اس کا اپنا دل و دماغ عصبیتہ اسلام سے نکل کر پوری طرح عصبیتہ جاہلیہ کی گرفت میں آچکا تھا۔ اس کے حکم سے اموی خاندان اور ان کے ہمدردوں کو کس انداز سے اور کتنی تعداد میں قتل کیا گیا اس کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

زیر دسترخوان امویوں کی لاشوں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ عبداللہ بن سفاح کا چچا عبداللہ بن علی 5 رمضان 132ھ کو دمشق میں داخل ہوا تو اس نے قتل عام کا حکم دے دیا۔ چونکہ دمشق عباسیوں کے مخالف امویوں کا دارالحکومت تھا، ان کے بہی خواہ اور متوسلین کی کافی تعداد موجود تھی۔ لہٰذا دمشق میں بنو امیہ کی نسل ختم ہونا اس وقت مشکل تھا لیکن ابومسلم اس پر کمر ہمت باندھ چکا تھا۔ اس نے عبداللہ سفاح اور عباسی سرداروں کو لکھا کہ بنو امیہ کے کسی فرد کو خواہ کیسا ہی ہمدرد اور بہی خواہ کیوں نہ ہو، ہرگز

Marfat.com

زندہ نہ چھوڑا جائے۔ لہٰذا جہاں کہیں قتل عام میں نرمی دکھائی جاتی وہ اپنے پروردہ شاعروں اور خطیبوں کو بھیج دیا تاکہ امویوں کے خلاف اشتعال اور نفرت پھیلائی جائے اور قتل عام میں تیزی آجائے۔

موصل میں لوگوں نے دیکھا کہ ہاشمی خاندان نبوت کی خلافت کا پرچار کرنے والے عباسی حکومت پر قابض ہو گئے ہیں تو وہ عباسیوں سے منحرف ہو گئے۔ اس پر عبداللہ سفاح نے اپنے بھائی یحییٰ کو بارہ ہزار کی جمعیت کے ساتھ موصل روانہ کیا۔ یحییٰ نے موصل پہنچ کر قصر امارہ میں قیام کیا اور موصل کے بارہ سرکردہ آدمیوں کو بلا کر قتل کروادیا۔ ان کو بلانا اور پھر قتل کرادینا یہ سارے کام یحییٰ نے دھوکے سے کئے تھے۔ اس کے نتیجے میں اہل موصل یحییٰ سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ یحییٰ نے یہ حالت دیکھ کر منادی کرادی کہ جو شخص جامعہ مسجد چلا آئے گا اسے امان مل جائے گی۔ یہ سن کر لوگ جامع مسجد کی طرف دوڑ پڑے۔ مسجد کے دروازے پر یحییٰ نے اپنے آدمی کھڑے کر رکھے تھے۔ جو شخص مسجد کے اندر جاتا قتل کر دیا جاتا۔ اس طرح گیارہ ہزار آدمی قتل کر دیے گئے۔ اس کے بعد یحییٰ نے شہر میں قتل عام کا حکم دے دیا۔ رات ہوئی تو یحییٰ کے کان میں ان عورتوں کے رونے کی آواز آئی جن کے بیٹے، بھائی، خاوند اور رشتہ دار ظلماً قتل کر دیے گئے تھے۔ صبح ہوئی تو یحییٰ نے حکم دیا کہ عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کر دیا جائے۔ تین روز کے لئے فوج کے لئے اہل شہر کا خون مباح کر دیا گیا۔ اس حکم کے سنتے ہی شہر میں قتل عام میں اور شدت آگئی۔

یحییٰ کے لشکر میں چار ہزار زنگی بھی تھے۔ زنگیوں نے عورتوں کی عصمت دری میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ہزارہا عورتوں کو پکڑ کر لے گئے۔ چوتھے روز یحییٰ گھوڑے پر سوار شہر کی سیر کو نکلا۔ ایک عورت نے ہمت کر کے یحییٰ کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا کیا تم بنو ہاشم نہیں ہو؟ کیا تم رسول ﷺ کے چچا کے لڑکے نہیں ہو؟ کیا تم کو یہ خبر نہیں ہے کہ مومنات و مسلمات سے زنگیوں نے جبراً نکاح کر لئے ہیں؟ یحییٰ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور چلا گیا۔ اگلے دن زنگیوں کو تنخواہ تقسیم کرنے کے بہانے سے بلایا۔ جب سب زنگی جمع ہو گئے تو ان کے قتل عام کا حکم دے دیا۔

سلیمان بن علی بن عبداللہ بن عباس نے بصرہ میں بنو امیہ کے ایک گروہ کو قتل کر کے لاشوں کو راستے میں پھینک دیا اور دفن کرنے کی ممانعت کر دی۔ ان لاشوں کو مدتوں کتے کھاتے رہے۔ عبداللہ بن علی کے دوسرے بھائی یعنی سفاح کے چچا داؤد بن علی نے مکہ، مدینہ، حجاز و یمن میں چن چن کر ایک ایک اموی کو قتل کرادیا اور بنو امیہ کا نام و نشان تک باقی نہ رہنے دیا۔

غرض تمام ممالک محروسہ میں حکم عام جاری کیا گیا کہ جہاں کوئی اموی نظر آئے، بے دریغ قتل کر دیا جائے۔ ولایتوں کے والی اور شہروں کے حاکم جو عموماً عباسی تھے، اپنی اپنی جگہ اس تجسس میں رہنے لگے کہ کہیں کسی اموی کا پتہ چلے اور اس کو قتل کیا جائے۔ یہاں تک کہ جس طرح کسی درندے کا شکار کرنے کے لئے لوگ نکلتے ہیں اس طرح بنو امیہ کو شکار کرنے کے لئے لوگ گھروں سے نکلتے تھے۔ بنو امیہ کے لئے کوئی شہر، کوئی گاؤں، کوئی قصبہ جائے امن نہ رہا اور برسوں ان کی تلاش کر کر کے عباسی لوگ قتل کرتے رہے۔

دوسرے شہروں میں جو قتل عام ہو رہا تھا وہ ابو مسلم کی ہدایات کے مطابق ہو رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اس میں ابو مسلم کی مرضی

Marfat.com

کی شدت پیدا نہ ہو سکی ہو۔ خراسان میں یہ کام ابو مسلم انتہائی ہمت اور اہتمام کے ساتھ انجام دے رہا تھا۔ اس نے نہ صرف بنو امیہ بلکہ ان لوگوں کو بھی جنہوں نے کبھی نہ کبھی بنو امیہ کی حمایت یا کوئی خدمت انجام دی تھی قتل کروا دیا۔ اس قتل عام سے بچ کر جو لوگ ایک جگہ سے دوسرے جگہ بھاگ کر جا سکے، اپنا بھیس بدل کر نام اور قوم دوسری بتا کر ایک جگہ سرحدوں کی جانب رخ کیا۔ خراسان کے صوبوں اور ولایتوں میں یہ قتل عام جو بہت زیادہ سخت تھا، یہاں جو بنو امیہ یا ان کے ہمدرد قبائل تھے وہ سندھ، کوہ سلیمان اور کشمیر کی طرف بھاگ کر پناہ گزین ہوئے۔ جن لوگوں نے اپنے قبیلوں کے نام بدل دیے تھے وہ بھی رفتہ رفتہ اسلامی حکومت کی حدود سے باہر نکل آئے۔ یہ مفرور عربی قبائل جو سندھ، کشمیر اور پنجاب وغیرہ کی طرف بھاگ کر آئے تھے، کہا جاتا ہے کہ ان کی نسلیں آج تک ہندوستان اور موجودہ پاکستان میں موجود ہیں اور اپنے بدلے ہوئے ناموں اور پیشوں کی وجہ سے اپنے عربی نژاد ہونے کو بھول چکی ہیں۔ بنو امیہ کا صرف ایک شخص عبد الرحمن بن معاویہ بن ہشام قتل عام کا شکار ہونے سے بچ گیا اور فرار ہو کر مصر، قیروان ہوتا ہوا اندلس پہنچ گیا۔ وہاں وہ ایسی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا جسے عباسی خلفاء رشک کی نظر سے دیکھتے تھے۔

مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے قتالِ اعظم ابو مسلم خراسانی نے 6 لاکھ سے زیادہ انسانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اگلی چند سطور میں ہم اس کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہم جیسے طالبعلم کے لئے تاریخی حقائق کے تسلسل سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ہم نہ تو فطرتِ انسانی کے نباض ہیں اور نہ ہی متعلقہ جملہ علومِ انسانی کے ماہر۔ ایک مشاہدہ اور سوچ جو مطالعہ تاریخ کے دوران سامنے آئی ہے، اسے پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔

خلافتِ اسلامیہ کو جو قوم یا خاندان وراثتاً اپنا حق سمجھے وہ سخت غلطی اور ظلم میں مبتلا ہے۔ بنو امیہ نے اگر حکومتِ اسلامی کو اپنے ہی خاندان اور قوم میں رکھنا چاہا تو یہ ان کی غلطی تھی۔ بنو عباس یا بنو ہاشم اس کو اپنا حق سمجھتے تھے تو یہ بھی ان کی غلطی تھی اور ناانصافی تھی۔ چونکہ دنیا میں عام طور پر لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں، لہٰذا سلطنت اور حکومت میں بھی حق وراثت کو جاری سمجھا جاتا ہے۔ اس بنا پر جو شخص کسی غاصب حکومت سے حکومت یا سلطنت چھیننا چاہتا ہے وہ اکثر قتل و تشدد سے کام لیتا ہے۔ لیکن اس قتل و تشدد کو بنو عباس (ابو مسلم خراسانی) نے بنو امیہ کے حق میں جس طرح روا رکھا اس کی مثال موجودہ تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتی۔ خاندانِ امیہ سے اسلامی خلافت و حکومت کو نکال کر کسی دوسرے خاندان کو خلافت و حکومت کا مالک بنا دینا بھی کوئی خوبی کی بات نہ تھی اور نہ اس عمل سے ملتِ اسلامیہ کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ لہٰذا بنو عباس نے نہایت ہی قابل شرم خونریزی اور قتل و غارت کا ارتکاب کیا اور اس سارے قتل عظیم کا سرخیل ابو مسلم خراسانی تھا۔

اللہ کا دین (اسلام) ایک ایسی نعمتِ غیر مترقبہ ہے کہ جب انسان اس کے اندر اپنی شخصیت کی تمام و کمال جہتوں سے شامل ہو جاتا ہے اور اسلام اس کے رگ و پے میں پوری اثر پذیری سے سرایت کر جائے اور اس کی رگوں میں صالح خون کی طرح دوڑے تو انسان اپنی ہر ادا سے اللہ کی مخلوق کا حامی، محافظ، راحت رساں اور ناصر بن جاتا ہے۔ اس کی جبلت خونخواری کا ظہور انسانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے میں نہیں بلکہ اسے بچانے اور اسے سکون و اطمینان پہنچانے میں ہوتا ہے۔

Marfat.com

یہ بات پایۂ تحقیق تک پہنچ چکی ہے کہ ابو مسلم پارسی نژاد نو مسلم تھا جس نے نہ تو کہیں سے اسلام کی تعلیم حاصل کی، نہ کسی درویش کی مجلس میں بیٹھ کر کسب فیض کیا، نہ اس کا خاندانی پس منظر ایسا تھا جو اسے انسانیت سوز مظالم سے باز رکھتا اور نہ ہی اس وقت کے معاشرے میں جزا و سزا کا چلن اتنا مضبوط رہ گیا تھا کہ ابو مسلم اپنی خون آشامی سے باز رہتا۔ سونے پہ سہاگہ ہدائت کار بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کی دھاک بٹھانے کے لئے زیادہ سے زیادہ انسانوں کو تہہ تیغ کیا جائے۔ مزید برآں ابو مسلم ایک عصبیت پسند ہی نہیں عجمی عصبیت کا دلدادہ، دیوانہ اور جانثار تھا۔ اپنے ملک ایران میں عربی غلبہ اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ چنانچہ اس نے عباسیوں سے مل کر خراسان اور خراسان کی ولایتوں سے چن چن کر عربوں کو قتل کیا۔

عہد فاروقی میں جب کوفہ آباد ہوا تو اس میں فاروق اکبرؓ کے حکم سے عربی قبائل کو آباد کیا گیا اور عربی قبائل بھی وہ جو جنگجو تھے اور کوفہ اور اس کے گرد و نواح میں فاتحانہ انداز میں رہ رہے تھے۔ ابو مسلم جیسے عربیت مخالف عجمی تہذیب اور پارسی مذہب کے دلدادہ کے لئے ناممکن تھا کہ انہیں برداشت کرے اور تہہ تیغ نہ کرے۔

چنانچہ ایرانی علاقہ جس میں اس وقت عراق بھی شامل تھا قتل و غارت گری سے عربوں کے وجود سے پاک کر کے دوبارہ پارسی اور عجمی تہذیب کا احیا کیا گیا اور وہ ایران جو عربی شہسواروں کی وجہ سے تہذیب و تمدن میں عالم عرب کے برابر بنتا جا رہا تھا رجعت قہقری کا شکار بنا دیا گیا اور عربی تہذیب و تمدن اس علاقے میں سکڑ کر رہ گئے۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ عرب نہیں عجم اور عجم میں بھی ابو مسلم اور صرف ابو مسلم اس علاقے کا بادشاہ بن کر رہے۔ اس مقصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمام ممالکِ محروسہ (اسلامیہ) میں بالعموم اور مدینہ منورہ، مکہ معظمہ اور پورے حجاز میں اس قتل عام کی کیا ضرورت تھی؟ ابو مسلم دیکھ چکا تھا کہ اس کی سازشوں اور اولوالعزمی سے ایک عربی حکومت امویوں کے ہاتھ سے نکل کر عباسیوں کے چنگل میں آ گئی۔ اس نے اموی خاندان کا بیج سوخت کرنے کے لئے پوری کوشش کی اور اس علاقہ سے بھی اموی ناپید ہو گئے۔ یعنی عباسی حکومت کے تمام مخالفین نیست و نابود کر دیے گئے۔

ابو مسلم کے ذہن میں حالات و واقعات نے یہ نقشہ اچھی طرح بٹھا دیا تھا کہ اس کے کارندوں کی ہمت اور مشاورت سے جو حکومت پروان چڑھ رہی ہے، پروان نہیں ابھی گھٹنوں کے بل چل رہی ہے۔ اگر میرا (ابو مسلم) کا کوئی دشمن نہیں رہے گا تو میرے لئے اسے ہوا میں اڑا دینا اور اپنی تمام کوششوں کا صلہ خود حکومت کی صورت میں حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہ ہو گا۔ ابو مسلم اس دوسرے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ جو عباسی شکاری اس خونی عقاب کو استعمال کر رہے تھے وہ جلدی ہوش میں آ گئے اور اسے اس کے انجام تک پہنچا دیا۔

ابو مسلم خراسانی کا حج، دولتِ عباسیہ سے مناقشت اور منصور عباسی کے ہاتھوں قاتل اعظم کا قتل

132ھ میں عبداللہ سفاح تخت نشین ہوا لیکن 135ھ تک ابو مسلم خراسانی نے خود دربار خلافت میں حاضر ہو کر بیعت

Marfat.com

نہیں کی تھی ۔ جہاں تک عبداللہ سفاح کا تعلق تھا ابومسلم اسے مشورے دیتا اور وہ عموماً ان پر عمل کرتا لیکن خراسان کے معاملے میں ابومسلم سارے فیصلہ خود کرتا ۔عبداللہ سفاح ابومسلم کو خراسان کے معاملے میں کوئی حکم دے سکتا تھا اور نہ ہی وہ اسے وہاں سے تبدیل کر کے کسی دوسری ولایت کا امیر بنا سکتا تھا ۔اور وہ دولتِ عباسیہ کا مربی ومحسن ہونے کے ناطے ہر معاملہ میں پوری خودسری دکھاتا تھا۔سفاح خود اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد بھی اس رویہ سے نالاں تھے اور اب وہ وقت آگیا تھا کہ ابومسلم سے چھٹکارا حاصل کریں ۔ چنانچہ سفاح نے دو افراد زیاد بن صالح اور سباع بن نعمان کو مقرر کیا کہ موقع ملنے پر ابومسلم کو قتل کر دیا جائے ۔خراسانی کو اپنے ذرائع سے یہ خبر معلوم ہوگئی، چنانچہ اس نے حیلے بہانے سے دونوں افراد کو قتل کرا دیا ۔ 136ھ میں ابومسلم نے سفاح سے حج کی اجازت چاہی تا کہ اسے امیر الحج بنا کر بھیجا جائے ۔امیر الحج کو عموماً خلیفہ کے بعد اہم ترین عہدیدار سمجھا جاتا تھا۔سفاح کو یہ بات پسند نہ آئی ۔اس نے خفیہ طور پر اپنے بھائی ابوجعفر منصور کو اشارہ کیا کہ حج کی درخواست بھیج دو ۔ چنانچہ منصور کو امیر الحج بنا دیا گیا اور ابومسلم کی امیر الحج ہونے کی خواہش پوری نہ ہو سکی ۔سفاح نے ابومسلم کو بھی اسی سال حج کی اجازت دے دی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ ایک ہزار سے زیادہ آدمی ساتھ نہ لے جائے گا۔دوسرے طرف ابومسلم کو منصور کی معیت پسند نہ تھی ۔وہ بہت سے کام جو کرنا چاہتا تھا منصور ان میں رکاوٹ ڈال سکتا تھا۔

ابومسلم خراسان سے اپنے ساتھ بڑا خزانہ لایا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے دورانِ سفرِ حج مختلف مقامات پر کنویں کھدوائے، ہر منزل پر لنگر خانے بنوائے، سرائیں تعمیر کرائیں، کپڑے تقسیم کئے ۔غرضیکہ حجاج کو راحت پہنچانے کے لئے بہت سارے کام کئے ۔

مکہ میں اس نے یہی کام وسیع پیمانے پر کئے ۔ جہاں ہر طرف لوگ موجود تھے ۔نتیجتاً لوگوں کے دل اس کی طرف مائل ہونے لگے ۔ایامِ حج گزرنے کے بعد ابھی منصور نے روانگی کا قصد نہ کیا تھا کہ ابومسلم روانہ ہوگیا۔مکہ سے دو منزل اپنے مستقر کی طرف نکل چکا تھا کہ دارالخلافہ انبار کا قاصد اسے ملا۔قاصد سفاح کی موت کی خبر لے کر آیا تھا تا کہ موت اور خلافت کی خبر منصور کو پہنچا سکے ۔ابومسلم نے اس قاصد کو دو روز تک ٹھہرائے رکھا اور پھر منصور کے پاس روانہ کر دیا۔منصور کو ابومسلم سے پہلے ہی ملال تھا کہ وہ اس سے پہلے کیوں روانہ ہوگیا تھا۔اب قاصد کے روکے جانے سے اور بھی مضطرب ہوا کہ ابومسلم نے اس خبر کے سننے کے بعد منصور کو خلافت کی مبارکباد نہیں بھیجی اور نہ ہی بیعت کے لئے ٹھہرا۔حالانکہ سب سے پہلے اس کو بیعت کرنی چاہیے تھے اور کم از کم منصور کے آنے تک اسی مقام پر قیام کرنا ضروری تھا کہ دونوں ساتھ ساتھ سفر کرتے ۔منصور یہ خبر سنتے ہی مکہ سے روانہ ہوگیا لیکن ابومسلم اس سے آگے سفر کرتا ہوا دارالخلافہ انبار پہنچ گیا۔اس کے بعد منصور داخل ہوا۔

عبداللہ سفاح نے موت سے چند دن پہلے ہی منصور کی ولی عہدی کی دستاویز لکھ کر اور اس پر اہلِ بیت کی مہریں لگا کر اسے عیسیٰ بن موسیٰ (اپنے چچا) کے سپرد کر رکھا تھا۔ چنانچہ سفاح کے بعد منصور خلیفہ بن گیا۔موت سے پہلے سفاح نے اپنے چچا عبداللہ بن علی کو خراسانی اور شامی لشکر کے ساتھ صائفہ کی طرف روانہ کر دیا۔محرم 137ھ میں منصور انبار پہنچ کر تختنشین ہوا۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے عبداللہ بن علی کو سفاح کے انتقال منصور کی خلافت اور ولی عہدی کی اطلاع دی ۔

عبداللہ بن علی نے لوگوں کو اکٹھا کر کے اعلان کیا کہ حران کی مہم پر بھیجتے وقت عبداللہ سفاح نے اعلان کیا تھا کہ جو اس مہم پر جائے گا میرے بعد خلیفہ ہو گا کیونکہ اس مہم پر میرے سوا کوئی بھی جانے کو تیار نہ تھا۔ عبداللہ بن علی کے دعوے کی تصدیق کے لئے کئی اور لوگ بھی کھڑے ہو گئے اور سب نے مل کر عبداللہ بن علی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ منصور اس صورت حال پر پریشان ہو گیا اور ابومسلم کو عبداللہ کی سرکوبی کے لئے طلب کیا۔ ابومسلم پہلے ہی اس بات کا منتظر تھا کہ منصور کسی طرح اس کا احسان مند ہو جائے۔ چنانچہ ابومسلم منصور کے حکم سے حسن بن قحطبہ کی اور اپنی فوج کے ساتھ عبداللہ بن علی پر حملہ آور ہوا۔ عبداللہ بن علی کو شکست فاش سے دو چار ہونا پڑا اور وہ روپوش ہو گیا اور اس کا سارا مال و اسباب ابومسلم کے ہاتھ لگا۔ اس کے ساتھ ہی ابومسلم نے منصور کو عبداللہ بن علی پر فتح کا خط بھی بھیجا۔

منصور نے فتح کی خبر کے بعد اپنے خادم خاص ابوخصیب کو مالِ غنیمت کی فہرست تیار کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔ ابومسلم کو اس بات پر سخت غصہ آیا کہ میرا اعتبار نہ کیا اور اپنا آدمی فہرست مرتب کرنے کے لئے بھیج دیا۔

ابومسلم کی ناراضی اور ناخوشی کی اطلاع منصور کے پاس پہنچی تو منصور کو پریشانی لاحق ہوئی کہ کہیں ابومسلم ناراض ہو کر خراسان نہ چلا جائے۔ چنانچہ اس نے مصر و شام کی گورنری کی سند لکھ کر ابومسلم کے پاس بھیج دیا۔ ابومسلم کو منصور کی اس "عطا" پر مزید غصہ آیا۔ وہ سمجھ گیا کہ منصور اسے خراسان سے جدا کر کے بے دست و پا کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ابومسلم جزیرہ سے نکل کر خراسان کے طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی روانگی کی خبر سن کر منصور انبار سے مدائن کی طرف چل پڑا اور ابومسلم کو حاضر ہونے کے لئے پیغام بھیجا۔ اس کے جواب میں اس نے کہلوا بھیجا کہ اب آپ کو میری ضرورت باقی نہیں رہی۔ اگر آپ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیں تو میں آپ کی اطاعت سے باہر نہیں نکلوں گا اور اپنی بیعت پر قائم رہوں گا۔ اگر آپ میرے درپے رہے تو میں خلع خلافت کا اعلان کر کے آپ کی مخالفت پر آمادہ ہو جاؤں گا۔

اس خط کو پڑھ کر منصور نے ابومسلم کو نہایت نرمی اور محبت کے لہجہ میں ایک خط لکھا کہ تمہاری وفاداری اور اطاعت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ تم ہمیشہ سے بڑے کارگزار اور مستحق انعام ہو۔ شیطان نے ہمارے دلوں میں وسوسے ڈال دیے۔ تم ان لوگوں سے اپنے آپ کو بچاؤ اور ہمارے پاس چلے آؤ۔ منصور نے یہ خط اپنے آزاد کردہ غلام حمید کے ہاتھ روانہ کیا اور تاکید کی کہ منت سماجت سے جس طرح بھی ہو سکے ابومسلم کو میرے پاس لے آؤ۔ اگر نہ مانے تو اسے میرے غصہ سے ڈراؤ۔ ابومسلم نے اس بارے میں اپنے مشیر خاص مالک بن ہیثم سے رائے لی تو اس نے منصور کے پاس جانے سے منع کیا کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ منصور ابومسلم کو قتل کرا دے گا۔

منصور نے ایک اور سردار ابوداؤد خالد ابراہیم کو بھی خراسان کی گورنری کا لالچ دے کر ابومسلم کو دربار میں لانے کی مہم پر مامور کیا کہ جس طرح ہو سکے ابومسلم کو میرے پاس آنے پر آمادہ کرو۔ ابومسلم منصور کے پاس جانے کو تیار ہو گیا لیکن بغرضِ احتیاط اپنے وزیر ابواسحاق خالد بن عثمان کو جس پر ابومسلم کو بڑا اعتماد تھا، حالات معلوم کرنے کے لئے منصور کے پاس بھیجا۔ ابواسحاق دارالخلافہ انبار پہنچا تو منصور نے اپنے جرنیلوں کو بھیج کر اس کا شاندار استقبال کیا۔ اپنی میٹھی باتوں سے ابواسحاق کو بھی رام کر لیا اور اسے بھی ابومسلم کو دربار میں لانے کے عوض خراسان کی گورنری کا پروانہ دینے کا وعدہ کیا۔ ابواسحاق

Marfat.com

کے اطمینان دلانے پر ابومسلم نے اپنا لشکر حلوان میں اپنے ماتحت کے سپرد کیا اور صرف تین ہزار فوج کے ساتھ مدائن کی طرف چل پڑا۔

منصور کے اشارے پر دو سردار ابومسلم کے پاس پہنچے، جب وہ مدائن کے قریب پہنچ گیا تو دونوں میں سے ایک کسی صوبہ کی سرداری اور دوسرا اپنی خطا کی معافی کے لئے منصور کے ہاں ابومسلم کی سفارش کے خواستگار ہوئے۔ ابومسلم کا اعتماد اور بڑھ گیا اور رہے سہے خطرات اس کے دل سے دور ہو گئے۔ ابومسلم بڑی عزت اور توقیر کے ساتھ دربار میں داخل ہوا۔ عزت و تکریم کے ساتھ واپس ہو کر اپنی آرام گاہ پر چلا گیا۔ دوسرے دن جب ابومسلم دربار میں آیا تو منصور نے پہلے سے چند آدمی دربار میں چھپا رکھے تھے، کہ جب منصور تالی بجائے وہ یکدم حملہ کر کے ابومسلم کا کام تمام کر دیں۔

داخل ہوتے ہی منصور نے دو تلواروں کے متعلق سوال کیا جو اسے عبداللہ بن علی کی شکست کے بعد ملی تھیں۔ اس نے کہا ایک اس وقت میرے کمر کے ساتھ لگی ہے اور دوسری لشکر میں ہے۔ منصور نے کہا بھلا ہم بھی وہ تلوار دیکھیں۔ ابومسلم نے فوراً وہ تلوار منصور کو پیش کر دی جسے اس نے اپنی ران کے نیچے دبا لیا اور فوراً لہجہ بدل کر ابومسلم سے احتساب کے انداز میں مکالمہ شروع کر دیا۔ (1) تم نے سلیمان بن کثیر کو جو ہمارا سب سے پرانا اور وفادار داعی تھا، بلاوجہ قتل کر دیا۔ (2) تم کتنے حد سے بڑھے جا رہے ہو، خطوط میں اپنا نام پہلے لکھتے ہو۔ (3) میری پھوپھی آمنہ کو تم نے شادی کا پیغام دیا۔ (4) تم اپنے آپ کو سب میں عبداللہ بن عباس کی اولاد بتاتے ہو۔ منصور کی ماں بربر قبیلہ سے تھی، ابومسلم اس کے متعلق نامناسب باتیں کیا کرتا تھا جو منصور تک پہنچ رہی تھیں۔

ہر اعتراض کے ساتھ منصور کا لہجہ سخت اور بلند ہوتا گیا اور ابومسلم اتنا ہی لجاجت اور معذرت سے کام لیتا رہا۔ بالآخر ابومسلم نے کہا میں اللہ کے سوا کسی سے ڈرتا نہیں، تم جو چاہو کرو۔ منصور نے تالی بجائی، قاتل برآمد ہوئے اور اگلے ہی لمحے ابومسلم کو ڈھیر کر دیا۔ چھ لاکھ سے زیادہ انسانوں کا قاتل خاک و خون میں تڑپ رہا تھا۔ ابومسلم کے قتل کے بعد عیسیٰ بن موسیٰ دربار میں داخل ہوا اور ابومسلم کا پوچھا۔ منصور نے جواب دیا، فرش پر لیٹا ہوا ہے۔ عیسیٰ نے کہا کہ قتل کر دیا گیا۔ منصور نے اثبات میں جواب دیا۔ عیسیٰ نے اناللہ پڑھا اور کہا کہ اس کی جان بخشی اور کارناموں کے بعد یہ سلوک؟ منصور نے جواب دیا، اللہ کی قسم روئے زمین پر اس سے زیادہ تمہارا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اس کی زندگی میں تم لوگوں کے لئے حکومت کرنا ناممکن تھا، اس سے بچنے کی صرف یہی ایک صورت تھی۔

ابومسلم کے قتل کے بعد خراسان والوں نے عربی عجمی کی بنیاد پر ابومسلم کے خون کا بدلہ لینے کے لئے کچھ لوگوں نے سر اٹھایا۔ اس شورش پر منصور نے جلدی قابو پا لیا اور معاملات اس کی گرفت میں آ گئے۔

Marfat.com

باطنیت کا فتنہ اور اس کے پیروکار

وہ لوگ جو اسلام کے دشمن تھے یا لاشعوری طور پر دشمنی کی حدود میں شامل تھے. انہوں نے اسلام اور امتِ مسلمہ کو نقصان پہنچانے کے لئے ایک نئے طرزِ عمل اور طرزِ زندگی کی بنیاد رکھی۔ اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو ہم باطنیت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے بانی اور داعی اکثر ان قوموں کے افراد تھے جو اسلام کے مقابلہ میں اپنی سلطنتیں اور اقتدار کھو چکے تھے اور ظاہر میں مقابلہ اور جنگ سے ان کی بازیافت کی کوئی امید باقی نہ تھی. یا شہوت پرست اور لذت پسند لوگ تھے اور اسلام کی حدود و قیود ان کی سرگرمیوں پر قدغن لگاتی تھیں یا شخصی سرداری اور اقتدار کے حریص تھے۔ ان تمام مختلف مقاصد کے لوگ باطنیت کے نشان کے نیچے جمع ہو گئے انہوں نے سوچا کہ اسلام کو جنگی طاقت سے شکست نہیں دے سکتے. نہ مسلمانوں کو کفر و الحاد کی کھلی دعوت دے سکتے ہیں۔ اس سے ان کے مذہبی احساسات و جذبات بیدار ہو جائیں گے اور مقابلہ پر اُتر آئیں گے۔ انہوں نے اس کے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔

ظاہر و باطن کا مغالطہ

انہوں نے دیکھا کہ شریعت کے اصول و عقائد اور احکام و مسائل کو الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور انسانوں کے سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے ایسا ضروری تھا۔ "اور ہم نے کوئی پیغمبر دنیا میں نہیں بھیجا مگر اپنی قوم ہی کی زبان میں. تا کہ لوگوں پر مطلب واضح کرے۔" (القرآن)

ان الفاظ کے معنی و مفہوم متعین ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبانِ مبارک سے ان کی تشریح اور اپنے عمل سے وہ صورت سامنے رکھ دی جس پر عمل پیرا ہو کر شریعت کی مراد پوری ہو سکے یہ معنی اور مفہوم امت میں عملی اور لفظی طور پر تواتر و تسلسل سے چلتے آ رہے ہیں اور ساری امت ان کو جانتی اور مانتی ہے۔ نبوت و رسالت، ملائکہ و جن، جنت و دوزخ، شریعت، فرض و واجب، حلال و حرام، صلوٰۃ و زکوٰۃ، روزہ و حج یہ سب الفاظ ہیں جو خاص دینی حقائق کو بیان کرتے ہیں اور جس طرح یہ دینی حقائق محفوظ چلے آ رہے ہیں۔ اسی طرح ان دینی حقائق کو ادا کرنے والے الفاظ بھی محفوظ چلے آ رہے ہیں اور اب دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

جب نبوت و رسالت یا نبی ﷺ یا صلوٰۃ کا لفظ بولا جائے گا تو اس کی وہی حقیقت اور وہی عملی شکل سامنے آئے گی جو رسول ﷺ نے بتائی اور صحابہ کرامؓ نے اس کو سمجھا اور اس پر عمل کیا اور اس کو دوسروں تک پہنچایا اور اسی طرح نسل در نسل امت

Marfat.com

تک منتقل ہوگئی۔ باطنیت کے پیروکاروں نے اپنی بیمار ذہنیت سے اس نقطہ کو سمجھا کہ الفاظ ومعانی کا یہ رشتہ امت کی پوری زندگی اور اسلام کے فکری و عملی نظام کی بنیاد ہے اور اسی سے اس کی وحدت اور ماضی سے اس کا ربط قائم ہے۔ اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے اور دینی الفاظ میں اصطلاحات کے مفہوم ومعنی متعین نہ رہیں یا مشکوک ہو جائیں تو یہ امت ہر دعوت اور ہر فلسفہ کا شکار ہو سکتی ہے اور اس کے سنگین قلعہ میں سینکڑوں چور دروازے اور اس کی مضبوط دیواروں میں ہزاروں شگاف پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس نکتہ کو پا جانے کے بعد انہوں نے اپنا سارا زور اس تبلیغ پر صرف کیا کہ ہر لفظ کے ایک ظاہری معنی ہوتے ہیں اور ایک حقیقی اور باطنی۔ اسی طرح قرآن وحدیث کے ظاہر و مخفی معنی میں وہی نسبت پھل کی ہے جو چھلکے اور مغز کو ہے۔ جہلاء صرف ان ظواہر کو جانتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں پوست ہی پوست ہے۔ عقلاء حقائق کے عالم میں اور ان کے حصہ میں مغز آیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ الفاظ دراصل حقائق کے رموز واشارات ہیں۔ ان سے وہ مراد نہیں جو عوام سمجھتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔ ان سے مراد کچھ اور چیزیں ہیں جن کا علم صرف اہل اسرار کو ہے اور انہی سے دوسروں کو حاصل ہو سکتا ہے۔ جو ان حقائق تک نہیں پہنچا اور ظواہر میں گرفتار ہے وہ ظاہری پیراہن اور شریعت کی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے اور نہایت نیچی سطح پر ہے۔ جو حقائق ورموز کی بلند سطح تک پہنچ جاتا ہے اس کی گردن سے یہ طوق وسلاسل اتر جاتے ہیں اور وہ شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ اس آیت کا مفہوم ہے۔ "پیغمبر اس بوجھ سے نجات دلاتے ہیں جس کے تلے دبے ہوئے ہیں۔ ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار تھے۔" (القرآن)

جب یہ اصول تسلیم کر لیا گیا اور حقائق وظواہر کے اسی فلسفہ کو قبول کر لیا گیا تو انہوں نے نبی، وحی، نبوت، ملائکہ، آخرت اور جملہ اصطلاحاتِ شرعیہ کی من مانی تشریح کرنی شروع کر دی جس کے نادر نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

نبی اس ذات کا نام ہے جس پر قوت قدسیہ صافیہ کا فیضان ہو۔ جبریل کسی ہستی کا نام نہیں صرف فیضان کا نام ہے۔ معاد سے مراد ہر چیز کا اپنی حقیقت کی طرف واپس آجانا۔ جنابت سے مراد افشائے راز ہے۔ غسل سے مراد تجدید عہد ہے۔ زنا سے مراد علم باطن کے نطفہ کو کسی ایسی ہستی کی طرف منتقل کرنا جو عہد میں شریک نہ ہو۔ طہارت سے مراد مذہب باطنیہ کے علاوہ ہر مذہب سے برأت۔ تیمم سے مراد اجازت یافتہ سے علم کا حصول۔ صلوٰۃ سے مراد امام وقت کی طرف دعوت۔ زکوٰۃ سے مراد اہل استعداد و صفا میں اشاعت علم۔ صیام (روزہ) سے مراد افشائے راز سے پرہیز واحتیاط۔ حج سے مراد اس علم کی طلب جو عقل کا قبلہ اور منزل مقصود ہے۔ جنت علم باطن، جہنم علم ظاہر، کعبہ خود نبی ﷺ کی ذات ہے، باب کعبہ سے مراد حضرت علیؓ کی ذات، قرآن مجید میں طوفان نوح سے مراد علم کا طوفان ہے جس میں اہل شہادت غرق کر دیے گئے۔ آتش نمرود سے مراد نمرود کا غصہ ہے نہ کہ حقیقی آگ۔ ذبح سے مراد جس کا ابراہیم کو حکم دیا گیا بیٹے سے عہد لینا۔ یاجوج ماجوج سے مراد اہل ظاہر ہیں، عصائے موسیٰ سے مراد ان کی دلیل وحجت ہے۔

نبوتِ محمد ﷺ کے خلاف بغاوت

الفاظِ شرع کے متواتر و متوارث معنی ومفہوم کا انکار اور قرآن وحدیث کے ظاہر و باطن اور مغز و پوست کی تقسیم ایک کامیاب حربہ تھا جس سے اسلام کے نظام اعتقاد اور نظام فکر کے خلاف سازش کرنے والوں نے ہر زمانہ میں کام لیا۔ اسلام کی

Marfat.com

پوری عمارت کو اس طرح ڈائنامائٹ کیا جاسکتا تھا اور اسلام کے ظاہری خول کے اندر ریاست اندرون ریاست قائم کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کی صدیوں میں جن فرقوں اور منافقین کی جماعت نے نبوت محمدی کے خلاف بغاوت کرنی چاہی اس نے باطنیت کے اسی حربہ سے کام لیا اور اس معنوی تواتر و توارث کا انکار کر کے پورے نظام اسلام کو مشکوک و مجروح بنادیا اور اپنے لئے دینی سیاست بلکہ نئی نبوت کا دروازہ کھول دیا۔ ایران کی بہائیت اور ہندوستان کی قادیانیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان نقطہ آفرینیوں کو جن کی چند مثالیں دی گئی ہیں، کوئی سلیم الطبع آدمی قبول نہیں کرسکتا۔ باطنیت کے داعیوں نے علم کلام سے قدیم علم ہیئت، یونانی فلسفہ اور اسی طرح کے بے مغز خیالات جنہیں منطق اور فلسفہ مابعد الطبیعات کے نام دیا گیا، ان نکتہ آفرینیوں کو ظاہری طور پر مغز اور زور آور بنا کر پیش کیا اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کو ذہنی انتشار اور تشکک سے دو چار کردیا۔

باطنیت میدانِ عمل میں

باطنیت کو میدانِ عمل میں دیکھنے سے پہلے ہم اس کی تاریخی بنیاد کو سامنے لائیں گے۔ شیعوں کا ایک بہت بڑا فرقہ یا طبقہ جنہیں اسماعیلی کہا جاتا ہے، اس طبقے کا دوسرا نام سبعیہ بھی ہے۔ اسماعیلی کہلانے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ امام جعفر صادق نے اپنے بڑے بیٹے اسمٰعیل کی جگہ دوسرے فرزند امام موسیٰ کاظم کو ولایت عطا کردی۔ اس پر ان کے ماننے والے دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک امامیہ جو اثنا عشری بھی کہلاتا ہے اور دوسرا سبعیہ یا اسماعیلی کہلایا جو اسمٰعیل کی امامت کا قائل ہے۔ امام اسمٰعیل چونکہ والد کی زندگی میں ہی فوت ہوگئے تھے اس لئے ان کے بیٹے محمد کو ساتویں امام کی جگہ فائز تسلیم کرلیا گیا۔ مختلف علاقوں میں یہ فرقہ مختلف ناموں سے مشہور ہوا۔ نزاریہ اور قرامطہ دروزیہ، باطنیہ، مستعلیہ (بوہرے) دروزی اسی فرقے کی مختلف شاخیں ہیں۔

قرامطہ

278ھ میں سرزمین کوفہ میں ایک شخص حمدان نامی عرف قرامطہ نے ایک نیا مذہب جاری کیا۔ حمدان بہت چھوٹے قدم اٹھاتا تھا اور اس کا خط بھی بہت باریک تھا۔ ان دونوں صفتوں کو عربی میں قرامطہ کہتے ہیں۔ لہٰذا حمدان کا جاری کردہ باطنی مذہب قرامطہ کہلایا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ امام صرف سات ہیں بارہ نہیں۔ باطنی ہونے کے ناطے اس نے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا تھا۔ اس نے دن رات میں صرف دو نمازیں رکھی تھیں، یعنی دو رکعت قبل طلوع آفتاب اور دو رکعت بعد غروب آفتاب۔ وہ کہتا تھا بعض سورتیں محمد بن حنفیہ پر نازل ہوئی ہیں، جمعہ کی بجائے دوشنبہ کے دن کو ہفتہ میں بابرکت سمجھتا تھا۔ بعض جانوروں کو اس نے حلال اور بعض کو حرام قرار دیا تھا۔ جو شخص قرامطہ کا مخالف ہو، اس کا قتل کرنا واجب ٹھہراتا تھا۔ اپنا لقب قائم "بالحق" رکھا تھا۔

باطنیوں کے اس فرقہ کے داعی ایران، بحرین، کوفہ، دمشق، رے اور ہندوستان میں ملتان سے لے کر گجرات کاٹھیاواڑ

Marfat.com

تک پھیل گئے۔ 297ھ بمطابق 969ھ میں آسمٰعیلیوں نے شمالی افریقہ میں اپنی حکومت قائم کرلی تو باطنی مذہب کے تمام فرقوں کو سیاسی توانائی مل گئی اور جب یہ حکومت فاطمیوں کے نام سے مصر میں قائم ہوگئی تو یہ تمام فرقے اور بھی دلیر ہو گئے اور اُمت مسلمہ کے درپے آزار رہنے لگے۔

یوں تو قرامطیوں نے کوفہ۔ بصرہ۔ دمشق۔ بحرین۔ یمن اور ملتان۔ کاٹھیاواڑ۔ گجرات تک مسلمانوں کو بڑے دکھ دیے۔ ان کا قتل عام کیا۔ ان کے شہر برباد کیے اور ان کے نظریات کو متاثر کیا لیکن دو جرائم ایسے ہیں جن کا ارتکاب کر کے قرامطہ نے ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کی نفرت اور ان کی نظروں میں اپنے لئے حقارت اور لعنت سمیٹ لی۔ 287ھ میں قرامطہ کے معتقدین میں سے ایک شخص یحییٰ بن مہدی نامی نے بحرین کے مضافات میں رہائش اختیار کی اور اپنی شعبدہ بازیوں اور فریب کاریوں سے قرامطیوں کو اپنی روش پر پختہ تر کر دیا۔ یحییٰ کے متبعین میں سے ایک شخص ابوسعید جنابی بڑا اجری تھا۔ اس نے بحرین میں مذہب قرامطہ کے لوگوں کو علانیہ دعوت دی۔ جو لوگ پہلے خفیہ طور پر مذہب قرامطہ کے پیروکار بن چکے تھے اب وہ علانیہ ابوسعید جنابی کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ اس طرح ابوسعید نے ایک موثر جمعیت فراہم کرلی جو بحرین۔ ہجرہ اور بصرہ کے امن وسکون کو غارت کرنے کے لئے کافی تھی۔ اس وقت خلیفہ معتقد نے عباس بن عمرو والی فارس کو یمامہ اور بحرین کا حاکم بنا کر بھیجا اور ساتھ ہی بصرہ کے گرد شہر پناہ بنانے کا حکم دیا عباس نے بصرہ پہنچ کر ابوسعید سے جنگ شروع کر دی تاکہ مسلمانوں کو جنابی کی غارت گری سے بچایا جا سکے۔ بدقسمتی سے عباس کو شکست کھا کر گرفتار ہونا پڑا اور عباس کے علاوہ جنابی نے عباس کی فوج کے گرفتار شدہ افراد کو زندہ جلا دیا اور ہجرہ پر قبضہ کرلیا۔ یہ خبر بصرہ پہنچی تو یہاں سے فوجیوں کے لئے خورونوش کا سامان روانہ کیا گیا لیکن راستہ میں بنی اسد نے حملہ کر کے چھین لیا اور ابوسعید کی تلوار سے جو لوگ زندہ بچ گئے تھے انہیں بھی قتل کر دیا۔ یہ سانحہ 287ھ میں پیش آیا۔ اس سانحہ کے بعد کئی جگہ قرامطیوں کو شکست ہوئی اور قتل بھی ہوئے لیکن قرامطیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا اپنے ملک میں زندہ جلا دیا جانا انتہائی شرمناک اور دل دوز واقعہ تھا۔

318ھ بحرین میں قرامطہ کی حکومت مضبوط ہو چکی تھی اور ابوطاہر اس حکومت کا سربراہ تھا۔ مگر خطبہ میں یہ لوگ خلیفہ بغداد کی بجائے عبیداللہ مہدی والیٔ افریقہ کا نام لیتے تھے اور اس کو اپنا خلیفہ مانتے تھے۔ 318ھ میں ابوطاہر فوج لے کر مکہ کی طرف گیا۔ حج کا زمانہ تھا۔ بغداد سے خلیفہ کی جانب سے منصور دیلمی امیر حج بن کر روانہ ہوا تھا۔ منصور 8 ذوالحج کو اور 9 ذوالحج کو ابوطاہر مکہ پہنچا اور مکہ میں پہنچتے ہی حاجیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ سب کا مال واسباب لوٹ لیا۔ خانہ کعبہ کے اندر بھی لوگوں کو قتل کرنے سے باز نہ رہا۔ مقتولوں کی لاشوں سے چاہ زمزم کو بھر دیا۔ حجر اسود کو گرز مار کر توڑ ڈالا اور دیوار کعبہ سے جدا کر کے گیارہ روز تک یونہی پڑا رہنے دیا۔ خانہ کعبہ کا دروازہ توڑ ڈالا۔ محمد بن ربیع ایک عینی شاہد کا قول ہے کہ میں اس ہنگامہ میں مکہ کے اندر موجود تھا۔ میرے سامنے ایک شخص خانہ کعبہ کی چھت پر میزاب کعبہ کو اکھاڑنے کے لئے چڑھا۔ میں نے کہا الٰہی یہ ظلم مجھ سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس شخص کا پاؤں پھسلا۔ سر کے بل گرا اور گرتے ہی مر گیا۔ ابوطاہر نے گیارہ روز تک مکہ کے باشندوں کو لوٹا پھر حجر اسود کو اونٹ پر لاد کر بحرین کے دارالحکومت ہجر کی طرف چلا۔ مکہ سے ہجر تک سنگِ اسود کے نیچے چالیس اونٹ ہلاک ہوئے۔ بیس برس تک حجر اسود قرامطہ کے قبضہ میں رہا۔

Marfat.com

پچاس ہزار دینار اس کے عوض قرامطہ کو دینے منظور کیے لیکن انہوں نے نہیں دیا۔آخر زمانہ خلافت مطیع اللہ میں حجر اسود ان سے واپس لے کر خانہ کعبہ میں نصب کیا گیا۔واپسی کے وقت حجر سے مکہ تک اس کو صرف ایک اونٹ ہی واپس لے آیا۔عبید اللہ مہدی نے ابوطاہر کو خط لکھا اور اہل مکہ کے مال واسباب کو واپس کر دینے کی تاکید کی۔ابوطاہر نے کچھ حصہ مال و اسباب کا واپس کر دیا مگر حجر اسود واپس نہ کیا۔وہ 339ھ میں واپس مکہ لا کر اپنی جگہ پر نصب کیا گیا۔والی افریقہ عبید اللہ کا 20 سال تک اتنے بڑے سانحے سے بے خبر رہنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔

976ء عباسی خلیفہ طائع اللہ کے دور میں خلیفہ کی فوجوں نے بحرین میں قرامطی لشکر کو شکست سے دوچار کیا اور قرامطیوں کا زوال شروع ہو گیا۔بالآخر 1076ء میں مقامی سردار عبد اللہ العیونی نے قرامطیوں کو بحرین سے مار بھگایا اور یوں بحرین میں العیون سلطنت کی بنیاد رکھی۔

ملتان اور گجرات کاٹھیاواڑ میں قرامطیوں کو سلطان محمود غزنوی جیسے راسخ العقیدہ مسلمان نے (971-1030ء) پیچھا کر کے ختم کیا۔اس طرح اس باطل طبقے (باطنی) کے لوگ منتشر ہونے پر مجبور ہو گئے اور بالآخر اپنے مربی اسمٰعیلی (باطنی) گروہ میں شامل ہو گئے بلکہ ضم ہو گئے۔اس طرح اللہ پاک نے ان خونی درندوں سے ملت اسلامیہ کو نجات دی۔

Marfat.com

حسن بن صباح

(1050ء-518ھ/1140ء)

باطنیوں کی ایک شاخ قرامطہ کا ذکر ہو چکا، اب باطنیوں کی سب سے زہریلی شاخ صباحیہ یا نزاریہ کا ذکر ہوگا۔ اس شاخ کے سب سے اہم فرد کا نام حسن بن صباح تھا۔ عملاً حسن بن صباح اس فرقے کا بانی تھا۔ جنہیں حشیشن بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس نے اپنے مذموم مقاصد کے لئے حشیش (بھنگ) کو بڑی ذہانت سے استعمال کیا، اسے اللہ تعالیٰ سے احکام پانے کا بھی دعویٰ تھا۔ حسن ایران کے شہر قم میں پیدا ہوا، اس کا باپ علی اسمٰعیلی مذہب کا پیرو تھا۔ اس کا سلسلہ نسب یہ ہے حسن بن علی بن احمد بن جعفر بن حسن بن صباح حمزہ۔

حسن کا باپ عیار قسم کا آدمی تھا، اپنے خبث باطن اور رفض و زندقہ میں بدنام تھا۔ ابومسلم رازی جو صحیح العقیدہ بزرگ تھے ان کو جھوٹی قسمیں کھا کر یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہے اس وجہ سے کہ کسی طرح اس سے رفض و زندقہ کا الزام دور ہو جائے۔ جب اہل سنت والجماعت کے ایک بڑے عالم امام موفق نے نیشاپور میں مسند درس سنبھالی تو مختلف شہروں کے لوگ ان کے حلقہ درس میں شریک ہونے کے لئے آئے۔ علی نے بھی اپنے بیٹے حسن کو داخل کرا دیا۔ حسن تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس اپنے والد کے پاس آ گیا۔ جواب رے میں بود و باش رکھتا تھا۔ 465ھ (1072ء) میں اپنے ہم مکتب اور دوست نظام الملک طوسی کے پاس نیشاپور پہنچا۔ نظام الملک نے اس کی ملاقات سلطان ملک شاہ سے کرائی اور اسے سلطان کا مشیر خاص مقرر کرایا۔ چونکہ حسن نہایت ہی بدسرشت تھا، وہ ہر وقت اس فکر میں رہنے لگا کہ نظام الملک کو بادشاہ کی نظروں سے گرائے اور خود اس کا عہدہ حاصل کرے۔ چنانچہ حسن کی انہی حرکتوں کے سبب اسے سلجوقیوں کے دربار سے نکلنا پڑا۔ پھر وہ اصفہان پہنچا لیکن کچھ عرصہ بعد اسے اصفہان کو بھی خیرباد کہنا پڑا۔

حسن بن صباح اصفہان سے رے پہنچا، وہاں سے معلوم ہوا کہ اسمٰعیلی مذاہب کا داعی الکبیر عطاش تبلیغ و اشاعت کے لئے ملازم رکھتا ہے۔ حسن بھی درخواست گزار ہوا، عطاش نے اسے ملازم رکھ لیا۔ کچھ عرصہ بعد اسے مصر بھیجا گیا جہاں فاطمی (عبیدیوں) کی حکومت تھی۔ وہ بظاہر اسمٰعیلی در پردہ باطنی تھے۔ مصر میں حسن کو بہت قدر و منزلت ملی۔ اپنی سرشت کے مطابق کچھ عرصہ بعد مصر میں رہتے ہوئے ایک سازش میں ملوث ہو گیا اس بنا پر اسے قلعہ دمیاط میں قید کر دیا گیا۔ اتفاق سے اسی

Marfat.com

روز قلعہ کا ایک مضبوط برج گر گیا۔ لوگوں نے اسے حسن کا باطنی تصرف سمجھا، جس پر امیر الجیوش نے برافروختگی کا اظہار کیا اور اسے قلعہ سے نکال کر چند عیسائیوں کے ہمراہ جہاز پر بٹھایا اور افریقہ کی طرف بھیج دیا۔ جہاز سے اتر کر اس کی ملاقات بڑے اہم اسمٰعیلی مشنری علوی سے ہوئی۔ سلجوقی سلطان الپ ارسلان نے سلجوقی حکومت کا جاسوسی نظام ختم کر دیا۔ تو باطنیوں کو حسن کی سربراہی میں حلب، بغداد اور خوزستان، اصفہان وغیرہ میں بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔

ملک شاہ سلجوقی کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں کی خانہ جنگی کے زمانہ میں باطنیوں کی قوت بہت بڑھ گئی۔ انہوں نے عجم کے بہت سے قلعوں اور قہستان کے بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ قلعوں اور علاقے پر قبضہ کی وجہ سے باطنی زیادہ دلیر اور مضبوط ہو گئے۔ انہوں نے بے دریغ خون ریزی شروع کر دی اور چند دنوں کے اندر ہزاروں مسلمان جن میں بہت سے اکابر علماء، رؤسا اور امرا بھی شامل تھے کو قتل کر ڈالا اور قتل کی وارداتیں اتنی عام ہو گئیں اور لوگوں پر اتنا خوف طاری تھا کہ کوئی شخص گھر سے نکلنے کی ہمت نہ کرتا۔ اگر گھر سے باہر جانے والا مقررہ وقت پر گھر واپس نہ آتا تو گھر والے اس کی موت کا یقین کر لیتے۔

خاص اصفہان کا علاقہ بھی محفوظ نہ تھا۔ ایک باطنی رئیس احمد بن عطاش نے اصفہان کے قریب ایک قلعہ "شاہ دز" پر قبضہ کر لیا تھا۔ شہر اصفہان میں اس کا ایک خفیہ مرکز قائم تھا۔ روزانہ قتل کی وارداتیں ہوتی تھیں اور پتہ نہ چلتا۔ باطنی مختلف بھیسوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اصفہان میں مصنوعی اندھا باطنی روزانہ ایک تاریک اور پر پیچ گلی کے سرے پر کھڑا ہو جاتا اور جو راہ گیر نکلتا اسے کہتا بابا اللہ کے لئے اندھے کو اس کے گھر تک پہنچا دو اور لوگ رحم کھا کر اس کے ساتھ ہو جاتے۔ جیسے ہی باطنیوں کی کمین گاہ تک پہنچتے، باطنی اس کو پکڑ کر لے جاتے۔ اس طریقہ سے چار پانچ مہینوں کے اندر سینکڑوں آدمی لاپتہ ہو گئے اور ان کی گمشدگی کا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ ایک دن ایک بھکارن مانگتے مانگتے کمین گاہ کے دروازے تک پہنچ گئی اور اندر سے نالہ و فریاد کی آواز سن کر بھاگ نکلی اور لوگوں سے کمین گاہ (خاص گھر) کی حالت بیان کی۔ قتل کی وارداتوں سے لوگوں کو پہلے ہی جستجو تھی۔ اتنا سراغ پا کر ہزاروں آدمی اسی گھر میں گھس گئے، وہاں پر مستقل مقتل نظر آیا۔ زمین دوز خانوں میں کئی سو آدمی سزا بھگت رہے تھے، بہت سے مر چکے تھے، کچھ نیم جان تھے اور بعض دیواروں سے میخوں سے ٹھکے ہوئے تھے۔ اس انکشاف نے شہر میں ایک شور برپا کر دیا اور اصفہان ماتم کدہ بن گیا۔ خود سلطانی فوج میں سپاہیوں کے بھیس میں ہزاروں باطنی تبلیغ و اشاعت کر رہے تھے۔ جو شخص مخالفت کرتا اسے قتل کی دھمکی دیتے۔ جان کے خوف سے کوئی شخص بھی جرأت نہ کرتا۔ بڑے بڑے امرا پوری احتیاط کرتے۔ اتفاق سے سلطان برکیارق اور سلطان محمد کی جنگ کے زمانے میں باطنیوں کے ہاتھوں جو امرا مارے گئے تھے وہ سب سلطان محمد کی جماعت کے تھے۔ اس لئے سلطان محمد کے مخالفین نے خود اسے بھی باطنیت سے متہم کر دیا۔ اس لئے سلطان برکیارق کو ان کے استیصال کی طرف توجہ کرنی پڑی اور اس نے سب سے اول اپنی فوج کے باطنیوں کو چن چن کر قتل کر دیا۔ اس سلسلے میں بہت سے امرا بھی مارے گئے۔ فوج کے علاوہ ان کے جتھے جہاں جہاں مل سکے ان کا استیصال کیا گیا۔ اس طرح بہت سے امرا باطنیت کے شبہ میں قتل ہوئے۔ مدرسہ نظامیہ کے ایک مدرس کو اسی باطنیت کے الزام میں پکڑ کر لے گئے اور خلیفہ مستنصر کی شہادت پر اس کو رہائی ملی۔

Marfat.com

باطنیت کا الزام اب اتنے سنگین اثر کا حامل تھا کہ اس کا داغ صرف تلوار ہی مٹا سکتی تھی اس لیے اس عام دار و گیر میں بہت سے بے گناہ بھی مارے گئے۔ بااثر افراد اور امرا نے اپنی اپنی جگہ باطنیوں کا استیصال کیا۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اصفہان کے نواح میں قلعہ سیاہ دور اب تک احمد بن عطاش کے قبضہ میں تھا وہ بے شمار مسلمانوں کو قتل کر چکا تھا اور اس کا مقصد قتل و غارت گری اور خوف کی فضا پیدا کر کے باطنیوں کی حکومت قائم کرنا تھا۔ اس لیے وہ زمینداروں اور سلطانی عمال سے ٹیکس وصول کرتا تھا اور سب جان کے خوف سے ادا کرتے تھے۔ اس لیے سلطان محمد کو بھی ان کی طرف توجہ کرنا پڑی اور سلطان نے "سیاہ دوز" پر فوج کشی کر کے اس کا محاصرہ کر لیا۔ احمد بن عطاش نے چند دن مزاحمت کی لیکن اس کا سامان رسد ختم ہو گیا۔ احمد بن عطاش نے سلطان محمد کے وزیر سعد الملک کے پاس جو در پردہ باطنی تھا۔ پیغام بھیجا کہ اگر تم نے سامان رسد کا کوئی انتظام نہ کیا تو میں قلعہ حوالہ کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔

سعد الملک نے جواب میں کہلا بھیجا کہ چند دن میں۔ میں اس کتے (سلطان محمد) کا کام تمام کرائے دیتا ہوں۔ تم انتظار کرو۔ سلطان محرور المزاج تھا اور ہر مہینہ فصد کروایا کرتا تھا۔ سعد الملک نے شاہی فصاد کو رشوت دے کر زہر آلود نشتر سے فصد کرنے پر آمادہ کر لیا۔ سلطان کو اس کی خبر ہو گئی اور فصاد کو بھی اس کا اقرار کرنا پڑا۔ سلطان نے زہر آلود نشتر سے سعد الملک کو فصد دلوائی اور وہ ختم ہو گیا۔ سعد الملک کی موت کے بعد احمد بن عطاش قلعہ حوالہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ سلطان نے اسے گرفتار کر لیا۔ نہایت ذلت کے ساتھ اس کی تشہیر کرائی اور قتل کر دیا اور ساتھ ہی اس کا قلعہ بھی مسمار کر دیا۔

فاطمی خلیفہ مستنصر عبیدی کے ایک بیٹے کا نام نزار تھا۔ مستنصر نے حسن بن صباح کو وصیت کی کہ میرا بیٹا نزار باطنیوں کا امام ہو گا۔ چنانچہ حسن نے نزار کو امام تسلیم کر لیا۔ اس لیے صباحیہ فرقہ نزاریہ بھی کہلاتا ہے۔ حسن بن صباح مختلف شہروں میں اپنی تبلیغ و اشاعت کا کام کرتا ہوا خراسان پہنچا۔ یہاں طالقان اور قہستان کی حکومت پر مامور گورنر نے قلعہ الموت کی حکومت ایک علوی کے سپرد کر رکھی تھی۔ حسن بن صباح اس علوی کے پاس پہنچا۔ علوی نے اسے بڑے عزت و احترام کے ساتھ ٹھہرایا۔ حسن ایک مہمان اور عابد و زاہد انسان کی صورت میں عرصہ دراز تک قلعہ الموت میں مقیم رہ کر در پردہ وہ قلعہ پر قبضہ کرنے کی تدبیروں میں مصروف رہا۔ جب اس کی تدبیریں مکمل ہو گئیں تو علوی کو قلعہ سے نکال کر خود قلعہ پر قابض ہو گیا۔ یہ زمانہ ملک شاہ سلجوقی کی حکومت کا تھا۔ ملک شاہ کے وزیر نظام الملک طوسی نے اس خبر کو سن کر ایک فوج حسن بن صباح کی سرکوبی اور قلعہ الموت کے محاصرہ کے لیے روانہ کی۔ حسن نے اپنے گرد کے بہت سے آدمی فراہم کر کے کافی مضبوطی حاصل کر لی تھی۔ لڑائیوں کا سلسلہ جاری تھا کہ حسن نے ایک فدائی کو درخواست گذار کے روپ میں نظام الملک کے پاس بھیجا۔ نظام الملک نے درخواست گذار کو اس کی شنوائی کے لیے قریب بلایا تو اس نے زہر آلود خنجر سے وار کر کے نظام الملک کو شہید کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام الملک کی بھیجی ہوئی فوج واپس چلی گئی۔ اس سے حسن اور اس کے ساتھیوں کے حوصلے بڑھ گئے اور انہوں نے ارد گرد کے علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ انہی دنوں شاہی خاندان کا فرد جس کا نام منور تھا اور سلجوقی وائسرائے قہستان کا گورنر تھا۔ سلجوقی حکومت کے وائسرائے کا مخالف ہو گیا۔ اس نے حسن بن صباح سے وائسرائے کے خلاف فوجی امداد کی درخواست کی جسے بلا تامل مہیا کر دیا گیا اور اپنی فوج بھیج کر گرجستان پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح حسن کی طاقت اور بڑھ گئی۔

Marfat.com

قلعہ الموت پر قبضہ سے پہلے حسن بن صباح اپنی کارروائیوں کو بڑی حد تک خفیہ رکھتا تھا۔قتل وغارت کرتا اور کرواتا تھا۔ اسے مصر کی عبیدی حکومت کی حمایت حاصل تھی اور بحرین والے قرامطہ جن کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ وہ بھی اس کے تربیت یافتہ کارندے بن چکے تھے۔اب حسن بن صباح کی شخصیت کا ایک اور خطرناک پہلو سامنے آیا۔جس کا اعتقاد تھا کہ جو ہمارے عقیدے سے اختلاف کرے اس کا قتل کرنا جائز اور ضروری ہے تا کہ عبیدیوں کی حکومت مصر ہی نہیں۔ پورے عالم اسلام پر قائم ہو جائے۔

حسن بن صباح کی خواہش تھی کہ وہ دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور حکمران بن جائے۔فوجوں کے ذریعے لڑ کر وہ یہ مقصد حاصل نہیں کرسکتا تھا۔اس نے عام تاریخ انسانیت سے ہٹ کر ایک طریقہ ایجاد کیا۔جس کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

حسن بن صباح نے بڑی سوچ بچار کے بعد جانبازوں کی ایک جماعت تیار کی اور جماعت کے لوح دل پر یہ بات مرتسم کردی کہ شیخ الجبل حسن بن صباح تمام دنیا کا مالک اور دین و دنیا میں بڑا قادر و متصرف ہے۔اس تعلیم وتلقین کے علاوہ اس نے ایک ایسی تدبیر اختیار کی۔جس کی وجہ سے اس جماعت کو جان سپاری کے لیے آمادہ کرنا بالکل آسان ہوگیا۔اس نے قلعہ الموت کے ارد گرد خوبصورت مرغزاروں اور جان بخش نزہت گاہوں میں نہایت خوبصورت محل اور برج تیار کرائے۔ان جادو اثر محلات اور نزہت گاہوں کے بیچوں وبیچ جنت کے نام سے ایک خوش نما باغ بنوایا۔جس میں وہ تمام سامان مہیا کر دیے جو انسان کے لیے موجب تفریح وراحت ہو سکتے ہیں مثلاً ہر قسم کے میوہ دار درخت۔پھول۔چینی کے خوبصورت ظروف۔ بلوری،طلائی اور نقرئی سامان۔بیش قیمت فرش وفروش۔یونان کے اسباب تعشیات۔پُر تکلف سامان خورد ونوش۔نغمہ وسرور جنت کی دیواروں پر نقش ونگار کا نہایت نازک کام کرایا۔نلوں کے ذریعے محلات میں پانی۔دودھ۔شراب اور شہد جاتا تھا۔ان تمام تکلفات کے علاوہ دل بہلانے کے لیے پری تمثال کمسن نازنین موجود تھیں۔ان ماہ وتمثال اچھوتیوں کی سادگی وضع اور ان کے حسن وجمال کی دلربائی دیکھنے والوں کو یہ یقین دلاتی تھی کہ یہ دنیا نہیں کسی اور عالم کے نورانی پیکر ہیں۔کوشش یہ کی گئی کہ داخلہ کے بعد زائرین کے دل پر فرحت وانبساط کا ایسا شیریں اثر پیدا ہو جائے کہ وہ اس فرحت ومسرت کو دنیاوی نہیں بلکہ اخروی نعمت مان لے اور دل وجان سے مان لے۔

حسن نے اپنے مریدوں کو تین جماعتوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ایک تو داعی ومناد تھے جو دور دراز ممالک میں خفیہ طور پر لوگوں کو اس مذہب کی دعوت دیتے۔دوسرے رفیق جن کو حسن کا معتمد علیہ ہونے کی عزت حاصل تھی۔تیسرا گروہ فدائین کا تھا، جن کے لیے جنت بنائی گئی تھی۔ابن صباح علاقہ طالقان اور رود بار وغیرہ کے خوبصورت۔تندرست اور قوی الجثہ مگر سادہ لوح نوجوانوں کو فدائین کی جماعت میں بھرتی کرتا۔وہ حسن کے ہر حکم پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتے۔بھنگ جسے حشیش کہتے ہیں۔شاید ان ایام میں غیر معمولی چیز تھی۔غالباً حسن بن صباح پہلا شخص ہے جس نے اپنی دانشمندی سے بھنگ سے وہ کام لیا جو اس سے پہلے شاید ہی کسی نے لیا ہو۔

جب فدائی امیدواری کا دور ختم کر لیتا تو حسن اسے بھنگ کے اثر سے مدہوش کر کے جنت میں بھجوا دیتا۔یوں وہ جان پرور حوروں کی گود میں آنکھیں کھولتا اور اپنے آپ کو ایسے عالم میں پاتا جہاں کی خوشیاں اور مسرتیں شاید بڑے سے بڑے

Marfat.com

شاہانِ عالم کو بھی نصیب نہیں تھیں۔ وہاں وہ انواع واقسام کی نزہت گاہوں کی سیر کرتا۔ حوروں کے حسن سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا، مے وشوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر مئے ارغوانی کے جام اڑاتا، اعلیٰ سے اعلیٰ غذائیں اور بہترین قسم کے میوے کھاتا اور ہر طرح کے عیش وآرام میں محو رہتا۔

ہفتہ عشرہ کے بعد جب ان محبت شعار حوروں کی الفت کا نقش اس کے دل پر اتنا گہرا ہو جاتا کہ وہ مدت العمر بھی مٹا نہ سکے۔ جب وہی حوریں بھنگ کا ایک جام پلا کر اسے شیخ الجبل کے پاس واپس بھیج دیتیں اور وہ شیخ کے قدموں میں آنکھیں کھولتا تو جنت کے چند روزہ قیام کی خوش گواریاد اس کو سخت بے چین کر دیتی تو حسن بن صباح اسے جنت میں واپس بھیجنے کی پھر امید دلاتا اور کہتا کہ جنت میں قیام کی شرط جان سپاری ہے چنانچہ وہ حسن کے احکام کی تعمیل میں کس طرح کوتاہی کر سکتا تھا؟

جب حسن کو کسی دشمن کو قتل کرنا مقصود ہوتا تو ایک فدائی نوجوان کو حکم دیتا کہ جاؤ فلاں شخص کو قتل کر کے مر جاؤ، موت کے بعد فرشتے تمہیں جنت میں پہنچا دیں گے۔ یہی وہ خطرناک لوگ تھے جن سے خون آشامی کا کام لیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کو جس کے قتل کا اشارہ ہوتا، وہ وہاں روپ بدل کر جاتے، آشنائی پیدا کرتے، معتمد علیہ بنتے اور موقع پاتے ہی شکار کا کام تمام کر دیتے۔ یہی وہ فدائین تھے جن کی وجہ سے دنیا بھر کے امرا اور سلاطین حسن بن صباح کے نام سے کانپتے تھے۔ ان فدائین کو بلی کا گوشت کھلایا جاتا کیونکہ بلی غضب کے وقت آپے میں نہیں رہتی اور مخالف پر سخت بے جگری سے حملہ کرتی ہے۔ حسن بن صباح قلعہ الموت میں 35 سال مقیم رہا اور پورے 29 سال اپنے فدائین کے ذریعے قتل وغارت گری کا بازار گرم کیے رکھا۔ وہ نوے سال کی عمر میں آنجہانی ہو گیا۔

تاریخ کی اہم شخصیات جو فدائین کے ہاتھوں قتل ہوئیں

حسن بن صباح کے ملحد فدائین کے ہاتھوں جو لوگ قتل ہوئے، ان میں خواجہ نظام الملک طوسی، وزیر اعظم سلطان الپ ارسلان، ملک شاہ سلجوقی، فخر الملک بن خواجہ نظام الملک طوسی، جناب شمس تبریز پیر طریقت مولانا روم، نظام الملک، مسعود بن علی وزیر خوارزم شاہ، سلطان شہاب الدین غوری اور بعض عیسائی سلاطین یورپ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اور حضرت فخر الدین رازی کو بھی قتل کی دھمکی دی تھی مگر وہ بچ گئے۔

حسن بن صباح کی موت کے بعد اس کا ایک شاگرد جس کا نام کیا بزرگ امید تھا، قلعہ الموت کا بادشاہ بنا۔ اس کے بعد اس کی نسل سے یکے بعد دیگرے سات آدمی بادشاہ بنے۔ آخری بادشاہ کا نام رکن الدین خورشاہ تھا، جس کو بغداد کی تباہی سے ایک سال قبل ہلاکو خاں نے گرفتار کر کے 655ھ میں اس فدائی دولت وحکومت کا خاتمہ کر دیا۔ مسلمان حکمران بھی باطنیوں سے بالکل غافل نہ تھے۔

علاؤ الدین خوارزم شاہ کے بیٹے جلال الدین خوارزم شاہ نے ہلاکو خاں سے پہلے اور چنگیز خاں کے بعد باطنیوں کے کئی قلعے مسمار کر دیے تھے۔ ان کی آخری تباہی ایک مملوک مجاہد حکمران محمد بیبرس کے ہاتھوں پر لکھی ہوئی تھی۔ محمد بیبرس نے تاتاریوں کو ملک شام سے نکال دیا تھا لہٰذا دولت فدائیہ کے وہ قلعے جو شام میں تھے اور تاتاریوں کی یلغار سے بچ گئے

Marfat.com

تھے، خراسان میں قلعہ الموت کی تباہی کے باوجود انہوں نے کوئی سبق حاصل نہ کیا اور سلطان محمد بیبرس کے خلاف ہر وقت ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے تھے، بالآخر 1273ء میں تاتاریوں کی یلغار کو واپس کرنے والے مجاہد نے ایک طوفانی حملے میں ان کے تمام قلعوں کو جو شام میں واقع تھے، زمین کے برابر کر دیے۔ جن لوگوں نے مقابلہ کیا نہایت ذلت سے مارے گئے جنہوں نے امان طلب کی، ان کو سلطان نے امان دے کر مختلف شہروں میں آباد کر دیا اور وہاں ان کو خاص نگرانی میں رکھ کر پُرامن زندگی بسر کرنے کا عادی بنا دیا۔ اس طرح ایک سو بیاسی سال کے بعد اس دہشت پسند گروہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

موجودہ دور کے اسمٰعیلی، باطنی اور نزاری

اسمٰعیلیوں کے کم از کم 21 فرقے ہیں، جن میں باطنیت کی صفت مشترکہ ہے، اس کے علاوہ انہوں نے باطنیت کے بہی کئی روپ دھارے ہوئے ہیں۔ ہلاکو کے ہاتھوں خورشاہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد خورشاہ نزاری کے بیٹے شمس الدین محمد کو عوام کی نظر سے چھپا دیا گیا۔ بعد ازاں اس کے جانشین اپنے عقیدے کے ساتھ صوفی اور درویشوں کی صورت میں سامنے آئے۔ انہوں نے ایران کے صفوی خاندان کے ساتھ راہ و رسم بڑھائے اور بڑے بڑے عہدے حاصل کیے۔ نادر شاہ کے زمانے میں ان کا جانشین سید علی حسن بیگ تھا۔ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں ان کا ایک اور جانشین بیٹا خلیل اللہ دوم 1232ء، 1817ء میں مارا گیا۔ اس کے بیٹے حسن علی شاہ کی شادی فتح علی شاہ قاچار شاہ ایران کی بیٹی سے ہوئی اور اسے کرمان کا گورنر مقرر کیا گیا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں بغاوت برپا ہونے کی وجہ سے اسے ہندوستان آنا پڑا۔ تاریخ اسے آغا خان اوّل کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس کا بیٹا آغا علی شاہ خاں دوم کے نام سے 1881ء میں جانشین بنا۔ 1885ء میں اس کا بیٹا سلطان محمد شاہ آغا خاں سوم کے نام سے جانشین ہوا۔ اس نے 1957ء میں وفات پائی تو اس کے پوتے کریم آغا خاں چہارم کو نزاریہ فرقہ کا انچاسواں امام چنا گیا۔ جو اب آغا خانی بھی کہلاتا ہے۔ یہ اسمٰعیلیوں کا سب سے بڑا گروہ ہے۔

Marfat.com

فتنہ تاتار..... دو کردار..... دو محاذ

علاؤ الدین خوارزم شاہ اور معتصم باللہ

ساتویں صدی ہجری میں تاتاری، جنہیں منگول بھی کہتے ہیں اور مغل بھی انہی کا نام ہے، دنیائے اسلام پر سیلاب کی طرح ٹوٹ پڑے اور عالمِ اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

حادثات چھوٹے ہوں یا بڑے، اللہ تعالیٰ نے جریدۂ عالم میں انہیں پہلے سے تحریر کر رکھا ہے اور ان کے اسباب و علل بھی بتادیئے ہیں۔ ہم جن دلخراش واقعات کا ذکر کرنے جارہے ہیں، ان کا سبب بظاہر علاؤ الدین خوارزم شاہ کی طرف سے چنگیز خاں کے سفیروں کا قتل اور ابن علقمی کی طرف سے ہلاکو خاں کو بغداد اور خلافتِ اسلامیہ کو تاخت و تاراج کرنے کی دعوت تھی لیکن یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں تھا، اسے سمجھنے کے لیے ہمیں قرآن پاک سے رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 4 سے 8 اور آیت 16 سے 17 تک جو تفسیر صاحب معارف القرآن مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے بیان کی ہے، ہم اس کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

پہلی آیات کا مفہوم یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک دفعہ شریعتِ موسوی اور دوسری دفع شریعت عیسوی کی نافرمانی کی۔ دونوں دفعہ اپنے سے کمزوروں پر بڑا زور چلاتے تھے یعنی ظلم و زیادتی کا طریقہ زندگی بن چکا تھا۔ دونوں دفعہ اللہ نے ان پر ایسے بندے مسلط کردیے جنہوں نے بنی اسرائیل کو قتل کیا۔ ان کے گھروں اور عبادت گاہوں یعنی بیت المقدس میں گھس گئے اور اسے مسمار کردیا۔ دونوں دفعہ بنی اسرائیل نے انابت اور اپنے افعال پر ندامت کا اظہار کرکے اپنے گناہوں سے استغفار کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی سابقہ حیثیت اور حالت پر بحال کردیا۔ الغرض عذاب و انجام بندوں کے اعمال سے جڑے ہوئے ہیں۔ آیات 16 تا 17 میں زوال اور نکبت کا وقت اور احوال بیان فرمایا۔ وہ یہ کہ قوم میں عیش پسند لوگوں کی کثرت کچھ خوشی کی چیز نہیں بلکہ عذابِ الٰہی کی علامت ہے۔ حق تعالیٰ جب کسی قوم پر ناراض ہوتے ہیں تو ان کے حکمران مالدار اور ایسے لوگ بنادیے جاتے ہیں جو عیش پسند اور عیاش ہوں یا حاکم نہ بھی بنیں تو ایسے لوگوں کی قوم میں کثرت کردی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ لوگ لذات و شہوات میں مست ہوکر اللہ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی ایسے اعمال شنیعہ کی راہ ہموار کرتے ہیں بالآخر ان سب پر اللہ کا عذاب آجاتا ہے۔ یہ قانونِ زوال تمام

Marfat.com

اقوام عالم پر لاگو ہوتا ہے۔اس میں کسی کی تخصیص ہے اور نہ استثنیٰ۔

یورش تاتار سے پہلے عالم اسلام بالخصوص مصر، خوارزم اور بغداد کی حالت

سلطان صلاح الدین ایوبی 509ھ میں فوت ہو گئے۔سلطان کی قائم کردہ وسیع وعریض حکومت ان کے خاندان کے افراد کی نالائقیوں کی وجہ سے کئی حصوں میں بٹ گئی اور ہر حصہ کا سردار اور حکمران دوسرے حصے کے سردار کو نیچا دکھانے میں لگ گیا۔یہاں تک کہ وہ عیسائی جن سے سلطان صلاح الدین نے بڑی مشکل اور طویل جہاد کے بعد خلاصی حاصل کی تھی اور انہیں عالم اسلام میں بے اثر کر دیا تھا۔انہی عیسائی ریاستوں سے سلطان کے وارثان ایک دوسرے کو ختم کرنے کے لیے امداد اور تعاون حاصل کرنے لگے۔اسی طوائف الملوکی خاندانی رقابتوں اور خانہ جنگیوں سے سلطنت کے زیر فرمان ممالک میں سیاسی انتشار، انتظامی ابتری اور انتہائی اخلاقی زوال رونما ہو گیا۔لوگ بے یقینی کی فضا میں زندگی گزار رہے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ فرنگیوں اور صلیبیوں کی اسلامی قلمرو کی ریاستوں پر یلغار بھی جاری رہتی تھی۔انتظامی اور اخلاقی دونوں طرح کی کوتاہیوں اور بے راہ روی کا نتیجہ وبائیں، امراض اور شدید قحط کی صورت میں ظاہر ہوا۔الملک والعادل اور الملک الافضل دونوں چچا بھتیجے کی خانہ جنگی 591ھ میں زوروں پر تھی۔اس خانہ جنگی نے مصر اور اس کی معیشت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔اس دوران دریائے نیل طغیانی سے بھی محروم رہا۔ان تمام اسباب کے یکجا ہونے سے مصر میں ایسی قحط سالی اور گرانی نے سر اٹھایا کہ الامان والحفیظ۔بے بسی اور غربت وافلاس کی یہ حالت تھی کہ الملک العادل نے صرف ایک مہینہ میں 2 لاکھ بیس ہزار افراد کو اپنے ذاتی مال سے کفن دیا۔اللہ کی سنت کے مطابق آسمانی تنبیہات کا سلسلہ بھی جاری تھا، چنانچہ 591ھ میں ایک عظیم زلزلہ آیا۔جس کی زد میں خاص طور پر ملک شام، بلاد روم اور عراق تھے۔اس کی ہلاکت آفرینی اور دہشت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ تنہا شہر نابلس اور اس کے اطراف میں 20 ہزار انسان زلزلے میں دب کر مر گئے۔یہ تباہی تو ایک شہر کے نواح کی تھی۔پورے علاقے میں اموات کی تعداد کتنی ہوگی۔اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔یہ زلزلہ اس لیے آیا تھا کہ مسلمان اللہ کے حضور گڑگڑائیں، آہ وزاری کریں اور گناہوں سے تائب ہوں۔

ادھر زلزلے کی صورت میں مسلمانوں کے لیے تنبیہ کا نقارہ بج رہا تھا۔دوسری طرف خانہ جنگی اور برادر کشی کا سلسلہ جاری تھا۔601ھ میں ایک ہی خاندان کے دو افراد قتادہ حسینی امیر مکہ اور سالم حسینی امیر مدینہ میں سخت جنگ ہوئی۔603ھ میں غوریوں اور خوارزم شاہیوں کی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ان جنگوں میں بھی مسلمانوں نے مسلمانوں کا ہی خون بہایا۔انہی دنوں فرنگی فوجیں مسلمانوں کی سازش اور کمزوری کی وجہ سے دمیاط میں داخل ہو گئیں اور عالم اسلام میں انہیں کوئی روکنے والا نہ تھا۔

ادھر مرکز خلافت بغداد میں خلیفہ ناصر باللہ کی حکومت کا یہ حال تھا کہ خلافت کا ظاہری کروفر قائم رکھنے کے لیے بے دریغ دولت کا اسراف کیا جاتا۔عام لوگوں کی جائیدادوں پر قبضہ کر لیا جاتا اور اپنے مصاحبین اور عام ملازمین کی دولت کو بڑھنے اور بڑھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا جاتا۔ان پڑھ اور جاہل لوگ فراش اور باورچی کی صورت میں خلیفہ کے محل میں داخل ہوتے اور چند برسوں میں ان کی دولت لاکھوں دینار تک پہنچ جاتی۔عام فراش تک اپنے عیش پسند رئیس کو 3 ہزار دینار

Marfat.com

کا پرندہ موصل سے لا کر بطورِ تحفہ پیش کرتا لیکن سلطنت کے سب سے بڑے مدرسہ مستنصریہ کے اعلیٰ درجے کے استاد کی تنخواہ چند دینار سے زیادہ نہ تھی۔

عید اور جشنِ جانشینی کے موقع پر شاہانہ جلوس نکالے جاتے۔ مخلوقِ خدا غربت و افلاس سے کراہ رہی ہوتی لیکن ان جلوسوں پر لاکھوں دینار خرچ کر دیے جاتے۔ جلوس صبح شروع ہوتے اور عشاء کی نماز سے بھی آگے چلے جاتے۔ لوگ عید کی نماز عشاء کے بعد قضا کر کے پڑھتے تو باقی نمازوں کا کیا کہنا، نہ عوام خدا کو یاد کرتے اور نہ ہی صاحبانِ جلوس کو اپنی جھوٹی شان و شوکت سے فرصت تھی۔

خلیفہ کے لیے زمین بوسی کا رواج تھا، اسی طرح آستانہ بوسی اور زمین پر ناک رکھنے کا بھی دستور تھا اور اس میں کسی کو کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ جائیدادوں کی ضبطی کے واقعات بکثرت پائے جاتے تھے۔ رشوت کی گرم بازاری تھی۔ باطنیوں، عیاروں اور ٹھگوں کی سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں۔ اخلاقی بے راہ روی بہت بڑھ گئی تھی۔ دل بہلانے والے مشاغل کا زور تھا۔ مغنیات کی کثرت تھی اور دولت جمع کرنے کا شوق حد سے فزوں تھا۔

دارالخلافہ بغداد میں ایسا انتشار برپا رہا کہ 640ھ سے 643ھ تک خلفاء اسلام کے قدیم اور مسلسل معمول کے خلاف خلیفہ کی طرف سے حج کا انتظام ہوا نہ غلافِ کعبہ بدلا گیا۔ اکیس (21) دن تک بیت اللہ شریف کی دیواریں بالکل ننگی رہیں، لوگوں نے اس سے بدگمانی لی۔

575ھ میں ناصر الدین باللہ تختِ حکومت پر بیٹھا۔ اسے چھیالیس (46) سال حکومت کرنے کا موقع ملا۔ عجیب متلون مزاج آدمی تھا۔ آج کوئی بات کرتا کل اس کے الٹ کر جاتا۔ اسے دولت جمع کرنے کی حد درجہ ہوس تھی۔ لوگوں کی جائیدادیں سب سے زیادہ اسی کے دور میں ضبط ہوئیں اور انتہائی بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اس نے چنگیز خاں کو علاؤ الدین خوارزم شاہ پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔

یہ وہ حالات تھے جن میں عالمِ اسلام زندگی بسر کر رہا تھا۔ ان حالات پر دوبارہ نظر ڈالیں آپ کو اوپر بیان کی گئی سورہ بنی اسرائیل کی آیات کا نقشہ سامنے آ جائے گا۔ یہ حالات جو اُمتِ مسلمہ کے لیے تنبیہ نہیں استیصالی عتاب کا مطالبہ کر رہے تھے۔

عالمِ اسلام میں تاتاریوں کی یلغار کا فوری محرک یہ واقع ہوا کہ چنگیز خان نے خوارزم شاہ کو پیغام بھیجا کہ میں ایک وسیع سلطنت کا فرمانروا ہوں اور آپ بھی ایک وسیع قلمرو کے تاجدار ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم دونوں تجارتی تعلقات قائم کریں۔ ہمارے تاجر بے خوف و خطر آپ کے قلمرو میں جائیں اور یہاں کی مخصوص پیداوار اور مال وہاں فروخت کریں اور آپ کے تاجر اطمینان کے ساتھ ہمارے ملک میں آئیں اور وہاں کا مال فروخت کر لیا کریں۔ خوارزم شاہ نے اس تجویز کو منظور کر لیا اور تجارتی تعلقات قائم ہو گئے۔ تجارتی قافلے بے تکلف دونوں ملکوں میں آنے جانے لگے۔ اس کے بعد کیا پیش آیا، جس سے عالمِ اسلام اچانک خون کے سمندر میں ڈوب گیا۔ اس تفصیل کے متعلق مغربی اور اسلامی مورخین بالکل یک زبان ہیں۔ مغربی مصنف لیمب اپنی کتاب "چنگیز خاں" میں لکھتا ہے:

لیکن تجارت کے تعلقات جو چنگیز خان نے قائم کیے تھے، اتفاق سے یک لخت ختم ہو گئے اور یہ واقعہ اس طرح پیش آیا

Marfat.com

کہ قراقرم سے تاجروں کا ایک قافلہ مغرب کو آرہا تھا کہ راستہ میں انزار کے حاکم نے، جس کا نام انیل حق تھا، قافلہ کے تمام آدمیوں کو گرفتار کرلیا اور اس کی اطلاع اپنے آقا یعنی علاؤ الدین خوارزم شاہ کو اس طرح دی گویا اس قافلے میں جاسوس موجود ہیں، انیل حق کا خیال قرین عقل تھا۔

حاکم انزار سے اطلاع کے آتے ہی سلطان علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ نے بے سوچے سمجھے حکم دے دیا کہ قافلے میں موجود کل تاجروں کو ہلاک کر دیا جائے، چنانچہ اس حکم پر عمل ہوا اور قراقرم سے آئے ہوئے تمام تاجر قتل کر دیئے گئے۔ اس کی اطلاع جب چنگیز خان کو ہوئی تو اس نے فوراً اپنے سفیر بھیج کر خوارزم شاہ سے اس واقعہ کی شکایت کی۔ سلطان علاؤ الدین نے چنگیز کے سفیروں کو بھی قتل کر دیا اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے، ان کی ڈاڑھیاں جلوا دیں۔ اس سفارت کے بچ جانے والے لوگوں نے چنگیز خاں کے پاس پہنچ کر اس ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ دشتِ گوبی کے خاں کے ایلچی کو مار ڈالنا ایسا جرم تھا جسے بغیر سزا کے چھوڑ دینا ناممکن تھا۔ یہ حرکت ایسی تھی جس کا بدلہ لینا مغلوں کی گذشتہ روایات کے لحاظ سے ضروری تھا۔ چنگیز خان نے کہا جس طرح دو آفتاب نہیں رہ سکتے اس طرح زمین پر دو خان نہیں رہ سکتے۔

علاؤ الدین خوارزم شاہ کی سلطنت، حالات وواقعات (تاتاری (منگول) یلغار سے پہلے)

مورخین علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ کی سیرت واخلاق میں کسی بڑی کمزوری اور قابل ذکر عیب کی طرف اشارہ نہیں کرتے بلکہ اس کی دینداری اور خوش اعتقادی اور شجاعت وصلابت کا عام طور پر اعتراف کرتے ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ساری صلاحیتیں اور طاقتیں ان چھوٹی اسلامی ریاستوں کو ختم کرنے میں صرف ہوئیں جو اس وسیع مشرقی حصہ میں کہیں واقع تھیں۔ ایک طرف شمال مغرب میں اس نے سلجوقیوں کو ان کی آخری حدود تک پسپا ہونے پر مجبور کیا، دوسری طرف مغرب اور جنوب میں وہ ہمیشہ غوریوں سے نبرد آزما رہا اور ان کو بھی ایک محدود حصہ میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا۔ ایران اور ترکستان کی سپہ گری کا بہترین عنصر اس غیر مختتم سلسلہ جنگ میں حصہ لینے کی وجہ سے تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ ان زرخیز اور مرم خیز ممالک کے شہروں اور قصبات کی فضا اور ذہن پر جنگ ہر وقت چھائی رہتی تھی۔ مفتوحہ ممالک کی شاداب اور حاصل خیز زمینوں کی پیداوار اور دست کاروں اور اہل صنعت سلطنت وطاقت کے اس مرکز میں جمع ہو گئے تھے، تمدن اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا، یوں سمجھئے فراغت وامارت اور فتوحات کے سارے لوازم اکٹھے ہو گئے تھے۔

خوارزم شاہی سلاطین سے اس موقع پر وہی غلطی ہوئی جو سپین کے عرب فرمانرواؤں سے ہوئی تھی اور جن کو الٰہی قانون مکافات نے معاف نہیں کیا یعنی یہ کہ انہوں نے ساری طاقت سلطنت کی توسیع، استحکام اور حریفوں کی سرکوبی میں صرف کر دی اور اس انسانی آبادی میں جو ان کی سرحدوں سے متصل تھی اور بجائے خود ایک دنیا تھی، تبلیغ اسلام اور ان تک خدا کا آخری پیغام پہنچانے کی کوئی فکر نہیں کی۔ جذبۂ دینی سے قطع نظر سیاسی فراست اور دور بینی کا بھی تقاضا تھا کہ وہ اس وسیع انسانی آبادی کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرتے اور اس طرح ہمیشہ اس خطرہ سے محفوظ ہو جاتے جو نہ صرف ان کو بلکہ پورے مسلمانوں کو پیش آیا۔

خوارزم پر تاتاریوں کی یلغار سے پہلے کچھ ایسے واقعات پیش آئے، جو خلیفہ ناصر الدین باللہ اور علاؤ الدین خوارزم شاہ اور

چنگیز خاں کے ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔خوارزم کو خیوہ بھی کہتے ہیں جو آج کل روس میں ہے۔

ناصر الدین باللہ چالیس سال سے زیادہ تخت بغداد پر متمکن رہا لیکن فوجی طور پر اتنا طاقتور نہ تھا کہ علاؤالدین خوارزم شاہ کی وسعت پسندی اور حرص کو لگام ڈال سکے۔جب ان دونوں کے درمیان ناچاقی بہت بڑھ گئی تو خوارزم شاہ نے بغداد پر چڑھائی کا ارادہ کرلیا۔جس پر ناصر الدین باللہ نے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کو سفیر بنا کر بھیجا۔شیخ ممدوح نے خوارزم شاہ کے دربار میں مناسب تقریر کی اور اس کو بغداد پر چڑھائی کرنے سے باز رہنے کی نصیحت کی۔خوارزم شاہ نے کہا: شیخ صاحب آپ عباسیوں کے بڑے مداح اور خیر خواہ ہیں لہٰذا آپ بغداد واپس تشریف لے جائیں۔میں تو علویوں کو عباسیوں پر ترجیح دیتا ہوں اور عباسی خلافت مٹا کر علویوں کی امداد کرنا چاہتا ہوں۔میں ضرور بغداد پر چڑھائی کروں گا۔

علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کے لیے تین بزرگوں کی بددعا

شیخ شہاب الدین ناکام واپس آئے اور خوارزم شاہ کے لیے بددعا کی کہ الٰہی اس پر ظالموں کو مسلط کردے۔خوارزم شاہ نے فوج لے کر کوچ کیا مگر راستے میں اس قدر برف باری ہوئی کہ فوج کے لیے راستہ بند ہوگیا اور سخت مجبوری کے عالم میں سلطان نے چڑھائی کا معاملہ دوسرے سال پر ملتوی کردیا اور خود راستہ سے ہی لوٹ گیا۔ایک روز عالم بدمستی میں حکم دیا کہ حضرت شیخ مجد الدین کو قتل کردو۔چنانچہ وہ شہید کردیے گئے۔اگلے دن جب ہوش آیا تو اپنی اس حرکت پر پشیمان ہو کر خوں بہا حضرت نجم الدین کبریٰ کی خدمت میں بھیجا۔انہوں نے کہا: شیخ شہید کا خون بہا تو تیرا اور میرا سر ہے مگر اب ہزارہا مسلمانوں کے سر اس خون بہا میں کاٹے جائیں گے۔لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی اور حضرت شیخ مجد الدین اور نجم الدین کی بددعاؤں کا نتیجہ تھا کہ خوارزم شاہ پر تاتاری یلغار کی صورت میں آفت نازل ہوئی۔

ایک اور واقعہ جس سے خلیفہ ناصر الدین باللہ کی بےحمیتی چنگیز خاں کی جواں مردی اور عہد کی پاسداری کا ثبوت ملتا ہے،وہ بھی نذر قارئین کرتے ہیں۔خوارزم شاہ اور چنگیز خاں کے درمیان تجارتی معاہدے کے بعد بڑے عجیب طریقے سے ناصر الدین باللہ نے ایک پیغام چنگیز خاں کو بھیجا۔وہ اس طرح کہ ایک شخص کا سر منڈھا کر ایک خط چنگیز خاں کے نام نقش کیا گیا۔وہ اس طرح کہ جلد میں خط کا مضمون کھود کر اس میں سُرمہ بھر دیا گیا۔اس عجیب وغریب خط میں لکھا تھا کہ تم سلطان محمد خوارزم پر حملہ کرو اور ہم کو اپنا ہمدرد تصور کرو۔اس طرح جب منڈھے سر پر خط لکھا گیا تو چند روز انتظار کے بعد بال سر پر آئے اور اس شخص کو چنگیز خاں کی طرف روانہ کردیا گیا۔جب وہ شخص چنگیز خاں کے پاس پہنچا تو اس نے کہا: میں خلیفہ کا ایلچی ہوں اور خلیفہ کا پیغام میرے سر پر منقوش ہے۔میرے سر کے بال منڈھ دو اور خلیفہ کا پیغام پڑھ لو،چنانچہ سر منڈھانے کے بعد خلیفہ کا پیغام پڑھا اور ایلچی سے معذرت کی کہ میں صلح کر چکا ہوں،اس لیے اپنے عہد کے خلاف لڑائی اور چڑھائی خوارزم شاہ پر نہیں کرسکتا چنانچہ خلیفہ کا ایلچی سر منڈا کر ناکام واپس چلا آیا۔

چنگیز خاں اور خوارزم شاہ میدانِ جنگ میں

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ خوارزم شاہ نے چنگیز خاں کے اصل قاصد کو قتل کرنے کے بعد اس کے باقی ساتھیوں کی

Marfat.com

ڈاڑھیاں جلادی تھیں۔مزید برآں ان کے ہاتھ یہ پیغام بھی بھیجا کہ میں تمہارے مقابلے میں آرہا ہوں۔اگر تم دنیا کے آخری حصہ میں چلے جاؤ گے تو تم کو نہ چھوڑوں گا۔تمہارے قاصد کو جو سزا دی ہے وہی تم کو بھی دوں گا۔یہ پیغام چنگیز خاں کے لیے جنگ کا الٹی میٹم تھا۔

اتفاق سے تاتاریوں کی ایک فوج ایک ترک فرماں روا توق خان کے مقابلے کے لیے گئی ہوئی تھی۔خوارزم شاہ کو اس کی خبر ہوگئی تو وہ اس کے مقابلے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔اس وقت تاتاری مطلوبہ مہم سر کر کے واپس جا رہے تھے تو راستے میں خوارزم شاہ سے آمنا سامنا ہوگیا۔تاتاریوں نے اس کو سمجھایا کہ ہم ایک دوسری مہم پر تھے۔تمہارے مقابلے کے لیے نہیں بھیجے گئے تھے۔اس لیے ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔خوارزم شاہ نے کوئی پروانہ کی اور دونوں فریق جنگ میں کود پڑے مگر ایک ہی معرکہ کے بعد دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔علاوہ ازیں الٹی میٹم کے بعد خوارزم شاہ نے اہم سرحدی تاتاری علاقے پر فوج کشی کر دی۔اتفاق سے اس وقت یہاں کے سب مرد چنگیز خاں کے لڑکے کے ساتھ ترک فرمانروا کشکو خان کے مقابلے میں چلے گئے ہوئے تھے۔صرف عورتیں اور بچے رہ گئے تھے۔خوارزم شاہ نے سب کو گرفتار کرلیا۔اس پر چنگیز خاں کا لڑکا کشکو خاں مہم سے فارغ ہو کر لوٹ چکا تھا۔راستہ میں اس کو خوارزم شاہ کی فوج کشی کا حال معلوم ہوا۔وہ فوراً اس کی تلاش میں پہنچا۔خوارزم شاہ موجود تھا۔دونوں میں جنگ ہوئی اور تین دن کے بعد خوارزم شاہ لوٹ گیا۔اس دوران چنگیز خاں ایک لشکر جرار لے کر انزار پہنچ گیا اور یہاں سے خوارزمی حکومت کے مختلف حصوں پر حملہ کے لیے علیحدہ علیحدہ امرا مامور کیے اور اپنے لڑکوں چغتائی اور اوگتائی کو انزار کے محاصرے پر متعین کیا۔اپنے تیسرے بیٹے نوشی اور تاتاری امرا کو ترکستان کے مختلف علاقوں کی جانب روانہ کیا اور خود بخارا کی طرف بڑھا۔چغتائی اور اوگتائی نے پانچ مہینے کے محاصرے کے بعد انزار فتح کرلیا اور انیل جق کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔اس کے بعد یہی لشکر چھوٹے چھوٹے شہروں کو برباد کرتا ہوا اقرام لوٹ گیا۔

چنگیز خاں نواح بخارا کے شہروں کو تاخت وتاراج کرتا ہوا محرم 617ھ میں بخارا پہنچا اور اس کا نہایت سخت محاصرہ کرلیا۔خوارزمی فوج اور اہلِ بخارا نے چار دن مزاحمت کی لیکن تاتاری سیلاب کو روکنا ان کے بس سے باہر تھا۔بعض افسروں کی ہمت بھی چھوٹ گئی۔اس کے بعد بخارا کے علما اور عمائد چنگیز خاں کے پاس جا کر امان کے طالب ہوئے جسے اس نے منظور کرلیا۔بخارا والوں نے شہر کے دروازے کھول دیئے اور تاتاری فوج بخارا میں داخل ہوگئی۔یوں تو چنگیز کے لشکر نے جو شہر بھی فتح کیا اس کے باشندوں کو تہ تیغ کیا،انہیں ذلیل ورسوا کیا،ہم صرف بخارا کی تباہی کا حال قلمبند کرتے ہیں۔

بخارا کی مسجد بڑی عظیم الشان تھی،چنگیز نے اس کو دیکھ کر پوچھا یہ شاہی محل ہے؟لوگوں نے جواب دیا:یہ اللہ کا گھر ہے۔چنگیز نے لوگوں کو دروازے کھولنے کا حکم دیا۔اس کے بعد تاتاری غلہ کے گوداموں پر ٹوٹ پڑے اور شہر بھر کا غلہ جمع کر کے کلام مجید کے صندوقوں کو توڑ کر کلام مجید پھینک دیے اور صندوقوں میں گھوڑوں کو چارہ ڈال دیا اور علماء ومشائخ کو ان کی نگرانی پر مقرر کر دیا اور شہر کی پوری آبادی کو شہر سے باہر لے جا کر اربابِ ثروت سے دولت نکلوائی۔خوارزمی فوج کا ایک حصہ قلعہ میں رہ گیا تھا جو تاتاریوں پر حملہ کرتا رہتا تھا۔اس لیے چنگیز نے شہر میں آگ لگوا دی اور سارا شہر جل کر خاک ہوگیا۔صرف جامع مسجد کی عمارت باقی رہ گئی۔قلعہ کی فوج نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔اس میں بہت سے تاتاری مارے

گئے بالآخر تاتاریوں نے قلعہ فتح کر لیا۔ قلعہ فتح کرنے کے بعد انہوں نے شہر کے ان تمام باشندوں کو جو کام کے لائق تھے، جنگی کاموں کے لیے چھانٹ لیا۔ باقی ماندہ کو چھوڑ دیا اور بخارا بالکل ویران ہو گیا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ بخارا پر قبضہ کے بعد جو باشندے بچ رہے تھے تاتاریوں نے ان کو قتل کر دیا یا لونڈی غلام بنالیا۔ بخارا کی تباہی اور قتل عام اور لوگوں کی گریہ زاری بڑا دردناک منظر پیش کر رہے تھے۔ اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ تاتاری سرعام عورتوں کی بے حرمتی کر رہے تھے اور کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ بخارا کے سارے مدارس جل کر ڈھیر ہو گئے۔

اس کے بعد چنگیز خاں نے سمرقند کا رخ کیا۔ شہر کے گرد بہت بڑی خندق بنی ہوئی تھی، اسے بھی چنگیزی لشکر عبور کر کے سمرقند پر قابض ہو گیا اور سمرقند کے ساتھ بھی بخارا والا برتاؤ کیا۔ خوارزم شاہ بلخ میں تاتاریوں کے مقابلے کی تدبیروں میں مصروف تھا اور امرا کے مشورہ سے وہ جنگ کی تیاری کے لیے بخارا سے عراق روانہ ہو گیا۔ ترمذ کے قریب پہنچ کر خبر ملی کہ سمرقند اور بخارا پر تاتاریوں کا قبضہ ہو چکا ہے تو وہ نیشاپور چلا گیا۔ یہی اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی، وہ موت سے ڈرتا ہوا تاتاریوں کے آگے بھاگتا رہا اور موت اس کا پیچھا کرتی رہی۔

نیشاپور پہنچ کر ابھی آرام بھی نہیں کر پایا تھا کہ مخبروں نے خبر دی کہ خوارزم شاہ کی تلاش میں مقرر کیے گئے فوجی دستے قریب پہنچ گئے ہیں تو خوارزم شاہ نیشاپور سے عراق چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ تاتاری تعاقب میں آرہے ہیں، اس لیے خوارزم شاہ وہاں بھی نہ ٹھہر سکا اور قزوین ہوتا ہوا ماژندران نکل گیا۔ تاتاری برابر تعاقب کر رہے تھے۔ سلطان نے جب دیکھا کہ تاتاریوں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا ہے، وہ جزیرہ آبسکون میں چلا گیا۔ پھر قریب ہی ایک دوسرے جزیرے میں منتقل ہو گیا۔ آبسکون کو چھوڑتے ہی تاتاری یہاں پہنچ گئے لیکن سلطان کو نہ پا کر واپس چلے گئے اور واپسی پر دمشق میں سلطان کے اہل و عیال کو جو ماژندران کے قلعے میں تھے، قلعہ پر قبضہ کر کے قید کر لیا۔ مسلسل سفر اور گرم و سرد آب و ہوا کے اثر سے سلطان ذات الجنب میں مبتلا ہو گیا اور جزیرہ میں جانے کے چند دن بعد 617ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس غریب الوطنی میں کفن بھی میسر نہ آسکا جو کپڑے جسم پر تھے، انہی میں دفن کر دیا گیا۔

قرآن پاک بار بار اعلان کرتا ہے کہ جو واقعہ بھی کسی فرد بشر یا قوم کے ساتھ اس دنیا میں رونما ہوتا ہے، اس کی خبر ہمیں پہلے سے ہوتی ہے اور اس کی خبر رکھنا ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ علاؤ الدین خوارزم شاہ نے 21 سال حکومت کی اور اس کے تمام کروفر اور دنیاوی عظمتوں کے باوجود اللہ کریم کا علم قدیم جو کچھ جانتا تھا وہ ہو کر رہا۔

سلطان علاؤ الدین کے بعد اس کے بیٹوں نے خوارزم میں رہ کر دوبارہ اپنی سلطنت کو سنبھالنے کی کوشش کی کیونکہ تاتاری اپنے پیچھے علاؤ الدین خوارزم شاہ کی تباہ حال سلطنت چھوڑ کر واپس جا چکے تھے۔ لیکن جلد ہی بھائیوں میں اختلاف پیدا ہو گیا، یہاں تک کہ سلطان کے بڑے بیٹے جلال الدین خوارزم شاہ پر قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا، وہ اس حملہ میں بچ گیا لیکن اسے خوارزم چھوڑنا پڑا۔ خوارزم کو خالی دیکھ کر تاتاریوں نے حملہ کر دیا بالآخر خوارزم پر قبضہ کر کے اس کے ہر محلہ میں آگ لگا دی اور ساری آبادی کو شہر سے باہر لے آئے۔ ایک لاکھ اہلِ حرفہ افراد کو تاتار بھیجنے کے لیے چھانٹ لیا۔ باقی ماندہ آدمیوں کو فوج میں تقسیم کر دیا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ شہر کو لوٹنے کے بعد دریا کے بند کو جس کے ذریعے شہر میں پانی آتا تھا، کھول دیا

اور سارا شہر مع آبادی تہہ آب آ گیا۔ اس کے بعد ترمذ، بدخشاں اور بلخ کی پوری آبادی قتل کر کے شہر زمین کے برابر کر دیئے۔ ایک اور شہر بامیان جہاں چنگیز خاں کا ایک لڑکا زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے انتقام میں بامیان کا نام ونشان صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ یہاں تک کہ بامیان کے جانوروں کو بھی زندہ نہ چھوڑا گیا۔

جلال الدین خوارزم شاہ فرزند علاؤ الدین خوارزم شاہ غزنی میں مقیم تھا۔ تاتاری لشکر چنگیز خاں کی قیادت میں غزنی پہنچا تو پتہ چلا کہ جلال الدین ہندوستان جانے کے ارادے سے غزنی چھوڑ چکا ہے۔ اتفاق سے جلال الدین دریائے سندھ کے ساحل پر موجود تھا۔ چنگیز خاں نے اس کو گھیر لیا۔ اس نے بڑے تھوڑے سے لشکر کے ساتھ چنگیزی لشکر کا مقابلہ کیا۔ تین طرف سے چنگیزی لشکر کمان کی صورت میں موجود تھا۔ چوتھی طرف دریائے سندھ تھا۔ جلال الدین نے بے خطیر گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا اور بڑی تیزی سے تیرتا ہوا نکل گیا۔ اس دلیری پر چنگیز خاں بھی حیران رہ گیا۔ اس نے اپنے لڑکوں کو مخاطب کر کے کہا کہ ہر باپ کا بیٹا ایسا ہی دلیر ہونا چاہیے۔ جلال الدین کے پانچ بچے پہلے ہی اس سے بچھڑ چکے تھے۔ چنگیز نے انہیں گرفتار کر کے اولاد ذکور جن میں شیر خوار بچے بھی تھے، قتل کر دیا۔ جلال الدین کے ہندوستان چلے جانے کے بعد غزنی اور غور بالکل خالی تھے۔ چنگیز خان نے حسب عادت ان شہروں کو بھی تباہ وبرباد کر دیا اور جلال الدین کے تعاقب میں ایک فوج بھیجی۔ اس نے پنجاب تک پیچھا کیا لیکن جلال الدین ہاتھ نہ آیا۔ تاتاری پنجاب اور ملتان کو تاخت وتاراج کرتے ہوئے لوٹ گئے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے چنگیزی کسی ملک کو تاراج کر کے وہاں ٹھہرتے نہیں تھے لہٰذا ان کے جانے کے بعد سابق حکمرانوں نے اپنی رعایا کا خیال کیا اور دوبارہ اپنی حکومتوں کو بحال کیا۔ یہ دیکھ کر جلال الدین ہندوستان سے کرمان ہوتا ہوا عراق پہنچا، وہاں اپنے بھائی کو اپنی ماتحتی میں عراق کا حاکم مقرر کیا۔ اس کے بعد اس نے وہی اپنے والد والا عمل شروع کر دیا اور بلاوجہ حکومتِ عباسیہ کے علاقے خوزستان پر فوج کشی کر دی اور علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد آذربائیجان پر یلغار کی اور اس طرح دونوں علاقوں میں تباہی پھیلا کر انہیں اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔

جلال الدین کے زمانے میں ایک علاقہ اسلامی قلمرو کی سرحد پر تھا جسے گرجستان کہتے تھے، گرجستان کے باشندے تاتاریوں سے بھی گئے گزرے تھے اور آئے دن مسلمان ریاستوں کی سرحدوں پر یلغار کرتے اور لوٹ مار کر کے چلے جاتے اور قتل وغارت کا بازار گرم کرتے۔ جلال الدین نے ان پر فوج کشی کی۔ اس فوج کشی کا سلسلہ ناصر الدین باللہ کے عہد سے شروع ہوا اور اس کے بیٹے ظاہر باللہ تک جاری رہا۔ ان لڑائیوں میں جلال الدین کی فوج نے گرجوں کو ہزاروں کی تعداد میں قتل کیا۔ ان کے مرکز تفلیس پر قبضہ کر کے ان کی طاقت کو بالکل توڑ دیا۔ جلال الدین کے اس کارنامے سے ساری اسلامی دنیا اس کی شکر گزار ہوئی۔

گرجستان کی فتح کے بعد جلال الدین اور فرمانروائے خلاط کے درمیان بڑی خون ریز لڑائیاں ہوئیں۔ اس وقت ملک اشرف العادل خلاط کا حکمران تھا۔ جلال الدین نے 626ھ میں خلاط پر قبضہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بالفاظ دیگر خلاط کے ساتھ چنگیزیوں سے بھی بڑھ کر درندگی کا مظاہرہ کیا۔ ملک اشرف نے ایشیائے کوچک کے سلجوقی فرمانروا کی مدد سے خلاط واپس لے لیا جس سے جلال الدین کی طاقت کمزوری میں بدل گئی۔

624ھ میں چنگیز خاں مر گیا اور اس کا لڑکا اوگتائی خان تخت نشین ہوا جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ جلال الدین ہندوستان چلا گیا تھا۔ ہندوستان سے واپسی کے بعد اس کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی۔ اس نے عراق، فارس، گرجستان، آذربائیجان اور خلاط وغیرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس لیے اوگتائی نے اس کے انسداد کی طرف توجہ کی اور اپنے ایک سردار کو 80 ہزار فوج کے ساتھ جلال الدین کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ جلال الدین نے ان تمام حکمرانوں سے امداد کی درخواست کی جن کے ساتھ زمانہ قریب میں لڑائیاں لڑ چکا تھا۔ کسی نے بھی اس کی مدد کی حامی نہ بھری۔ جلال الدین خلاط ہی میں تھا کہ تاتاری پہنچ گئے۔ وہ وہاں سے دیار بکر روانہ ہو گیا۔ ابھی چند منزل ہی طے کر پایا تھا کہ تاتاری سر پر پہنچ گئے اور جلال الدین کی قیام گاہ پر حملہ کر دیا۔ جلال الدین اس وقت نشہ کی حالت میں تھا۔ اس کے ساتھی نے ہوش دلایا۔ ساتھی سے کہا کہ تم تاتاری لشکر کو مصروف رکھو اور مجھے نکل جانے دو، چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن تاتاری مستقل تعاقب میں تھے۔ جلال الدین بالآخر کردستان کی طرف نکل گیا۔ جہاں کسی کردنے اس کا سارا سامان لوٹ کر قتل کر دیا اور اس طرح خوارزم شاہی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور جلال الدین بھی اپنے باپ کی طرح غریب الوطنی اور کسمپرسی کی موت مر گیا، رہے نام اللہ کا!

سقوطِ بغداد کے اہم کردار اور ہلاکو خان

جمادی الثانی 640ھ مستنصر باللہ کا بیٹا ابو احمد عبداللہ تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔ اس کو امیر دیوار اور امیر شرابی اور دوسرے اراکین دولت نے خلیفہ بنایا اور اس نے معتصم باللہ کا لقب اختیار کیا۔ اہلیت کے لحاظ سے مستنصر کا بھائی خفاجی سب سے زیادہ مستحق اقتدار تھا لیکن یہ انتخاب سراسر امرا اور اراکین سلطنت کی مفاد پرستی کا مظہر تھا۔ معتصم باللہ ایک لونڈی ہاجرہ کے بطن سے تھا۔ معتصم میں ذاتی خوبیاں بہت تھیں۔ نیک فطرت، نرم خو، شیریں زبان، پاک باز و خوش اخلاق تھا۔ تخت گیری مطلق نہ تھی لیکن جہانبانی کے اوصاف سے تہی دامن تھا۔ طبیعت کا کمزور، رائے کا کچا، امور مملکت سے ناآشنا اور بے رعب تھا۔ اس کا سارا وقت گانے بجانے، ہنسی مذاق اور تفریحی مشاغل میں گزرتا تھا۔ علم دین سے بہت کم واقفیت اور مطالعہ کا ذوق اس سے بھی کم تھا۔ اس کے مصاحب اور حاشیہ نشین جاہل عوام تھے۔ اس کا وزیر مدارالمہام موید ین۔ بن علقمی بڑا عاقل اور فرزانہ تھا لیکن اس کی طینت خراب تھی۔ بڑا بے فیض اور ناقابل اعتماد تھا۔ اس کا کام صرف عمال کی تنزلی اور گرفتاری تھی۔ معتصم کی کمزور طبیعت کی وجہ سے ابن علقمی اس پر بہت حاوی ہو گیا تھا۔ معتصم دولت جمع کرنے کا بڑا دلدادہ تھا۔ ابن علقمی نے اس کی اس کمزوری سے عباسی خلافت کو تباہ کرنے کا کام شروع کیا اور بالآخر خلافت کو مٹا کر رہا۔

معتصم باللہ کی محافل عیش و نشاط اور دولت کے حوض

معتصم باللہ کی شکل میں دولتِ عباسیہ کا دم واپسیں تھا۔ اس کی حیثیت ایک گدی نشین سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے باوجود عیدین کے موقعوں پر باہر نکلتا تو اس کا جلوس دیدنی ہوتا۔ اس جلوس کے کروفر، فوجیوں اور چوبداروں کے زرق برق لباس اور اس جشن پر اخراجات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ دنیا جہان کی دولت اس کے پاس ہے اور یہ بندہ اسے بے دریغ خرچ کیے جا رہا ہے شاید یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ خلیفہ معتصم اس وقت بھی خوش آواز گویوں کا گانا سننے میں، حسین و جمیل کنیزوں کی محبت اور بے ریش لڑکوں کے ساتھ نشاط میں مشغول رہا جب ہلاکو کی فوج بغداد کے دروازوں تک

Marfat.com

آچکی تھی اور اس کا وزیر ابن علقمی خلافت کی بربادی کے لیے تاتاریوں کے ساتھ نامہ مدو پیام میں مصروف تھا۔

معتصم کے پردادا ناصر الدین باللہ نے دو بڑے حوض تیار کرائے تھے جنہیں اس نے خالص سونے اور اشرفیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ خلیفہ ناصر کے مرنے کے بعد اس کا پوتا مستنصر باللہ ایک روز اپنے محرم راز خادم کے ساتھ ان دو حوضوں کے پاس گیا اور کہا کہ میں اتنی زندگی چاہتا ہوں کہ اس تمام دولت کو خرچ کر سکوں۔ خادم ہنس پڑا۔ مستنصر نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ ایک روز میں آپ کے دادا ناصر الدین باللہ کے ساتھ یہاں آیا تو حوضوں میں سے ایک کے بھرنے میں کسر باقی تھی تو انہوں نے کہا کہ میں اس قدر مہلت زندگی چاہتا ہوں کہ اس حوض کو بھی مال وزر سے بھر سکوں۔ ان دونوں خواہشوں کے درمیان دلچسپ تفاوت پر مجھے تعجب ہوا۔ مستنصر نے تو وہ دولت واقعی بڑے اچھے کاموں میں صرف کی اور سب سے اعلیٰ کام مدرسہ مستنصریہ کی تعمیر تھی۔ معتصم جب حکمران ہوا تو اس نے دوبارہ دونوں حوضوں کو سونے سے بھر دیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ سقوطِ بغداد کے بعد صرف معتصم کے محل سے جو مال تاتاریوں کے ہاتھ لگا، اسے اپنی قیام گاہ تک پہنچانے کے لیے چودہ ہزار اونٹوں کی ضرورت پیش آئی۔ قیمتی زر و جواہر سے مزین لباسوں کے گودام بھرے ہوئے تھے جو تاتاریوں کے کام آئے۔ معتصم کے محل سے چاندی کے اتنے ظروف تاتاریوں کے ہاتھ لگے کہ انہیں جب بازار دیا گیا تو چاندی کا نرخ ارزاں ہو گیا۔

ابن علقمی نے ایک سازش کے تحت فوج کی کمی کا انتظام کیا تھا تاکہ ہلاکو خاں کو بغداد تباہ کرنے میں کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس عمل کو مکمل کرنے کے لیے جہاں علقمی کی سازش کارفرما تھی، وہیں معتصم کا بخل اور دولت کی حرص نے بھی اپنا کام دکھایا چنانچہ معتصم فوج کی تعداد میں کمی کرنے پر اس لیے راضی ہو گیا کہ بچائی ہوئی رقم سے خزانوں کے تالاب بھرے جا سکیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فوج کے سپاہی شہروں اور بازاروں میں بھیک مانگتے نظر آئے۔

معتصم اور اس کے حواریوں کی یہ ذہنیت تھی جس نے ہلاکو خاں کا کام آسان کر دیا۔ اب ہم بغداد کے سقوط اور معتصم کے خاندان کی تباہی کی لحہ بہ لحہ داستان قارئین کی نذر کرتے ہیں۔ یہ سارے مناظر بڑے عبرتناک تھے۔ ہمارے قاری کو یہاں رک کر سوچنا ہو گا کہ سب سے بڑی اور اقتدار والی ذات اللہ کی ہے۔ اس کی زمین پر صرف اس کا قانون چلتا ہے اور ہر معاملے میں صرف وہی زور آور ہے۔ جب اس کی عطا کردہ نعمتوں کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کیا جائے گا اور پوری قوم بادشاہوں کی اس نازیبا حرکت پر خاموش رہے گی تو پھر اللہ کا عذاب استیصال سب کچھ نیست و نابود کر دے گا اور کرتا رہے گا تاکہ ایک جدید قوم کے ہاتھوں جہانِ نو تعمیر ہو سکے۔

چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں حسن بن صباح کا قلعہ الموت تباہ کر کے فارغ ہوا تو قیدیوں میں ایک شخص نصیر الدین طوسی بھی تھا۔ یہ شخص غالی شیعہ تھا۔ باطنی تھا اور ساتھ ہی علم ہندسہ اور علم نجوم کا ماہر تھا۔ نصیر الدین طوسی قیدی ہونے کے باوجود اپنی چرب زبانی اور چابک دستی کے سہارے ہلاکو خاں کا ایسا مشیر بن گیا جس کی کوئی بات ہلاکو خاں ٹالنے کو تیار نہ تھا۔ یہ شخص عباسیوں کو غاصب سمجھتا تھا اور علویوں کی حکومت چاہتا تھا۔

ابن علقمی اور نصیر الدین طوسی کے درمیان عباسی خلافت کو ختم کرنے کے لیے جو سازش تیار ہوئی، اسے عملی جامہ پہنانے

Marfat.com

کا وقت آ گیا تھا۔ ہلاکو خان کو خفیہ پیغام بھیجا کہ تم بغداد پر حملہ کر دو، میں آسانی سے قبضہ کرا دوں گا۔ ہلاکو خاں ابن علقمی کی اس پیشکش سے مطمئن نہ ہوا کیونکہ اتنی بڑی سلطنت کو اتنی آسانی سے فتح کر لینا ممکن نظر نہیں آتا تھا اور صرف علقمی کی ضمانت پر اتنے بڑے معرکے میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ ہلاکو خان کو اطمینان دلانے کے لیے ابن علقمی نے فوجوں کو کم کرنا اور بغداد سے باہر بھیجنا شروع کر دیا۔ اس سازش کی پوری تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور ساتھ ہی ایک خط ہلاکو خان کو حملہ کرنے کے لیے لکھا جس میں بغداد کی اندرونی حفاظت کے حالات اور کیفیت سے آگاہ کیا۔ ایک خط نصیر الدین طوسی کو لکھا کہ وہ ہلاکو خاں کو بغداد پر حملہ کرنے کی ترغیب دے۔

ہلاکو خان نے طوسی سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ علم نجوم کی روشنی میں، میں کہہ سکتا ہوں کہ بغداد پر آپ کا قبضہ ہو جائے گا اور اس میں کوئی لمبی چوڑی مزاحمت بھی پیش نہیں آئے گی چنانچہ ہلاکو خان نے ایک لشکر جرار بغداد پر حملہ کرنے کے لیے تیار کیا اور ابن علقمی کو یقین دلایا کہ بغداد کی فتح کے بعد اس کو وزیر اعظم بنا دیا جائے گا۔

ہلاکو خان نے بغداد کی طرف پیش قدمی کی۔ امرا نے معتصم کو جھنجھوڑا اور احساس دلانے کی کوشش کی کہ ہلاکو کا لشکر بغداد کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ ابن علقمی کے سحر سے باہر آئیں اور دفاع کا بندوبست کریں چنانچہ بڑی مشکل سے خلیفہ میں کچھ احساس زیاں پیدا ہوا اور ایک قابل جرنیل فتح الدین کو دس ہزار کا لشکر دے کر ہلاکو خاں کے لشکر کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ فتح الدین نے بڑی دلیری سے تاتاریوں کا حملہ پسپا کر دیا اور اپنے ساتھیوں کے اصرار پر دشمن فوج کا پیچھا کیا۔ اس دوران کمین گاہوں میں چھپے ہوئے تاتاری بھی ہوشیار ہو گئے اور فتح الدین کی فوج دونوں طرف سے دشمنوں میں گھر گئی۔ فتح الدین لڑتا ہوا شہید ہو گیا اور باقی لشکر جان بچا کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا۔ معتصم کی حماقت اور بے حسی کی انتہا ہو گئی کہ ان بھگوڑوں کو بھی انعامات سے نوازا۔

اس کے بعد ہلاکو کے لشکر نے آگے بڑھ کر بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ بغداد کی آبادی اور وہ عباسی فوج جس کی تعداد ابن علقمی نے بہت کم کر دی ہوئی تھی، نے پچاس دن تک مقابلہ کیا۔ اس دوران ابن علقمی ہلاکو خان کو بغداد کی اندرونی صورت حال سے مسلسل آگاہ کرتا رہا اور بغداد کا دفاع کمزور سے کمزور ہوتا چلا گیا۔ ان حالات میں ابن علقمی بغداد سے باہر ہلاکو خان کے پاس آیا اور اپنے لیے امان کا وعدہ لیا۔ اس کے بعد وہ معتصم سے ملا اور کہا کہ میں آپ کے لیے امان طلب کر کے آیا ہوں۔ ہلاکو خان کا لشکر اتنا بڑا ہے کہ اگر اس نے بزورِ شمشیر بغداد پر قبضہ کیا تو پوری آبادی کو قتل کر دے گا اور آپ کے خاندان کی بھی خیر نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ باہر نکل کر ہلاکو خان سے ملاقات کریں، وہ نہ صرف آپ کو امان دے گا بلکہ پہلے کی طرح عراق پر حاکم و فرماں روا بھی رکھے گا۔

معتصم نے کچھ سوچنے کی مہلت مانگی۔ ابن علقمی نے خلیفہ سے کہا آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ پہلے اپنے بیٹے کو ہلاکو خاں کی خدمت میں بھیج کر دیکھ لیجیے تاکہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ تاتاری آپ کی کتنی عزت کرتے ہیں۔ خلیفہ نے اس تجویز پر عمل کرتے ہوئے اپنے بیٹے ابوبکر کو ہلاکو خان کے پاس بھیجا، جسے ابن علقمی کی سازش کے مطابق بڑے انعام و اکرام کے بعد واپس بھیج دیا گیا۔ ابوبکر نے باپ کے سامنے ہلاکو کی بڑی تعریف کی اور خلیفہ تاتاری کے دربار میں

Marfat.com

جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

ابن علقمی نے خلیفہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ خود ہلاکو کی خدمت میں حاضر ہو تا کہ وہ خلیفہ کی دست بوسی کر سکے۔ اپنے اقتدار کو بچانے کی موہوم امید پر خلافت عباسیہ کا آخری تاج دار اپنے بیٹے کے ہمراہ ہلاکو خان کے کیمپ میں پہنچ گیا۔ ہلاکو نے خلیفہ کو علیحدہ بٹھایا اور کہا کہ آپ اپنے اعیان سلطنت اور علماء کو بلالیں اور کوئی ہتھیار ساتھ نہ لائیں۔ ان سب کو عزت وشرف کے تاج پہنائے جائیں گے۔

خلیفہ کے حکم پر جب تمام عمائد شہر سے باہر آ گئے تو تاتاریوں نے اپنی سرشت کے مطابق سب کو قتل کر دیا۔ اصل میں یہ اس قتل عام کا پہلا قدم تھا جس کے بعد وسیع تر قتل عام کا سلسلہ شروع ہوا۔ مورخین کے مطابق اس وقت بغداد کی آبادی 22 لاکھ نفوس پر مشتمل تھی جس میں سے 16 لاکھ افراد قتل کر دیے گئے۔ بغداد کی گلیاں اور دجلہ کا پانی سرخ ہو گیا۔ اس قتل عام کے علاوہ کھلے عام عورتوں کی عزت و ناموس کو برباد کیا گیا اور بعد میں انہیں قتل کر دیا گیا۔ اس وقت وہی بچا جس نے کسی طرح اپنے آپ کو چھپا لیا۔ تاتاریوں نے علماء وفضلا کو قتل کرنے کے ساتھ بغداد کے کتب خانوں میں جمع لاکھوں کتابوں کو بھی دجلہ میں بہا دیا اور دجلہ میں خون کی سرخی کے ساتھ کتابوں کی تحریر کی روشنائی نے شامل ہو کر ایک سیاہ لکیر بنا ڈالی۔ الغرض یہ سب کچھ مسلمانوں کی بے بسی اور بے چارگی اور تاتاریوں کی وحشت اور درندگی کی انتہا تھی جس کے لیے نہ کوئی داد تھی نہ فریاد۔

قتل عام کے بعد ہلاکو خاں خلیفہ کو لے کر اس کے محل میں داخل ہوا اور خلیفہ سے خزانوں کی چابیاں طلب کیں اور تمام خزانے لوٹ لیے۔ اس نے خفیہ خزانوں کا پتہ پوچھا جسے خلیفہ نے فوراً بتا دیا۔ یہ وہی حوض تھے جنہیں عباسی حکمران نسل در نسل زروجواہر اور سونے چاندی سے بھرتے آئے تھے۔ وہ سب تاتاریوں نے لوٹ لیے اور عراق کے علاوہ کئی ملکوں سے جمع کی گئی دولت جسے مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر خرچ ہونا تھا، کفار کے قبضہ میں چلی گئی۔

ہلاکو خان نے معتصم کو کئی دن سے بھوکا پیاسا رکھا ہوا تھا۔ معتصم نے کھانا مانگا تو اس کے سامنے سونے چاندی سے بھرے ہوئے دو تھال پیش کیے گئے۔ اس نے کہا میں انہیں کیسے کھا سکتا تھا؟ اس پر ہلاکو نے کہا: یہ وہی دولت ہے جسے تم نے اپنی عوام اور افواج سے چھپا کر رکھا، ان پر خرچ نہ کیا اور آج یہ تمہارے کسی کام کی نہیں۔

ہلاکو نے خلیفہ کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے لیے ابن علقمی کے مشورہ سے خلیفہ اور اس کے باقی ماندہ ساتھیوں کو نمدے میں لپیٹا اور زمین پر ڈال دیا۔ ڈنڈوں سے پیٹ کر پھر ان پر گھوڑے دوڑا کر زندگی سے آزاد کر دیا۔ اس طرح 132ھ سے شروع ہونے والی خون خوار نام نہاد خلافت کا اس طرح خاتمہ ہوا کہ رونے والا بھی کوئی نہ بچا۔ یہ سانحہ 656ھ بمطابق 1258ء میں پیش آیا۔ ساڑھے سات سو سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا، بغداد جیسا شہر بے مثال دوبارہ اپنی حالت پر نہ آ سکا اور نہ ہی مسلمانوں کو وہ عزت، دولت اور تمکنت حاصل ہو سکی۔ مسلمانوں میں کمزوری، بزدلی، بے حمیتی نے اتنا زور پکڑا کہ آج تک اولوالعزمی، شجاعت اور صلابت، مسلمانوں کے گھر اور در و دیوار کا جیسے رستہ ہی بھول گئی ہوں۔

شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

Marfat.com

زوالِ امت کے دو کردار

بایزید یلدرم......امیر تیمور (تیمور لنگ)

بایزید بن مراد بن اورخاں عثمانی 761ھ میں پیدا ہوا۔ بایزید کی تربیت شاہانہ طریقہ سے ہوئی۔ اس کا فطری رجحان فنونِ حرب کی طرف تھا۔ کم عمری میں جنگی کارنامے انجام دے کر یلدرم (صاعقہ......بجلی کے لقب سے مشہور ہوا۔)

مراد کی شہادت کے بعد بایزید کسووا کی جنگ میں کامیابی اور کامرانی سے اپنے لشکر میں واپس آیا۔ فوج کے تمام سرداروں نے اس کا خیر مقدم بڑی خوش دلی سے کیا اور تخت و تاج سپرد کر دیا۔ تمام امرا اور ارکانِ سلطنت اس کی تخت نشینی پر متفق تھے۔

عنانِ حکومت سنبھالتے ہی اپنے چھوٹے بھائی یعقوب چلپی کو فوراً قتل کر دیا۔ یعقوب نے جنگ میں شجاعت اور فوجی قابلیت کے اعلیٰ جوہر دکھائے تھے۔ وہ بڑا شجاع اور ماہر جنگجو تھا۔ باپ کی لاش ابھی سرد بھی نہیں ہوئی تھی۔ الفتنۃ اشد من القتل کی آڑ لے کر یعقوب کے وجود کو سلطنت کے لیے فتنہ قرار دیا گیا۔ تختِ سلطنت کے لیے آلِ عثمان میں یہ پہلا قتل تھا جو بایزید کی پیشانی پر داغ بن کر چمکا۔ اس داغ رسوائی سے قطع نظر سلطان یلدرم نے فتوحات کے جو عظیم الشان کارنامے انجام دیے وہ بلا شبہ اسلام کی تاریخی فتوحات کا ایک روشن باب ہیں۔

بایزید نے یورپ کے ایک بڑے حصے پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ ایشیائے کوچک پورے کا پورا اس کی سلطنت میں شامل ہو چکا تھا اور دنیا میں اس کی فتوحات کا ڈنکا بج رہا تھا۔ بایزید کی شوکت و سطوت، جاہ و جلال کے پیشِ نظر مصر میں مقیم عباسی خلیفہ بھی اس کے مدح سراؤں میں شامل ہو گیا چنانچہ اس سے پہلے کے عثمانی حکمران جو سلطان کہلاتے تھے، کے برعکس بایزید نے اپنے نام کے ساتھ سلطان کا سابقہ لگانے کے لیے خلیفہ سے خصوصی اجازت حاصل کی۔

کسووا کی جنگ میں وہاں کا حکمران سرویا لازار شکست کھا کر بھی نچلا نہ بیٹھا اور بایزید کے خلاف برسرِ پیکار رہا۔ آخر مجبور ہو کر اس نے بایزید سے صلح کر لی کہ اس کی خود مختاری قائم رہے گی مگر باج گذار بن کر۔ بادشاہ سرویا لازار کا جانشین اسٹیفن ہوا۔ اس نے سالانہ خراج کے علاوہ پانچ ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ سلطان بایزید کی حکومت کے لیے ہر وقت تیار رکھنے کا معاہدہ کیا۔ اپنی بہن شہزادی ڈسپینیا کو بایزید کے نکاح میں پیش کیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ سلطان جب کبھی مغرب سے برسرِ جنگ ہو گا تو وہ خود بنفس

Marfat.com

نفیس مع فوج کے شریک ہوا کرے گا۔وہ آخروقت تک اس وعدے پر قائم رہا۔ایک عیسائی شہزادی سے نکاح وہ پہلا کوڑا تھا جسے بایزید کی کمر پر مارا گیا۔عیسائی عورتوں کو حرم میں داخل کرنا ایک مستقل رسم بن گئی۔اس رسم نے بایزید سے لے کر عثمانی حکمرانوں کو کمزور اور بے بس کر دیا۔عثمانیوں کے زوال میں اس رسم کا بہت بڑا دخل ہے۔

یورپ اور ایشیا کی عظیم الشان فتوحات کے بعد بایزید ہمہ تن محل سرا کے عیش ونشاط میں محو ہو گیا۔شہزادی ڈسپینیا کی ترغیب سے شراب پینا بھی شروع کر دی جسے اس وقت تک کسی عثمانی حکمران نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔شراب کا سرور عیش کے دیگر لوازم کا بھی متقاضی ہوا، پھر اس سلسلہ کی کوئی برائی نہ تھی جو باقی رہی ہو لیکن جام وسبو کی تمام مستیاں بایزید کے قوائے عمل کو جنگ نکوپولس تک مضمحل نہ کر سکیں۔انگورہ کی جنگ تک پہنچتے ہوئے بایزید کے قوائے کارکردگی پوری طرح شراب وشباب کی گرفت میں آ کر برباد ہو چکے تھے۔جنگ نکوپولس بایزید کا آخری بڑا کارنامہ تھا جسے آج تک عیسائی دنیا بھلا نہیں سکی۔اس کے بعد وہی بایزید انگورہ میں امیر تیمور کے مدمقابل آیا تو غلطیوں پر غلطیاں کرتا گیا۔

جنگ نکوپولس غالباً آخری صلیبی جنگ تھی جو یورپ اور ایشیا کے عیسائیوں نے مل کر عالم اسلام کے خلاف لڑی تھی۔اس جنگ کی تفصیلات کا بیان ہمارے موضوع سے باہر ہے۔یہاں اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ اس جنگ کے شعلے بھڑکانے کے لیے شاہ قسطنطنیہ نے بایزید کے ساتھ منافقانہ رویہ اختیار کر کے سارے یورپ کو بایزید کے خلاف تیار کیا۔بایزید نے اس جنگ میں عیسائیوں کی مشترکہ طاقت کو شکست دی اور ایک مسلمان فاتح کا رعب صدیوں تک عیسائیوں پر طاری رہا۔اس جنگ کے بعد بایزید میں اتنی خود اعتمادی اور جرأت آ گئی کہ اس نے جنگ کے بعد ایک عیسائی سردار جو جنگ میں پیش پیش تھا،کو بلا کر کہا کہ میں تمہاری جوانی پر ترس کھا رہا ہوں۔اپنے ملک جاؤ اور فوج اور ہتھیار جمع کر کے میرے مقابلے میں آؤ۔مجھے ہمیشہ میدان جنگ میں مقابلے کے لیے تیار پاؤ گے۔جو بات میں اس وقت کہہ رہا ہوں اسے تو جس شخص سے بھی چاہے نقل کر دینا کیونکہ میں ہمیشہ جنگی کارناموں اور اپنی فتوحات کی توسیع کے لیے تیار اور آرزومند رہتا ہوں۔

اس عظیم الشان فتح کی خبر عالم اسلام کے کونے کونے میں پہنچ گئی اور ہر جگہ خوشی منائی گئی۔متوکل علی اللہ اول عباسی خلیفہ قاہرہ نے بھی بایزید کے اس کارنامے سے محظوظ ہو کر جملہ علاقہ جات مفتوحہ کا فرمان بایزید کے نام بھیجا۔سلطان نے فرمان آنکھوں سے لگایا اور فرمان لانے والے کو انعام واکرام سے نوازا اور بہت سے تحفے تحائف خلیفہ کے حضور ارسال کیے۔

جنگ انگورہ (انقرہ)

جنگ انگورہ دو پہاڑوں کا ٹکراؤ، دو سمندروں کی طوفانی آمیزش اور دو عظیم جرنیلوں کی لڑائی تھی جس نے امت مسلمہ کو نقصانِ عظیم سے دوچار کیا۔جنگ کی مناسب تفصیلات میں جانے سے پہلے ہم تیمور کے متعلق چند سطور تحریر کریں گے۔

تیمور کا مورث اعلیٰ تراچار توبان اور چنگیز خاں ایک امینگر دادی کی اولاد سے تھے۔قراچار کا خلف الرشد ایجل خاں خداشاسی کے ساتھ مخصوص تھا۔ہلاکو خاں نے ایجل کو تبریز کا حاکم مقرر کیا۔اس کا بیٹا امینگر خاں تھا جو مشرف بہ اسلام ہوا اور امیر الامرا کے خطاب سے نوازا گیا۔اس کا صاحبزادہ میر برگل تھا جس کے لڑکے کا نام امیر طراغائی تھا۔امیر طراغائی شیخ شمس الدین کلال کے مریدوں میں سے تھا۔یہاں شعبان 736ھ، 1324ء کو نگینہ خاتون کے بطن سے شہر سبز (ماوراءالنہر) میں

Marfat.com

تیمور پیدا ہوا۔ امیر طراغائی نے تیمور کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا۔ کم عمری میں اس کی لیاقت اور تہور و شجاعت کے چرچے ہونے لگے۔ تیمور کو حاکم وقت نے کش کی گورنری پر مامور کیا۔ اس کے بعد تیمور چغتایہ خان سیوری تماش کا وزیر بن گیا، جس کی حکومت تیمور نے 771ھ 1360ء میں غصب کر لی اور اس کے لڑکے محمد کو 800ھ 1397ء تک برائے نام بادشاہ رہنے دیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ تیمور کے جوہر کھلے۔ وہ شہرہ آفاق تاتاری امیر بن کر ابھرا۔ تیمور کی سلطنت دیوارِ چین سے ایشیائے کوچک کی سرحد تک اور بحیرہ ارل سے گنگا اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے 35 سال سے کم عرصہ میں 27 سلطنتیں مسخر کر لی تھیں اور 9 شاہی خاندانوں کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ اس کا پایہ تخت سمرقند تھا۔ غضب کا بہادر تھا۔ اعلیٰ جرنیل، بےنظیر مدبر اور عالی دماغ حکمران تھا۔ وہ اپنے ہوش مند جاسوسوں کے ذریعے دشمنوں کے پورے حالات سے کماحقہ آگاہ رہتا تھا۔ خیر خواہوں کے لیے زندگی بخش نسیم اور دشمنوں کے لیے شمشیر اجل تھا۔

بایزید اور تیمور کی سلطنتیں ہم سرحد تھیں، اس لیے باہمی آویزش کا ہونا ناگزیر تھا۔ دوسرا سبب ایک دوسرے کے باجگزار رئیسوں کو حملے کی دھمکی دینا اور ایک دوسرے کے باغیوں کو پناہ دینا تھا۔ 781ھ میں تیمور نے ایران پر چڑھائی کر دی۔ سات برس کے اندر خراسان، جرجان، ماندران، سجستان، آذربائیجان، کردستان فتح کر لیے۔ تیمور نے جس ملک کا ارادہ کیا، اسے فتح کر کے چھوڑا۔

789ھ میں اصفہان کے آدمیوں نے فتنہ فساد برپا کیا تو تیمور نے سب کو تہہ تیغ کر دیا۔ پھر فارس میں آیا۔ آلِ مظفر اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دشتِ قپچاق کا فرماں روا اس کا تربیت یافتہ تومتش خاں تھا۔ اس نے مخالفت کی، اس کا سر کچل دیا گیا۔

795ھ میں ایران میں دوبارہ جا کر شاہ منصور کو جو سرکش ہو گیا تھا، شیراز میں قتل کیا۔ آلِ مظفر کو پامال کیا۔ پھر جلائر سے بغداد جبراً لے لیا۔ کئی مرتبہ گرجستان میں آتا رہا۔ 801ھ میں دریائے سندھ پر پل بنا کر عبور کیا اور ہندوستان کو فتح کیا۔ پھر یہاں سے دمشق پر فوج کشی کی اور امرائے شام جو قید میں تھے، ان کو قتل کیا۔

تیمور کی فتوحات کا دائرہ تھوڑے عرصے میں دولتِ عثمانیہ کی حدود سے مل گیا تو بایزید نے جن علاقوں پر قبضہ کیا، وہاں کے امرا بھاگ کر تیمور کے پاس پہنچے اور جن مقامات پر تیمور نے چڑھائی کی، وہاں کے حکمراں بایزید کے پاس پناہ گزین ہوئے۔ ہر دو ریاستوں کے فرمانروا تیمور اور بایزید کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے اور ابھارتے۔ ان ریاستوں کے سلسلہ میں ہر دو بادشاہوں کے درمیان تلخ نامہ و پیام کا تبادلہ ہوا۔ آخر نوبت جنگ کی آ گئی اور دو عظیم طاقتیں آپس میں ٹکرا گئیں۔ فتوحاتِ اسلامیہ کا بڑھتا ہوا سیلاب رُک گیا۔ اسلامی دُنیا کی وہ تمام اُمیدیں جو بایزید کی ذات سے تھیں، دفن ہو کر رہ گئیں۔

803ھ 1400ء میں دمشق کی فتح کے بعد تیمور نے آرمینیہ کی طرف سے عثمانی سرحد میں داخل ہو کر سیواس جو عثمانی مقبوضہ تھا، اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس شہر کی دیواریں مضبوط تھیں اور ترکی دستہ نے سلطان بایزید کے سب سے بڑے لڑکے شہزادہ ارل طغرل کی سرکردگی میں اس کی محافظت بھی بڑی جانبازی کے ساتھ کی۔ تیمور کی سات لاکھ سے زیادہ تاتاری فوج

شروع میں کامیاب نہ ہوسکی مگر تیمور نے آخر میں سُرنگیں لگا کر شہر کی فصیل کو گرادیا۔ جس سے شہر پر تیموری فوج کا قبضہ ہوگیا۔ تیمور نے سیواس کے محافظ دستہ کو تہہ تیغ کیا۔ ان میں چار ہزار آرمنی بھی تھے جن کو زندہ دفن کرادیا اور شہزادہ ارل طغرل اس معرکے میں کام آیا۔

بایزید سیواس کے سقوط کے وقت قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اس کو جب سقوط سیواس کی خبر ملی اور ساتھ ہی اپنے لختِ جگر کے کام آنے کا علم ہوا تو اس کی کمر ٹوٹ گئی اور وہ تیمور کے مقابلہ کے لیے ایشیائے کوچک پہنچا لیکن تیمور اس دوران مصر اور شام کی طرف روانہ ہوچکا تھا۔ دو سال بعد وہ لوٹا اور سیواس پہنچنے کے بعد بایزید اور تیمور کے درمیان دوبارہ خط وکتابت ہوئی۔ بایزید کو اپنی فتوحات کا زعم تھا اور تیمور کی طاقت کا اندازہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک فیصلہ کُن جنگ کے لیے ہر دو مسلم بادشاہ پوری طرح تیار ہوگئے۔

معرکہ انگورہ (انقرہ)

بایزید ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ تیمور کے مقابلے کے لیے سیواس کی طرف بڑھا لیکن تیموری کثیر فوج (سات لاکھ) کے لیے یہ میدانِ جنگ کافی نہیں تھا۔ اس لیے وہ بایزید کے پہنچنے سے پیشتر انگورہ کی طرف روانہ ہوگیا اور وہاں پہنچ کر فوراً انگورہ کا محاصرہ کرلیا۔ اسے یقین تھا کہ بایزید انگورہ کو بچانے آئے گا، چنانچہ اطلاع ملنے پر بایزید سیواس کے بجائے انگورہ پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ تیمور شہر کے شمال مغرب کی طرف جو فوجی نقطہ نظر سے میدان کا بہترین حصہ تھا، قبضہ کیے ہوئے ہے مگر بایزید اپنی قوت کے گھمنڈ میں تیمور کی فوجی قوت کا اندازہ نہ کرسکا۔ ادھر تیمور نے اپنے تاتاری ایجنٹ بایزید کی فوج میں بھیج دیے جنہوں نے عثمانی فوج کے تاتاریوں میں بایزید کے خلاف بغاوت پیدا کرکے ان میں قومی عصبیت برانگیختہ کردی چنانچہ تاتاری عین حالتِ جنگ میں کٹ کر تیموری فوج میں شامل ہوگئے۔ اس سے بڑھ کر بایزید کے رویہ نے فوجیوں کو بے دل کردیا۔ عثمانی افسروں نے یہ رنگ دیکھ کر بایزید کو مشورہ دیا کہ تیمور سے صلح کرلی جائے مگر اپنی قوت پر بھروسہ کے زور پر اس نے مطلق توجہ نہ دی بلکہ شانِ تعلّی دکھانے کے لیے انگورہ پہنچنے کے بعد ایک روز پوری فوج کو ساتھ لے کر شکار کے لیے روانہ ہوگیا۔ راستے میں پانی کی کمی کی وجہ سے پانچ ہزار فوجی پیاس کی شدت سے مرگئے جو باقی رہے وہ بھی گرمی اور پیاس کی وجہ سے خستہ حال ہوگئے۔

بایزید شکار سے لوٹا تو دیکھا کہ اس کی لشکر گاہ پر تیمور کا قبضہ ہے جس چشمہ سے عثمانی فوج پانی لے سکتی تھی۔ اس کا رخ بھی تیموری فوج نے پھیر دیا ہے۔ بایزید نے حالات کی نامساعدت سے گھبرا کر 17 ذوالحج 804ھ 20 جولائی 1403ء کو فیصلہ کُن معرکہ کا آغاز کردیا لڑائی طلوع فجر سے پہلے ہی شروع ہوگئی اور غروب آفتاب کے بعد تک جاری رہی۔ بایزید نے اپنی سپہ گری اور سپہ سالاری کے خوب جوہر دکھائے۔ تیمور کی فوجی قابلیت اور اس پر طرہ یہ کہ دعا و مناجات میں مشغولیت اور سجدے میں سر رکھ کر رونا اور گڑگڑانا، جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ بایزید کو ناکامی نظر آنے لگی۔ ادھر اناطولیہ کی ترکی ریاستوں کے رؤسا تیمور کے ساتھ تھے اور ان کی فوجیں بایزید کے ہمراہ وہ اپنے آقاؤں کے جھنڈے کے نیچے پہنچ گئیں۔ تاتاری علیحدہ کٹ گئے، پھر انہوں نے بایزید کو میدان چھوڑنے کی رائے دی مگر اپنی شجاعت اور کشوری کے زعم میں اس مشورہ کو حقارت سے ٹھکرادیا۔ بایزید کے ساتھ اس وقت صرف

دس ہزار فوجی رہ گئے تھے۔ وہ سات لاکھ تاتاریوں کا کب تک مقابلہ کر سکتے تھے۔ بایزید نے حالات کا یہ رنگ دیکھا تو بھاگنا چاہا
وقت گذر چکا تھا۔ سردار محمود خاں چغتائی نے بایزید کو میدان سے ہٹتے ہوئے دیکھا تو آگے بڑھ کر گرفتار کر لیا۔ بایزید کے پانچ
لڑکوں میں سے جو شریکِ جنگ تھے، تین دشمن کی زد سے نکل گئے۔ شہزادہ سلیمان نے یورپ کی راہ لی۔ شہزادہ محمد نے اماسیہ
پہنچ کر دم لیا اور شہزادہ عیسیٰ نے کرمانیہ کا رخ کیا۔ شہزادہ موسیٰ گرفتار ہوا۔ شہزادہ مصطفیٰ اس وقت لاپتہ ہو گیا۔ ممکن ہے لڑائی میں مارا
گیا ہو، اس کا آج تک سراغ نہیں ملا۔

بایزید کا انجام

بایزید قیدی کی حیثیت سے دست بستہ تیمور کے سامنے لایا گیا۔ تیمور نے تخت سے اتر کر بایزید کا استقبال کیا اور ہتھکڑی کھلوا
کر عزت و احترام کے ساتھ اپنے پہلو میں تخت پر بٹھایا اور سلطان بایزید کے اس حال کو دیکھ کر آبدیدہ ہو کر کہنے لگا:

"اگرچہ احوالِ عالم تمام تر خداوند تعالیٰ کے ارادہ و قدرت کے مطابق پیش آتے ہیں اور حقیقت الامر یہ ہے کہ کسی دوسرے کو اختیار و اقتدار نہیں تاہم ظاہر سبب یہ ہے کہ تم پر یہ جو مصیبت آئی ہے وہ انصاف اور حق یہ ہے کہ خود تمہاری لائی ہوئی ہے، تم نے بار بار اپنی حد سے باہر قدم رکھا اور بالآخر مجھے انتقام پر مجبور کر دیا۔ تم اس مغربی دیار میں نصرانی کفار سے جہاد کر رہے تھے، میں نے بہت کچھ تحمل سے کام لیا اور ان حالات میں جو فرض ایک خیر اندیش مسلمان کا تھا، اسے بجا لایا۔ میری خواہش تھی کہ اگر تم فرمانبرداری کی راہ اختیار کرو تو مال و لشکر کی جس قدر ضرورت تمہیں ہو، اس سے تمہاری مدد کروں تا کہ تم اطمینان اور قوت کے ساتھ جہاد میں مشغول رہ سکو اور دیارِ اسلام کے اطراف و اکناف سے بے دینوں کے شرک کی شوکت کو فنا کر دو مگر تم نے سرکشی اور عناد کا رستہ اختیار کیا حتیٰ کہ معاملہ یہاں تک رونما ہوا۔ سب جانتے ہیں کہ اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی اور یہ قوت و غلبہ جو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بخشا تم کو حاصل ہوتا تو اس وقت مجھ پر اور میرے لشکر پر کیا گذرتی لیکن اس فتح کے شکرانے میں جو خدا کے فضل سے مجھے حاصل ہوئی ہے، میں تمہارے اور تمہارے آدمیوں کے ساتھ بھلائی کے سوا کچھ نہ کروں گا۔ دل کو مطمئن رکھو۔"

بایزید نے منفعل ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور آئندہ کے لیے اطاعت کا وعدہ کیا۔ تیمور نے خلعت شاہانہ پہنا کر مزید لطف
و عنایت کی اُمید دلائی اور اس کی خواہش پر شہزادہ موسیٰ کو بھی آزاد کر کے اسے بایزید کے پاس پہنچا دیا گیا۔

بایزید کی موت

تیمور کے مراسمِ خسروانی بایزید کے زخمِ دل کے لیے نمک پاشی کا کام کر رہے تھے، شاہی خیمہ بھی اس کے لیے قید خانہ
سے کم نہ تھا اور اپنی سابقہ عظمت و سلطنت کی یاد ایک لحظہ بھی چین نہ لینے دیتی۔ اگرچہ تیمور نے اپنے خیمے کے قریب ایک عالی
شان خیمہ نصب کرا رکھا تھا اور بعض عالی مرتبت امرا کو سلطان کی خدمت پر مامور کر رکھا تھا بروصہ سے جب حرم سلطانی لائی

Marfat.com

گئیں تو تیمور نے شہزادی ڈسپینیا اور اس کی لڑکی کو بھی بایزید کے پاس بھجوا دیا۔لیکن بایزید کا اضطراب یہاں تک بڑھا کہ راہ فرار اختیار کرنا چاہی۔تیمور کو اطلاع ہوگئی،نگرانی سخت کر دی گئی اور بایزید کے لیے ایسی پالکی تیار کر لی گئی جس کی جالی لوہے کی تھی۔تیمور نے اپنے سفر میں اس کی پالکی اور بایزید کو اپنے ساتھ رکھا جس سے یہ مشہور ہوگیا کہ قیدی سلطان کو لوہے کے پنجرے میں بند رکھا گیا ہے۔تیمور نے یلدرم کو اس طرح کٹہرے میں رکھا جس طرح شیروں کو پنجرے میں رکھا جاتا ہے۔ بہر حال بایزید کے قلب و دماغ پر اپنی قید اور رسوائی کا اس قدر شدید اثر ہوا کہ صرف آٹھ ماہ بعد ہی اس کی روح قفس عنصری اور قفس آہنی دونوں سے آزاد ہوگئی۔یہ واقعہ 805ء کا ہے۔

تیمور کو بایزید کے مرنے کی خبر ملی تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور شہزادہ موسیٰ کو آزاد کر کے اس کے ہمراہ بایزید کی نعش شاہانہ احترام کے ساتھ بروصہ روانہ کی جہاں دوسرے عثمانی بادشاہوں کے پہلو میں اسے دفن کیا گیا۔خود تیمور بھی اس کے دو سال بعد مرگیا۔تیمور نے جو سلوک بایزید یلدرم جیسے عالی شان شہنشاہ سے کیا۔اس سے تیمور کی بہادری اور ملک گیری کا مرتبہ نگاہوں سے گر جاتا ہے۔یلدرم جیسے اولوالعزم مسلمان اور جوانمرد سپہ سالار اور بادشاہ کو ذلت کے ساتھ قید کرنا اور اس کی تشہیر اور رسوائی سے لطف اندوز ہونا تیمور کے شریفانہ اخلاق پر ایک سیاہ اور مکروہ دھبہ ہے۔بہادر جب اپنے دشمن پر قابو پا لیتا ہے تو اس پر احسان کرتا ہے۔

ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ تیمور کی تمام ترک وتاز اور فتح مندیاں مسلمان سلاطین کو زیر کرنے اور مسلمانوں کے شہروں میں قتل عام کرانے تک محدود رہیں۔اس کو یہ توفیق میسر نہ آسکی کہ غیر مسلموں پر حملہ کرتا یا غیر مسلم علاقوں میں اسلام پھیلاتا۔

"بایزید یلدرم اور تیمور صاحبقران کی دل شکن اور دل خراش داستان کو ہم مشہور مؤرخ اکبر شاہ نجیب آبادی کے ایک مضمون کے اقتباس پر ختم کرتے ہیں جو "انقلاب" لاہور کے سالگرہ عید نمبر میں شائع ہوا تھا۔800ھ میں جب تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو یہاں تغلقوں کی حکومت جانکنی کی حالت میں تھی مگر اسلامی اقتدار و عظمت کو کوئی خطرہ نہ تھا۔اسپین کی اسلامی حکومت جس کا دارالحکومت غرناطہ تھا،عیسائی بالکل مٹا دینے پر آمادہ ہو چکے تھے لیکن کسووا کی جنگ عظیم اور بایزید یلدرم کی پُر ہیبت معرکہ آرائیوں سے یورپ کے عیسائی کچھ سہم سے گئے تھے اور ان کو اپنی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا وجود یورپ میں قریباً ڈیڑھ سو برس تک کے لیے اور باقی رہ گیا۔تیمور ہندوستان میں مشرق کی جانب ہردوار تک آیا۔دہلی،ملتان اور دامن کوہ کشمیر میں قتل عام سے خون کے دریا بہا کر اور ہندوستان کا ملک یہاں کے باہمت اور ذی حوصلہ مسلمان سرداروں کے لیے چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

تیمور ہردوار میں تھا کہ اس کے پاس خبر پہنچی کہ بایزید یلدرم کو یورپ میں فتوحات پر فتوحات حاصل ہو رہی ہیں۔اس خبر کے ساتھ ہی قیصر روم یعنی قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ کا ایلچی مع خط پہنچا کہ بایزید کے پاس آپ کے مفرور مجرم سلطان احمد اور قرا یوسف ترکمان راحت و آرام اور عزت و احترام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔اس میں آپ کی بڑی بے عزتی ہے۔بایزید نے ہماری قدیم سلطنتوں کو پارہ پارہ کر دیا ہے حالانکہ ہارون الرشید اور معتصم باللہ عباسی خلفا بھی ہماری سلطنت مٹانا نہیں چاہتے

Marfat.com

تھے اور مسلمانوں نے ہمیشہ ہماری سلطنت کو عزت وتکریم کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ نیز بایزید نے اپنی فوجیں داغستان میں جمع کی ہیں اور وہ بہت جلد آذر بائیجان وغیرہ پر قبضہ کرنے والا ہے آپ اس طرف آئیں، اپنی سرحدوں کو بچائیں اور ہم کو بھی اس مصیبت سے نجات دلائیں۔

تیمور سے توقع تھی کہ وہ قیصر کی اس درخواست کا مایوس کن اور مسکت جواب دیتا، جیسا ساڑھے سات سو برس پہلے حضرت امیر معاویہؓ نے قیصر روم کو خط لکھا تھا کہ اگر تیرے معاملے کے لیے حضرت علیؓ کے لشکر کو حرکت کرنی پڑی تو سب سے پہلا سردار جو حضرت علیؓ کے جھنڈے کے نیچے تجھ پر حملہ آور ہو گا وہ معاویہ ہو گا لیکن تیمور جذبہ رقابت پر غالب نہ آسکا، نیز سلطان احمد جلائر اور قرا یوسف ترکمان کے بایزید کی پناہ میں چلے جانے کو برداشت نہ کرسکا۔ وہ ہندوستان سے فوراً چل دیا اور راستہ میں ایک لاکھ ہندوستانی قیدیوں کو جو بار خاطر یا گراں باری سفر کا موجب تھے، بجائے اس کے ان کو آزاد کر دیتا قتل کر ڈالا۔ ہندوستان سے افغانستان ہوتا ہوا سمرقند پہنچا، وہاں سے تیاری کر کے ایران سے ہوتا ہوا اپنے ملک کی مغربی اور بایزید قلمرو کی مشرقی سرحد پر پہنچ کر بایزید کو جو قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، ایک تہدیدی خط لکھا کہ ہمارے مفرور مجرموں کو فوراً ہمارے پاس بھیج دو، بایزید نے پناہ گزینوں کے دینے سے انکار کر دیا۔

اس باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ 803ھ میں تیمور نے آرمینیا کی طرف سے بایزیدی علاقوں میں داخل ہو کر سیواس کا محاصرہ کرلیا۔ یہاں بایزید کا بڑا لڑکا ارل طغرل صوبہ دار تھا، اس نے سخت مزاحمت کی لیکن مارا گیا اور سیواس فتح ہو گیا۔ تیمور نے اس جنگ کے چار ہزار ترک فوجیوں کے ساتھ یہ انسانیت سوز سلوک کیا کہ انہیں زندہ دفن کرا دیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سنگدلی اور وحشت و بربریت کا ایک ایسا ہولناک مظاہرہ تھا جس کی نظر چنگیزی تاتاریوں کے مظالم میں بھی نہیں مل سکتی۔

یہ اطلاع ملتے ہی بایزید ایک لاکھ بیس ہزار فوج لے کر تیمور کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوا۔ تیمور اب سیواس کے میدان کو اپنے لیے تنگ پا کر انگورہ آچکا تھا، تیمور کی فوج تعداد میں سات لاکھ تھی یعنی بایزید کی فوج سے سات گنا زیادہ، پھر بھی بایزید نے نہایت بے جگری اور اپنی شہرہ آفاق بہادری سے دشمن کا مقابلہ کیا لیکن تعداد میں بہت کم ہونے کے ساتھ ایک مشکل یہ پیش آئی کہ بایزید کی فوج کے بعض تاتاری دستے غداری کر کے تیمور سے جا ملے۔ اس پر بایزید کو اس جنگ میں شکست فاش ہوئی اور وہ اپنے بیٹے موسیٰ کے ساتھ گرفتار ہو گیا۔ آٹھ مہینے تیمور کی اسارت میں رہنے کے بعد اس کو قید ہستی اور زندان آہنی سے بیک وقت رہائی مل گئی۔

تیمور نے بایزید کو شکست دے کر گرفتار کر لینے اور اس طرح اپنی آتش انتقام و جذبہ رقابت کو بجھانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تمام ترکی امیروں کو جن کی ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلی گئی تھیں، آزاد کر کے ان کی حکومتوں کو دوبارہ بحال کر کے ایشیائے کوچک سے دولت عثمانیہ کے اقتدار کا خاتمہ ہی کر ڈالا۔ آہ افسوس!

بایزید کے مغلوب و اسیر ہونے سے یورپ میں اسلام کے روز افزوں اقتدار و ترقی کو سخت نقصان پہنچا۔ اگر تیمور شکست کھا کر اسیر یا مقتول ہو جاتا تو صرف خاندان تیمور کو نقصان پہنچتا مگر اسلام کو براعظم ایشیا میں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس لڑائی میں بایزید کی حد سے بڑھی ہوئی بہادری اور کسی قدر عاقبت نااندیشی کو ضرور ملزم ٹھہرایا جا سکتا ہے، اس کے سوا اس عثمانی

Marfat.com

سلطنت پر اور کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا۔ جنگ انگورہ نے تمام یورپ کو مسلمانوں کا مغلوب ہونے سے بچا لیا۔ انگورہ کا معرکہ اگر برپا نہ ہوتا تو جاپان سے انگلستان تک تمام دنیا ایک مرتبہ اسلام کے سایہ میں آچکی ہوتی۔

تاریخ کا سبق......مکافاتِ عمل اور فطری سزا

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ بایزید نے بغیر کسی قصور کے اپنے چھوٹے بھائی یعقوب کو قتل کر دیا تھا اور قتل بھی اپنی کمان کی ڈوری سے گلا گھونٹ کر کیا۔ بایزید اوّل کو عیسائیت نواز حکمران بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے فتح حاصل کرنے کے باوجود سربیا کے حکمران لازار کو وہاں کا حکمران رہنے کی اجازت دے دی اور اس کی بیٹی ماریا ڈسپینیا سے شادی رچالی۔ شہزادی بہت خوبصورت اور چالاک عورت تھی اور عیسائیت کے خلاف مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدم کامیابی سے روکتی رہی۔ اس عورت نے بایزید کو شراب پر لگایا اور بایزید کا ایمان ارادہ اور حوصلہ برباد کرنے کے لیے اسے تعیش کا عادی بنایا اور حرم کو عیسائی کنیزوں سے بھر دیا۔ دوسری طرف بایزید کے دربار میں بے شمار عیسائی مشیر جمع ہو گئے جو بایزید پر اثر انداز ہوتے رہتے تھے۔

اسے اللہ تعالیٰ نے فتوحات اور مال و دولت سے نوازا، اولاد سے نوازا، شہرت وعزت سے نوازا اور زمانے میں ایک رعب والا حکمران بنا کر شہرت عطا فرمائی۔ بایزید نے اللہ کا شکر گزار بندہ بننے کی بجائے اپنے آپ کو منکرات میں غرق کر لیا۔ قتل برادر جیسے فعل شنیعہ کا ارتکاب کیا۔ اللہ کی ذات ہر سمت سے انسان کو گھیرے ہوئے ہے۔ وہ عزیز ذوانتقام ہے۔ اس نے بایزید کو رسوا کر کے عبرت آموز سزا دی۔

یہ بھی فطری ضابطہ ہے کہ دنیا میں فساد کو مٹانے کے لیے ایک سے دوسرے کو ختم کیا جاتا ہے جہاں تیمور نے بایزید کو ختم کیا، وہاں تیمور بھی تاریخ کے کٹہرے میں مجرم کی حیثیت سے کھڑا ہے۔ برسرِ اقتدار ہوتے ہوئے اس نے جو مظالم امت مسلمہ کے ساتھ کیے، وہ باعثِ شرم اور رسوائی ہیں۔

سقوطِ غرناطہ کے دو کردار

سلطان ابوعبداللہ زغل......ابواحمد محمد

سقوط......واقعات و وجوہات

ولید بن عبدالملک اموی کے دور میں موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کی کوششوں سے سرزمین اندلس مسلمانوں کے انتظام وانصرام میں آئی۔ 132ھ میں اموی حکومت ختم ہوگئی تو اسی خاندان کا ایک شہزادہ عباسی قاتلوں سے بچتا بچاتا اند پہنچا۔ وہ شہزادہ جسے تاریخ عبدالرحمن الداخل کے نام سے یاد کرتی ہے، غیر معمولی خداداد صلاحیتوں کا ملک تھا۔ اس نے سا اموی حکومت کے پہلے سے اندلس میں مقیم ومتصرف لوگوں کو ساتھ ملایا اور بیس سال کی عمر میں دوبارہ اموی حکومت بنیادوں کو اُندلس میں مستحکم کیا اور قرطبہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔

اموی خاندان نے بڑی ترقی کی اور اندلس کی سرزمین کو یورپ میں ایسے مشہور کروایا جیسے یورپ ایک انگوٹھی ہوا اندلس اس کا نگینہ۔ دو صدیاں ہونے والی تھیں کہ اس خاندان کو باہمی اختلافات، بغداد میں بنوعباس کی حکومت کی ریش دوانیاں اور سلاطین وامرا کی جاہ پسندی عیسائیوں کے ساتھ کشمکش اور عیسائی رعایا کی بغاوتیں اس خاندان کے زوال کا سبب بنیں۔

اس خاندان نے اپنے زمانہ عروج میں جوہری اور بنیادی غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ یہ غلطیاں اس طرح کی تھیں ج دوسرے مسلمان جب غیر مسلم علاقوں پر قابض ہوتے رہے اور کرتے رہے۔ اس خاندان کو اندلس کی زرخیزی نے مالام کر دیا۔ بجائے اس کے کہ اس دولت کا کوئی بہتر مصرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت میں تلاش جاتا، انہوں نے یہ دولت ذاتی عیش وآرام، محلات و باغات اور اپنے تمول کے اظہار کے لیے بے جا داد دہش پر خرچ کی پورے یورپ مین اُندلس کی دولت مندی کی دھاک بیٹھ گئی۔

اندلس میں اموی خاندان کا زوال 1236ء میں قرطبہ کا مسلمانوں سے چھن جانا مرابطین کی حکومت اور بعد ا موحدین کی حکومت اور دوسرے خاندانوں کی حکومتیں اسی طرح اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کے 800 سال پور گئے۔ اللہ کی دی ہوئی چھوٹ کے باوجود اہلِ اندلس نہ سنبھلے اور بالآخر اللہ تعالیٰ کا قانون جزاوسزا اور عروج و زوال حرکت

آگیا اور اندلس اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک بالکل ہی اجنبی ملک ہو کر رہ گیا اس خدائی قانون کا ذکر ہم قدرے تفصیل سے فتنہ تاتار والے باب میں کر چکے ہیں۔

قرطبہ کے چلے جانے کے بعد صرف غرناطہ کی ریاست تھی جو مسلمانوں کے پاس رہ گئی تھی، اس کا رقبہ اندلس کے کُل رقبے کا ۱/۷ تھا۔ جوں جوں سقوط کی منزل قریب آرہی تھی، یہ ریاست بھی کئی حصوں میں بٹ چکی تھی اور ہر حصہ پر خودسر سردار حکمران تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ اپنی ہمسایہ ریاست پر یلغار سے بھی باز نہ آتے تھے۔ بے حمیتی کی انتہا تھی کہ اپنے بھائی کو برباد کرنے کے لیے عیسائیوں سے مدد لیتے تھے اور اس کے بدلے میں خراج دینا قبول کر لیتے تھے۔

اسلام دینِ دعوت ہے۔ یہودیت کی طرح یہ کوئی نسبی مذہب نہیں۔ اندلس کی آٹھ سو سالہ تاریخ میں کسی حکمران نے بھی یہ کوشش نہیں کی کہ حکمت، دل سوزی اور وعظِ حسنہ سے عیسائیوں کو اسلام کی وسیع دنیا میں داخل کرتا۔ اپنے آپ کو بہتر مسلمان بناتا اور عیسائیوں کو تبلیغ اشاعت سے اپنے قریب کرتا اور سینے سے لگاتا۔ اس طرح ایک تو مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہوتا۔ اللہ کی رحمتیں نازل ہوتیں اور اسلام کا قلاوہ گلے میں ڈالنے والے سارے لوگ اپنے مسلمان بھائیوں اور مسلمان حکومت کی سرحدوں کے خدائی محافظ بن جاتے۔

سقوطِ قرطبہ سے سقوطِ غرناطہ تک 256 سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس عرصہ کی ساری تاریخ بیان کرنا طوالت کا سبب بنے گا۔ ہم صرف وہ کردار زیرِ بحث لائیں گے جن کی بے بسی اور بے حمیتی سے غرناطہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

870ھ میں سلطان حسن غرناطہ کے تختِ سلطنت پر بیٹھا اب غرناطہ ہی اندلس میں مسلمانوں کا دارالحکومت تھا۔ سلطان حسن بڑے جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ 880ھ میں قسطیلہ یا کیسٹل کے عیسائی بادشاہ فرڈی نینڈ نے نہایت مغرورانہ انداز میں سلطان حسن سے خراج کا مطالبہ کیا تو اس نے جواب میں لکھا "غرناطہ کی ٹکسال میں اب سونے چاندی کے سکوں کی جگہ فولادی تلواریں اور نیزے عیسائیوں کے جگر چاک کرنے کی غرض سے تیار کیے جاتے ہیں۔"

سلطان حسن کا یہ جواب صرف زبانی جمع خرچ اور دھمکی نہ تھا بلکہ اس نے سچ مچ 886ھ میں شاہ قسطیلہ کے قلعہ صخرہ پر حملہ کیا۔ اگرچہ یہ نہایت مضبوط، مستحکم اور بلند و بالا قلعہ تھا۔ سلطان نے ایک ہی شب میں اسے مسخر کر لیا اور اس کے بعد جنگ کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

887ھ میں قلعہ الحمرا کو مسلمان فوجیوں سے خالی پا کر شاہ قسطیلہ نے اس پر حملہ کر دیا اور قابض ہو کر ہزاروں مسلمانوں کو جن میں عورتیں اور معصوم بچے بھی شامل تھے بلا وجہ بیدردی کے ساتھ قتل کر دیا۔ اسی سال کے ماہ جمادی الاول میں سلطان حسن کو خبر پہنچی کہ شاہ قسطیلہ بذاتِ خود ایک بڑا لشکر لے کر غرناطہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ پھر ساتھ ہی خبر آئی کہ اس نے شہر لوشہ کا محاصرہ کر لیا ہے۔ سلطان نے یہ سنتے ہی اپنے گھوڑے کی باگ لوشہ کی طرف موڑ دی۔ 27 تاریخ کو دونوں صف آرا ہوئے۔ شاہ قسطیلہ نے شکست کھائی اور مسلمان اس کی فوج اور مال و اسباب پر قابض ہو گئے۔

ادھر عیسائیوں کے ساتھ جنگ جاری تھی لیکن ادھر مسلمان نہایت خطرناک قسم کی خانہ جنگی میں مبتلا تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ سلطان حسن کی ایک عیسائی جاریہ تھی جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ سلطان کی جو بیوی تھی وہ خود ان کی چچا

Marfat.com

زادبہن یعنی عبداللہ کی بیٹی تھی۔ بیوی اور جاریہ دونوں سے اولاد تھی۔ بیوی کے بطن سے دولڑکے تھے جن کا نام ابوعبداللہ او یوسف تھا لیکن سلطان کو اپنی جاریہ سے زیادہ محبت تھی۔ اس بنا پر ابوعبداللہ اور یوسف دونوں کو خوف تھا کہ سلطان ان کو تاج و تخت سے محروم کر کے ان کے سوتیلے بھائی کو اپنا جانشین نہ بنادے۔ اس اندیشہ کے باعث ٹھیک اس وقت جب سلطان حسن مقام لوشہ میں شاہ قسطیلہ سے نبرد آزما تھا، ابوعبداللہ اور یوسف نے موقع پا کر باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور غرناطہ کے ایک حصہ پر قابض ہو گئے۔ سلطان کو اس کی اطلاع ملی تو وہ مقام مالقہ میں متیم ہو کر اس بغاوت کو فرو کرنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ عیسائیوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور مالقہ پر حملہ کر دیا لیکن انہیں شکست فاش ہوئی اور ان کے بڑے بڑے تجربہ کار سپہ سالار اور قریباً دس ہزار سپاہی زندہ گرفتار ہوئے۔

اب ابوعبداللہ نے باپ کے خلاف مالقہ پر حملہ کر دیا۔ باپ بیٹے دونوں صف آرا ہوئے۔ ابوعبداللہ کو شکست ہوئی اور وہ غرناطہ بھاگ گیا۔ اس کے بعد اس نے ماہ ربیع الاول 888ھ میں شہر لوشہ پر چڑھائی کر دی۔ اس شہر کو لوٹ کر واپس آ رہا تھا کہ کسی طرح عیسائی فوجوں کے ہاتھ آ گیا۔ انہوں نے اسے گرفتار کر کے شاہ قسطیلہ کے پاس پہنچا دیا۔ سلطان کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو وہ مالقہ سے غرناطہ آ گئے لیکن بیٹوں کی باغیانہ سرگرمیوں کے باعث اب ان کا دل امورِ سلطنت و حکومت سے اس درجہ بیزار ہو گیا تھا کہ وہ اپنے بھائی عبداللہ الزغل کے حق میں سلطنت سے دست بردار ہو گئے۔

890ھ کے ماہ ربیع الاول میں عیسائیوں نے صوبہ مالقہ پر پھر حملہ کر دیا اور سرحد کے چند قلعوں پر قابض ہو گئے۔ سلطان عبداللہ الزغل غرناطہ روانہ ہو کر ابھی ایک قلعہ میں فروکش تھا کہ عیسائیوں کی ایک فوج نے بے خبری میں حملہ کر دیا۔ اگرچہ اس وقت مسلمان بالکل غافل تھے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر اس بے جگری سے مقابلہ کیا کہ دشمن کا صفایا ہو گیا۔

مسلمانوں کی اس فوجی طاقت وقوت سے قسطیلہ کے بادشاہ فرڈی نینڈ کو یقین ہو گیا کہ اب لڑائی جیتنا مشکل ہے، اس لئے چال یہ چلی کہ اس نے سلطان حسن کے بیٹے ابوعبداللہ کو جو اس کی قید میں تھا، اپنے پاس بلایا اور اسے چچا عبداللہ الزغل کے برخلاف غرناطہ پر فوج کشی کرنے کے لئے آمادہ کر لیا۔ چنانچہ ابوعبداللہ فرڈی نینڈ کی امداد پر بھروسہ اور اس سے بہت کچھ وعدہ وعید کر کے روانہ ہوا اور سگے چچا کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ اس جنگ میں جتنے حصہ پر ابوعبداللہ کا قبضہ ہوتا رہا، معاہدہ کے مطابق وہ اسے فرڈی نینڈ کے حوالے کرتا رہا۔

سلطان الزغل اس صورت حال کو دیکھ کر غرناطہ سے مالقہ کی جانب جہاں فرڈی نینڈ نے مسلمانوں کا قتل عام کر رکھا تھا، روانہ ہوا۔ ابوعبداللہ نے یہ خبر سنی تو فوراً غرناطہ پہنچ کر اس پر قبضہ جما بیٹھا۔ الزغل نے اب غرناطہ لوٹنا مناسب نہ سمجھا اور وادی آش میں مقیم ہو گیا۔ ادھر شاہ قسطیلہ غصہ سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے مالقہ کے ہزاروں مسلمانوں کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھائی اور ہزاروں کو پکڑ کر لونڈی غلام بنا لیا، یہ 892ھ کے واقعات ہیں۔

ابوعبداللہ غالباً اب تک یہ سمجھتا تھا کہ فرڈی نینڈ نے اس کو الزغل کے خلاف جو امداد دی ہے اور اس سلسلہ میں اس نے جو کچھ عہد و پیمان کیا ہے فرڈی نینڈ اس کو پورا کرے گا اور اس طرح غرناطہ کے خودمختار حاکم ہونے میں اسکی مدد کرے گا لیکن

Marfat.com

مسلمانانِ غرناطہ پر مظالم

سقوطِ غرناطہ کے بعد اندلس سے مسلمانوں کی حکومت جو قریباً آٹھ سو سال سے زیادہ یہاں قائم رہی تھی ، بالکل ختم ہوگئی لیکن حکومت کے ساتھ عرصہ حیات بھی ان غریبوں پر تنگ کر دیا گیا ظلم و سفاکی اور جور و ستم کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو ان کے حق میں روا نہ رکھا گیا۔ ایک طرف عہدنامہ کی وہ عبارتیں پڑھیں جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور دوسری جانب ان مظالم کی روئیداد پڑھیے جو اندلس کے فرزندانِ توحید کے ساتھ کیے گئے تو آپ کو اس حقیقت کا یقین ہو جائے گا کہ دنیا میں جو قوم خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتی ، اس کو محکوم و مغلوب ہو کر کسی دوسری فاتح قوم سے ہرگز لطف و کرم اور مواسات و ہمدردی کی اُمید نہیں کرنی چاہیے۔

چنانچہ فرڈی نینڈ اور ازبلا نے غرناطہ میں داخل ہو کر پہلا کام تو یہ کیا کہ غرناطہ کی سب سے بڑی جامع مسجد کو گرجا کی شکل میں تبدیل کر دیا اور وہیں نمازِ شکر ادا کی۔ اس کے بعد حکومت کی طرف سے یہ کوشش کہ مسلمان کسی طرح خود اپنی مرضی سے عیسائیت اختیار کر لیں اور مرتد ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں اول اول ان کے ساتھ نرمی اور رعایت کا معاملہ کیا گیا لیکن جب عیسائیوں کو یقین ہو گیا کہ مسلمان اپنے مذہب کو ترک کرنے والے نہیں ہیں تو اب اس نے ظاہری رواداری کا پردہ اٹھا کر ان کے ساتھ جبر و تشدد کا معاملہ کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ کسی عیسائی کے لیے مذہب اسلام قبول کرنا قانوناً ممنوع ہو گیا۔ اس کے برعکس جو مسلمان عیسائی مذہب قبول کر لیتا تھا اس کے لئے زر و سیم کے انبار لگا دیئے جاتے تھے۔ اس کے بعد 1499ء میں فرمانِ شاہی صادر ہوا کہ جو لوگ مذہب عیسوی نہیں اختیار کرتے انہیں اسپین سے نکل جانا چاہیے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے غریب اور کمزور طبیعت کے مسلمان جو درحقیقت مسلمان تھے لیکن عتابِ شاہی سے بچنے کے لئے بظاہر گرجوں میں آتے جاتے اور ان کے رسوم و طرق بجا لاتے تھے۔ ان کے برخلاف جو مسلمان ظاہراً و باطناً مسلمان رہے ان کے ساتھ طرح طرح کی سختیاں اور زیادتیاں کی گئیں جن مسلمانوں کے بچوں پر ان کا بس چلا انہیں بپتسمہ دیا گیا۔

جب مسلمانوں نے 1524ء میں دربارِ شاہی میں ان مظالم کی شکایت کی تو ان کا معاملہ تفتیشِ مذہبی کے سپرد کر دیا گیا۔ اس محکمہ کے فیصلے کے مطابق ہزاروں مسلمان نذرِ آتش کر دیے گئے۔ پھر اس محکمہ کے صدر لارڈ بشپ نے یہ تجویز دی کہ سال میں ایک مرتبہ مسلمان نہ اپنے کسی وظیفہ مذہبی کو ادا کریں نہ اپنا مخصوص لباس پہنیں ، نہ اپنی زبان میں گفتگو کریں۔ بادشاہ فیلپ ثانی کے عہد میں غرناطہ کے لارڈ بشپ نے بادشاہ کی اجازت حاصل کر کے یہ عام اعلان کرا دیا کہ مسلمان نجاست صغریٰ و کبریٰ دونوں میں کسی ایک نجاست کی حالت میں غسل نہ کریں۔ علاوہ بریں مغربی رقص میں شریک ہونا ان کے لئے لازم اور عربی زبان کا بولنا اور لکھنا ، عورتوں کا برقعہ استعمال کرنا ، یہ تمام چیزیں ممنوع قرار دی گئیں۔

اس پر ہی بس نہیں ، مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے نام بدل لیں۔ چنانچہ امیر شکیب ارسلان نے "حاضر العالم الاسلامی" کی جلد ثانی میں اسپین کے بہت سے محلوں اور مختلف جگہوں کے اپنے نام بیان کرنے کے بعد بتایا کہ تمام نام دراصل عربی نام تھے اور عربوں کے بڑے بڑے سرداروں سے منسوب تھے چونکہ وہ جبراً عیسائی بنا لئے گئے یا ان کے نام بدل دیے گئے ، اس بنا پر ان کے اصل عربی ناموں کی صورت بدل گئی یا بگڑ کر کچھ سے کچھ ہو گئی۔

مسلمان مورخین کے علاوہ خود یورپین مورخین نے ان مظالم کی تفصیل کے ساتھ تاریخی ترتیب سے بیان کیا ہے۔

Marfat.com

''تمدنِ عرب'' کا مشہور مصنف موسیا لیبان کہتا ہے کہ اندلس کے غریب مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے، دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ حالانکہ یہی وہ مسلمان تھے جنہوں نے اپنے اقتدار و حکومت کے زمانے میں عیسائی رعایا پر کبھی اس قسم کے ظلم نہیں کئے۔ اگر وہ ایسا کرنے پر آجاتے تو آج پورا جزیرہ نمائے اسپین عیسائیوں کے نام و نشان اور ان کے وجود سے خالی ہو جاتا۔

پندرھویں صدی کے آخر میں اندلس کے لارڈ بشپ مینڈوڑا کے انتقال کے بعد فرانسکو شیمنس ڈی سیزوز اس عہدہ پر مقرر ہوا یہ کس درجہ متعصب شخص تھا، سر اسکاٹ لکھتے ہیں، اس شخص کے حالاتِ زندگی اس کی صحبت اور اس کی تعلیم نے اس کو اس زمانہ کی تنگ دلی تعصب اور غیر مسامحت کا واضح نمونہ بنا رکھا تھا۔ نہ اس میں بردباری تھی، نہ انسانی ہمدردی۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ آدمی کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے کلیسا کا تابع فرمان ہو جائے لیکن ساتھ ہی اس کی اخلاقی حالت کیا تھی، سر اسکاٹ اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اخلاق کے لحاظ سے وہ اپنے زمانہ کی تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ اس کی منظورِ نظر عورتیں عمائد سلطنت کے گھرانوں کی تھیں یا امراء کی بیٹیاں یا ملکہ کی خواتین۔ پوپ انوسینٹ ہشتم نے 1486ء میں اور ملکہ ازبلا نے 1487ء میں اس کے (شیمنس) کے تین حرام کے بیٹوں کو جائز اولاد قرار دیا۔ شدید تعصب اور اخلاقی فرومائیگی کے باوصف اس زمانہ میں چونکہ سلطنت کا نظام اور قانون جو کچھ بھی تھا، کلیسا کی زبان تھا۔ اس بنا پر شیمنس کو بھی امورِ سلطنت میں اس درجہ درخور اور عمل دخل تھا کہ گویا اسپین کا بادشاہ وہی تھا۔ اس صورت میں مسلمانوں کے ساتھ جتنے بھی مظالم ہوتے کم تھے۔ چنانچہ اس سلسلے کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اس نے محکمہ کلیسا سے ایک فرمان حاصل کیا جس کی رو سے وہ مسلمانوں کے متعلق مذہبی تفتیش جس طرح چاہتا کرتا اور انہیں سزا دے سکتا تھا۔ مسٹر اسکاٹ نے اس شخص کے مظالم کی زہرہ گداز داستان تفصیل سے لکھی ہے۔ جس کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

اندلس کی حکومت سے بالکل بے دخل ہو جانے کے بعد مسلمان بہت زیادہ تعداد میں مسجد البیس کے گرد و نواح میں جا رہے تھے۔ انہی میں سے چار ہزار مسلمانوں کو یہ کہہ کر بپتسماد یا گیا کہ یہ لوگ اپنے مذہب اسلام سے بیزار تھے، اس مسجد کو گرجا بنایا گیا۔ ان لوگوں پر جو جبراً عیسائی بنائے گئے تھے اس درجہ قدغن تھی کہ وہ بے اختیاری میں بھی کوئی فعل خلافِ عیسائیت نہیں کر سکتے تھے۔ غرناطہ کے جن مسلمانوں نے اپنے بھائیوں کو ان کے ارتداد پر برا بھلا کہا ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ انہیں قید و بند کی سزا دی گئی۔

کتابوں کا جلانا

اب اس نے مسلمانوں کے علمی و ثقافتی کارناموں کو مٹانے کی طرف توجہ کی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے غرناطہ کے تمام گھروں کی تلاشی لی اور عربی زبان میں جتنی کتابیں بھی اس کو جہاں کہیں سے بھی ملیں، اس نے سب کو ضبط کر لیا۔ اس ترکیب سے قریباً دس لاکھ کتابیں جمع ہو گئیں۔ ان میں نہ صرف قیمتی جلدیں قرآن شریف کی ہی تھیں، بلکہ زمانہ دولت بنی امیہ کی وہ کتابیں بھی تھیں جو دارالسلطنت قرطبہ کی مایہ فخر و ناز تھیں اور نسلاً بعد نسل بے بہا جواہرات سمجھی جاتی تھیں اور جن کی حفاظت و اضافہ کو تمام سلاطین غرناطہ اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔ تاریخ اور سائنس کے وہ رسائل جو تمام واقعات پر مشتمل تھے،

Marfat.com

میں ہوں، میں نے اپنے باپ کے ساتھ نافرمانی اور سرکشی کا معاملہ کیا اور دشمنوں کو ملک پر حملہ کرنے کی دعوت دی لیکن بہر حال اللہ نے مجھ کو میرے گناہوں کی سزا دی ہے تاہم یہ باور کرنا چاہیئے کہ میں نے اس وقت یہ معاہدہ قبول کیا ہے تو محض اس لئے کیا ہے کہ تم لوگوں کا اور تمہارے بچوں کا خون خوامخواہ نہ بہے۔ تمہاری عورتیں لونڈیاں اور باندیاں نہ بنیں اور تمہاری شریعت اور تمہارے املاک و متاع ان بادشاہوں کے زیر سایہ محفوظ رہیں، جو بہر حال بدنصیب ابوعبداللہ سے بہتر ہوں گے۔"

فرڈی نینڈ کی طرف سے دو ماہ دس دن کی مدت دی گئی تھی کہ ابوعبداللہ اس مدت میں فرڈی نینڈ کا قبضہ الحمراء پر کرا دے گا لیکن ابوعبداللہ اس درجہ پریشان اور سراسیمہ تھا کہ اس نے مدت سے پہلے ہی مندرجہ بالا تقریر کے دوسرے دن فرڈی نینڈ کو پیغام بھیجا کہ آپ شہر پر قبضہ کر لیجئے۔ فرڈی نینڈ نے ایک پادری کو اس پر مقرر کیا کہ سب سے پہلے وہ ایک جماعت کے ساتھ غرناطہ میں داخل ہو کر قلعہ الحمرہ کے سب سے بڑے برج کے اوپر سے اسلامی نشان کو گرا کر اس کی جگہ صلیب کا نشان نصب کرے تا کہ اسے دیکھتے ہی ملکہ اور بادشاہ پرجوش اور پُرامنگ ہو کر شہر میں داخل ہوں۔ اس قرارداد کے مطابق اب دونوں طرف غرناطہ کو الوداع کہنے اور اس میں داخل ہونے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ایک جانب بدنصیب ابوعبداللہ اور اس کا تمام خاندان جورات بھر اپنا ساز و سامان درست کرتا رہا اور غرناطہ سے پیش آنے والی جدائی کے غم میں الحمرا کے ایک ایک در و دیوار اور طاقچہ و محراب کو حسرت و افسوس سے تکتا اور ان پر آنسو بہاتا رہا اور دوسری جانب شاہ قسطیلہ کے کیمپ میں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے کہ بس اب رات کا تاریک پردہ درمیان میں حائل ہے۔ اس کے اٹھنے کی دیر ہے کہ علی الصبح غرناطہ پر قبضہ ہو جائے گا۔

چنانچہ ابوعبداللہ اپنے متعلقین کو لے کر الحمرا سے نکلا اور ابھی تھوڑی دور ہی آیا تھا کہ اس کو فرڈی نینڈ کا فرستادہ پادری مع ایک جماعت کے ملا جسے قلعے کی کنجیاں حوالے کرتے ہوئے اس نے کہا" جاؤ! اور اب قلعوں پر قبضہ کر لو جن کو اللہ نے ہماری بداعمالیوں کے باعث ہمارے قبضہ سے نکال کر تمہارے قبضہ میں دے دیا ہے۔" پادری نے الحمرا میں داخل ہو کر امر شاہی کے مطابق اسلامی نشان کو گرا کر اس کی جگہ صلیبی پرچم لہرایا۔ فرڈی نینڈ، ازبلا اور تمام عیسائی فوج نے اسے دیکھا تو ان کی خوشی کی حد نہ رہی۔ فوراً بادشاہ اور ملکہ گھٹنوں کے بل بارگاہ خداوندی میں شکر بجالائے۔ تمام فوج نے ان کی پیروی کی۔ اس سے فارغ ہو کر یہ لوگ غرناطہ میں داخلہ کے لئے روانہ ہوئے۔ دریا کے کنارے ایک چھوٹی سے جامع مسجد تھی۔ ابھی وہاں پہنچے ہی تھے کہ ابوعبداللہ مل گیا۔ ابوعبداللہ نے فرڈی نینڈ کو دیکھتے ہی چاہا کہ سواری سے اتر پڑے لیکن بادشاہ اور ملکہ دونوں نے منع کر دیا۔ اب ابوعبداللہ نے چاہا کہ بادشاہ کی دست بوسی کرے لیکن اس نے یہ بھی نہ کرنے دیا۔

امیر شکیب ارسلان نے ایک روایت نقل کی ہے کہ ابوعبداللہ نے ملکہ ازبلا کے ہاتھوں کو چومنا چاہا تو اس نے بھی اپنے ہاتھ نہ پھیلائے اور ابوعبداللہ کا اضطراب دیکھ کر اسے تسکین کے لئے دلاسا دیا اور ابوعبداللہ کا چھوٹا بیٹا جو اس کے پاس بطور ضمانت گرفتار تھا، وہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد ابوعبداللہ نے شہر کی کنجیاں بادشاہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا:
"یہ کنجیاں اسپین میں عربوں کے اقتدار کی آخری نشانی ہیں، آپ انہیں لے لیجئے کیونکہ اللہ کی مشیت کے مطابق اب ہمارا

Marfat.com

ملک، مال و متاع اور ہمارے جسم یہ سب آپ کی ملکیت ہو گئے ہیں۔ امید ہے کہ آپ نے جیسا وعدہ کیا کہ اسی طرح آپ ان کے ساتھ رحم و کرم اور رافت و نرمی کا معاملہ کریں گے۔" فرڈی نینڈ نے جواب دیا: "کوئی شبہ نہیں کہ ہم نے جو وعدہ کیا ہے اس کے مطابق ہی معاملہ کریں گے۔" اس گفتگو کے بعد کنجیاں فرڈی نینڈ نے ملکہ ازبلا کے سپرد کر دیں، اس نے اپنے بیٹے پرنس جون کو دیں اور جون نے کاؤنٹ ٹنڈل کے حوالے کر دیں جو غرناطہ کی فوج کا کمانڈر بنایا گیا تھا۔

اب فرڈی نینڈ، اس کی ملکہ ازبلا اور اس کا تمام لاؤلشکر غرناطہ کی طرف قبضہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے اور ادھر بدبخت بدنصیب ابوعبداللہ نے وادئ برشانہ میں اس مقام کا رخ کیا جو اس کے لئے مقرر کر دیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی پشت کی جانب ایک حسرت آمیز نگاہ غرناطہ کی آبادی اور قصرالحمرا کے میناروں اور گنبدوں پر ڈالی۔ اس کے تمام ساتھی اس وقت اس کے ساتھ غرناطہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے لیکن ان کی زبانیں گنگ تھیں، منہ سے ایک حرف نہ بول سکتے تھے۔ ابھی وہ اس حسرت انگیز اور دردناک نظارہ میں محو تھے کہ قلعہ الحمرا کے اوپر سے توپوں اور گولوں کے چلنے کی آواز آئی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ مسلمانوں کی حکومت ختم ہو گئی اور عیسائیوں کے پرچم نے اسے فتح کر لیا ہے۔ ابوعبداللہ اس وقت ضبط نہ کر سکا، بے ساختہ اس کا جی بھر آیا اور زار و قطار رونے لگا۔ ابوعبداللہ کی ماں عائشہ جو نہایت عقل مند اور فرزانہ تھی، اس نے بیٹے کو اس طرح روتے ہوئے دیکھا تو بولی: "اب تو عورتوں کی طرح رو رہا ہے لیکن تجھ سے پہلے یہ نہ ہو سکا کہ مردوں کی طرح غرناطہ کا دفاع کرتا۔" ابوعبداللہ کے وزیر یوسف نے بھی اسے دلاسا دینے کی کوشش کی لیکن آنسوؤں کا ایک دریا تھا جو اس کی آنکھوں سے رواں تھا اور کسی کل اسے چین نہیں آتا تھا۔ البشرات کی یہ پہاڑی جس پر کھڑے ہو کر ابوعبداللہ اور اس کے ساتھیوں نے غرناطہ پر حسرت انگیز نگاہ واپسیں ڈالی تھی، "دمِ واپسیں عرب" کے نام سے مشہور ہو گئی اور اب تک اسی نام سے یاد کی جاتی ہے۔ امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی سیاحت اسپین کے دوران اس مقام کو دیکھا ہے۔

ابوعبداللہ کی وفات

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے فرڈی نینڈ نے البشرات کا علاقہ ابوعبداللہ اور اس کے خاندان کی رہائش کے لئے متعین کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے بہت کچھ عہد و پیمان بھی کئے تھے لیکن غرناطہ پر اقتدار پانے کے بعد اس نے تمام عہد و مواثیق کو "گلدستہ طاق نسیاں" بنا کر رکھ دیا۔ چنانچہ ابوعبداللہ پر اندلس کی وسیع سرزمین کا چپہ چپہ تنگ ہو گیا اور آخرکار انجام یہ ہوا کہ فرڈی نینڈ نے البشرات کا علاقہ بھی اونے پونے خرید لیا اور ابوعبداللہ اندلس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ کر افریقہ چلا گیا۔ یہاں مراکش کے بادشاہ کا ملازم ہو گیا اور اسی حالت میں 940ھ میں اس دنیا سے بھی رخصت ہو گیا۔

ابوعبداللہ نے یوسف اور احمد دو لڑکے اپنی جسمانی یادگار کے طور پر چھوڑے۔ شہر فاس میں جہاں ابوعبداللہ کا انتقال ہوا تھا اب تک اس کی اولاد موجود ہے۔ امیر شکیب ارسلان نے ان سے ملاقات کی ہے۔ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں: "یہ لوگ نہایت عسرت اور فقر کی زندگی بسر کرتے ہیں، جن لنگر خانوں سے فقرا اور مساکین کو کھانا تقسیم ہوتا ہے، انہی پر ان لوگوں کا گزر ہے۔" بلاشبہ سب طاقتوں کا مالک اللہ ہی ہے۔

مسلمانوں) کے اجداد نے غصب کر لیا تھا۔ جو اس وقت اپنی سرزمین کو اپنی ملکیت سمجھے بیٹھے ہیں۔ اس ملک کو بہت جلد اپنے ہاتھ سے اس طرح کھو دیں گے جس طرح خود ان کے (فرڈی نینڈ اور ازبلا) کے اجداد نے کھو دیا تھا۔" آگے چل کر فرڈی نینڈ نے لکھا تھا کہ "میری سلطنت میں تمام غیر عیسائی باجگزاروں کو وہی حقوق حاصل ہیں جو دنیا بھر میں ہر جگہ مسلمانوں کی سلطنت میں عیسائیوں کو حاصل ہیں۔"

اور دوسری جانب اس زمانہ میں سلطان بایزید ثانی امیر مصر سے برسرپیکار تھا۔ فرڈی نینڈ نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے بایزید ثانی سے وعدہ کیا کہ میں آپ کے دشمنوں کے خلاف آدمیوں اور جہازوں سے آپ کی مدد کروں گا۔ فرڈی نینڈ کی یہ تدبیر کارگر ہوئی اور اس کے وعدہ کا سلطان بایزید ثانی پر یہ اثر ہوا کہ اس نے اندلس کے بےکس و بےبس مسلمانوں کی کوئی خبر نہ لی۔ جیسا کہ اسکاٹ نے لکھا ہے: "اسلام کے نام لیواؤں کو اپنے حال اور اپنی قسمت پر چھوڑ دیا۔"

اب ابو عبداللہ نے قصر الحمرا میں ایک مجلس مشاورت منعقد کی جس میں غرناطہ کے بڑے بڑے شیوخ وعمائد اور امراء و وزراء شریک تھے۔ ان میں جو بعض بڑے پرجوش اور غیرت مند تھے، ان کی رائے قطعی طور پر یہی تھی کہ مسلمانوں کو اپنے آخری قطرہ خون تک لڑنا چاہیے۔ چاہے انجام کچھ بھی ہو۔ بہر حال غرناطہ کو اس طرح دشمن کے حوالے کر دینا سخت ننگ و عار اور بزدلی کی بات ہے لیکن اکثریت کے نقار خانہ میں اکیلے طوطی کی آواز کیا اثر پیدا کر سکتی تھی۔ آخر ابو عبداللہ نے اپنے وزیر ابوالقاسم عبدالملک کی معرفت فرڈی نینڈ سے صلح کی بات چیت شروع کی اور انجام کار ایک صلح نامہ مرتب ہوا۔ جس پر شاہ قسطیلہ اور ابو عبداللہ دونوں کے دستخط ہو گئے اور اس پر مسلمانوں کی حکومت جو آٹھ سو سال سے قائم تھی، کا یہاں سے بالکل خاتمہ ہو گیا۔

یہ صلح نامہ جو درحقیقت مسلمانانِ اندلس کی بدبختی کی آخری دستاویز تھا، نہایت طویل تھا اور جیسا کہ شکیب ارسلان نے اپنی کتاب "آخر بنی سراج" میں تصریح کی ہے۔ پچپن دفعات پر مشتمل تھا ان میں سے چند اہم دفعات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

> "تمام چھوٹے بڑے مسلمانوں کو امن دیا جائے گا۔ ان کے اموال، جاگیریں اور جائیدادیں سب محفوظ رہیں گی، ان کے مذہبی معاملات اور اوقاف و مساجد آزاد رہیں گی، ان کے معاملات و مقدمات کا تصفیہ خود مسلمان قاضی یا حاکم کرے گا۔ جنگ میں جو مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا ہے اس کو غصب نہیں کیا جائے گا۔ مقررہ ٹیکس کے علاوہ ان پر کوئی نیا ٹیکس نہ لگایا جائے گا، جو عیسائی مسلمان ہو گئے ہیں ان کو ترکِ اسلام پر مجبور نہ کیا جائے گا اور اسی طرح کسی مسلمان کو بجبر عیسائی بنانے کی کوشش نہ کی جائے گی۔ اگر کوئی مسلمان افریقہ جانا چاہے گا تو حکومت اس کو اپنے انتظام پر افریقہ پہنچائے گی، کوئی عیسائی کسی مسلمان کے گھر میں داخل نہ ہو گا اور نہ ہی اس کی دیوار پر چڑھے گا۔ مسلمانوں کو عیسائی فوجیوں کی دعوت کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ مسلمانوں کو لباس میں پوری آزادی ہو گی یعنی انہیں کسی خاص وضع قطع کے اختیار کرنے یا کوئی خاص علامت لگانے پر مجبور نہ کیا

Marfat.com

جائے گا۔ کوئی عیسائی کسی مسلمان کا راہ چلتے یا کہیں اور مذاق نہ اڑائے گا، اس پر فقرہ نہ کسے گا، اس کے ساتھ تمسخر نہ کرے گا اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اس کو قرار واقعی سزا دی جائے گی۔ جو مسلمان جنگی مجرم ہیں ان کو رہا کر دیا جائے گا، اگر کوئی مسلمان غلام اپنے مالک کے پاس سے بھاگ کر غرناطہ آ جائے گا تو اسے مامون سمجھا جائے گا اور بادشاہ اس کی قیمت غلام کے مالک کو ادا کر دے گا۔"

یہ معاہدہ عیسوی تاریخ کے لحاظ سے 30 دسمبر 1491ء مطابق یکم ربیع الاول 897ھ کو ہوا تھا اور اس پر علاوہ فرڈی نینڈ کے ملکہ ازبلا، شاہی خاندان کے شہزادے اور شہزادیاں، پادری اور دیگر مذہبی پیشواء، امراء، وزراء، دربار و عمائد و ارکانِ سلطنت کے دستخط ثبت تھے اور فرڈی نینڈ اور اس کی بیوی ازبلا نے اس بات کا عہد کیا تھا کہ دونوں اس صلح نامہ کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کی پابندی کریں گے اور جس طرح یہ عہد نامہ خود ان دونوں کے لئے اور ان کے تمام حکام و عمال اور امراؤ اعیان کے لئے واجب العمل ہے اسی طرح انکے قائم مقام ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد سب اس عہد نامہ کے مطابق عمل کریں گے اور اس سے سرِ مو انحراف نہ کریں گے۔

یہ عہد نامہ تو وہ تھا جس کا تعلق عام مسلمانوں اور ان کے مفاد سے تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور عہد نامہ ترتیب دیا گیا جو خاص ابو عبداللہ کی ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ اس عہد نامہ میں چودہ دفعات تھیں جن کا ماحصل یہ تھا کہ شاہ فرڈی نینڈ اور ازبلا ان دونوں نے کچھ املاک اور اراضی اور شہر سلطان ابو عبداللہ کو دیے ہیں انہی میں سے ایک البشرات بھی تھا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

علاوہ بریں اس بات کا بھی وعدہ کیا گیا تھا کہ ابو عبداللہ کو وہاں کے سکہ کے حساب سے جس کو "ٖمرادید" کہا جاتا تھا، ایک کروڑ چالیس لاکھ اور پانچ سو کی رقم دی جائے گی لیکن شرط یہ تھی کہ یہ رقم اس وقت حوالہ کی جائے گی جبکہ فرڈی نینڈ اور ازبلا قلعہ الحمراء میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر خاص ابو عبداللہ سے یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ جب تک وہ اندلس میں قیام کرے گا اس سے کوئی محصول نہیں لیا جائے گا اور اگر اس نے کبھی اس ملک کو چھوڑ کر کہیں اور آباد ہونا چاہا تو اس کی ان زمینوں اور جائیدادوں کو مناسب قیمت پر خرید لیا جائے گا اور اگر اس نے خود ان کو فروخت نہ کرنا چاہا تو وہ اپنا کوئی قائم مقام یا کارندہ ان کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لئے یہاں چھوڑ جائے۔ وہ ہر سال ان جائیدادوں اور جاگیروں کی آمدنی وصول کر کے ابو عبداللہ کو بھیج دیا کرے گا۔ پھر جو ابو عبداللہ بحری سفر کرے گا تو اس کے لئے اس کے تمام متعلقین کے لئے کشتیوں وغیرہ کا انتظام فرڈی نینڈ کی حکومت کی جانب سے کیا جائے گا۔ امیر شکیب ارسلان کی تحقیق کے مطابق یہ دوسرا معاہدہ بتاریخ 25 دسمبر 1491ء کو ہوا تھا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابو عبداللہ نے اپنے وزیر کے توسط سے جو یہ معاہدہ بالا ہی بالا کر لیا تھا۔ اہل غرناطہ کو اس کی سن گن ہوئی تو وہ سخت برہم ہوئے۔ حامد بن زراۃ نامی ایک درویش کے جوش دلانے اور اکسانے پر بیس ہزار اہل غرناطہ مسلح ہو کر جنگ لڑنے کے لئے نکلے بھی لیکن کچھ ایسے اسبابِ سماویہ پیش آئے کہ یہ اس مشکل سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ اس واقعہ کے دوسرے روز ابو عبداللہ شہر کے رؤسا کے ساتھ قلعہ الحمراء سے نکلا اور مسلمانوں کو خطاب کر کے کہا:

"مسلمانو! میں اقرار کرتا ہوں کہ اس ذلت اور رسوائی میں کسی کا کوئی گناہ نہیں ہے۔ گنہگار صرف

893ھ میں اس کو یہ بات صاف طور پر محسوس ہوگئی کہ درحقیقت یہ سب کچھ فرڈی نینڈ کی ایک خطرناک سیاسی چال تھی اور اس کا اصل مقصد مسلمانوں کو خانہ جنگی میں مبتلا کر کے ان کی مرکزی طاقت کو کمزور کرنا اور موقع پا کر خود اس پر قابض ہو جانا تھا۔

چنانچہ 894ھ میں فرڈی نینڈ شاہ قسطیلہ نے ابو عبداللہ کے خلاف فوج کشی کر دی۔ ابو عبداللہ نے مقابلہ کیا لیکن انجام کار اس شرط پر صلح کر لی کہ صوبہ بسطہ فرڈی نینڈ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس صلح نامہ میں اس بات کی صاف شرط تھی کہ مسلمانوں کے جان و مال سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ صلح نامہ کے مطابق بسطہ شاہ قسطیلہ کی تحویل میں دے دیا لیکن اس نے صلح نامہ کی شرائط کا ذرا لحاظ اور پاس نہ کیا اور یہاں کے مسلمانوں کے مال و اسباب پر زبردستی قبضہ کر لیا۔

سلطان الزغل غرناطہ پر ابو عبداللہ کی استیلا کی خبر سن کر وادی آش میں مقیم ہو گیا تھا اور وہاں کا بادشاہ بنا بیٹھا تھا۔ فرڈی نینڈ نے کسی طرح دھوکہ دے دلا کر اور الزغل کو سبز باغ دکھا کر پہلے صوبہ المریہ اور پھر وادی آش پر قبضہ کر لیا۔ اب اس کے لئے صرف غرناطہ کی مہم سر کرنا باقی تھا۔ چنانچہ اس نے ابو عبداللہ کے پاس پیغام بھیجا کہ جس طرح الزغل نے المریہ اور وادی آش دونوں خود بخود اپنی رضامندی سے ہماری سپرد کر دیے ہیں غرناطہ کا قلعہ الحمرا بھی تم ہمارے حوالے کر دو۔ اس کے بدلہ میں جتنی دولت طلب کرو گے وہ مل جائے گی۔ اس کے علاوہ اندلس کا جو صوبہ کہو گے اس پر تمہاری حکومت قائم کر دوں گا۔ بے غیرت ابو عبداللہ نے جواب دیا کہ مجھے تو آپ کا کہا ماننے میں پس و پیش نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ میری رعایا کسی طرح اس کو گوارا نہیں کر سکتی۔

ادھر فرڈی نینڈ اور ابو عبداللہ میں نامہ و پیام کا سلسلہ جاری تھا اور ادھر ابو عبداللہ نے مسلمانوں کے جوش اور ان کے مطالبہ سے متاثر ہو کر عیسائیوں کے بعض قلعوں پر حملہ آور ہو کر قبضہ کر لیا۔ اب شاہ قسطیلہ نے براہ راست غرناطہ پر فوج کشی کر دی لیکن عین غرناطہ کی دیواروں کے سایہ میں مسلمانوں نے شجاعت و پامردی کا ایسا عجیب و غریب مظاہرہ کیا کہ شاہ قسطیلہ کو محاصرہ اٹھانا پڑا۔ عیسائیوں کے پلٹتے ہی ابو عبداللہ نے البشرات کی پہاڑی پر موجود فوج کے ساتھ حملہ کر دیا اور جو عیسائی فوج یہاں رہ گئی تھی اس کو تہہ تیغ کر کے پورے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

یہ حقیقت کس درجہ المناک ہے کہ مسلمانوں کی سلطنت تمام جزیرہ نمائے اندلس میں سمٹتے سمٹتے اب صرف غرناطہ کے چھوٹے سے رقبہ میں محدود ہو کر رہ گئی تھی اور عیسائی برابر صوبہ بصوبہ اور علاقہ بہ علاقہ قبضہ کرتے چلے آتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ یہ روز بد انہیں اپنی خانہ جنگیوں اور باہمی نبرد آزمائیوں کی وجہ سے دیکھنا پڑا ہے۔ لیکن اب بھی ان کی آنکھ نہ کھلی اور خود غرضی کے غلبہ نے انہیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اس خانماں برباد مصیبت سے اپنے تئیں محفوظ رکھ سکتے۔ چنانچہ جب البشرات کے علاقہ پر ابو عبداللہ کا قبضہ ہوا ہے اس کا چچا الزغل اس کے آس پاس ہی کہیں مقیم تھا۔ وہ البشرات پر ابو عبداللہ کے قبضہ کو گوارا نہ کر سکا اور یہاں پہنچ کر فتنہ و فساد پھیلانے لگا۔ اس طرح چچا بھتیجا دونوں پھر خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے۔

فرڈی نینڈ شاہ قسطیلہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور حملہ کر کے البشرات اور بعض اور دوسرے قلعوں کو فتح کر لیا۔ اپنی عادت کے مطابق یہاں بھی اس نے مسلمانوں کو قتل کیا، جلاوطن کیا اور ان کے مال و اسباب پر زبردستی قبضہ جما لیا۔ اب اس کو یہ ضرورت بھی نہ رہی تھی کہ الزغل کو اپنا آلۂ کار بنائے، چنانچہ اس نے الزغل سے صاف صاف کہہ دیا کہ تم اگر افریقہ جانا چاہتے ہو

Marfat.com

تو چلے جاؤ۔ ہم تمہارے لیئے اس کا انتظام کر دیں گے۔ الزغل نے مجبور و بے بس ہو کر ایسا ہی کیا اور افریقہ چلا آیا۔ یہاں مقام تلمسان میں سکونت اختیار کر لی۔ یہیں جاں بحق ہو گیا۔ اس کے بعد پورے جزیرہ نما میں ابو عبداللہ رہ گیا تھا۔

فرڈی نینڈ اپنی چالاک اور ہوشیار بیوی ازبلا کی تحریص و ترغیب سے 896ھ میں غرناطہ پر حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ وہ بڑے ساز و سامان اور جاہ و حشم کے ساتھ آیا تھا۔ غرناطہ کے سامنے خیمہ زن ہو کر ملکہ ازبلا نے ایک شہر کی بنیاد رکھ دی یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب فرڈی نینڈ کی فوج غرناطہ کو فتح کیئے بغیر واپس نہ ہو گی۔

یہ محاصرہ سات آٹھ ماہ تک جاری رہا۔ اہل غرناطہ نہایت پامردی اور استقلال کے ساتھ اسے انگیز کرتے رہے لیکن جب سردی زیادہ شدید ہو گئی اور برف باری کے باعث وہ پہاڑی راستے جن سے ان کو سامانِ رسد پہنچایا جاتا تھا، بند ہو گئے تو ان لوگوں نے سلطان ابو عبداللہ سے میدانِ جنگ میں جانے اور دشمن کے خلاف آخری رمق زندگی تک لڑتے رہنے کی اجازت طلب کی لیکن ابو عبداللہ کی ہمت جواب دے چکی تھی، وہ ڈرتا تھا کہ بیس ہزار سے کم تعداد کی مسلمان فوج ایک لاکھ کے قریب عیسائی فوج سے کس طرح عہدہ برآ ہو گی۔

محاصرہ کی سختی اور شدت سے تنگ آ کر غرناطہ کے غریب مسلمانوں نے اخوتِ اسلامی کے نام پر افریقہ اور قسطنطنیہ دونوں کی اسلامی حکومتوں کو مدد کے لیئے لکھا اور ایسے رقت انگیز الفاظ میں لکھا کہ بقول مسٹر اسکاٹ کے "سنگدل کو بھی موم کر دیں" چنانچہ قسطنطنیہ کے بادشاہ بایزید ثانی کو انہوں نے جو خط لکھا تھا اس میں تحریر تھا کہ:

> "صدیوں سے عیسائی ہم کو دباتے چلے آ رہے ہیں اب ہم ان کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں، ہم کو ہر طرح کا نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ ہمیں ہر طرح کی قربانیاں دینی پڑ رہی ہیں۔ ہمارے بھائی غلام بنا لیئے گئے ہیں۔ جن مشکلات اور مصائب میں ہم گرفتار ہیں ان کا آخری اور لازمی نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ مذہب اسلام کی ہستی اس ملک میں ختم ہو جائے اور کوئی مسلمان باقی نہ رہے۔"

سلطان بایزید ثانی پر اس خط کا جو اثر ہوا اسے بھی مسٹر اسکاٹ کی زبانی سنیئے، لکھتے ہیں:

> "اپنے ہم مذہبوں کی یہ دردناک تحریر دیکھ کر سلطان پر کچھ اثر ہوا کہ اس نے دو اور فرانسکن راہبوں کو روم بھیجا اور پوپ کو یہ دھمکی دی کہ سلطنت ترکی میں تمام عیسائی آزادیٔ خیال و فعال رکھتے ہیں۔ اگر مسلمانانِ اندلس پر یہی ظلم جاری رہا تو اس کا بدلہ وہ اپنی عیسائی رعایا سے لیں گے، ورنہ وہ فوراً اپنے رعب و اقتدار کو کام میں لا کر اپنے کیتھولک غلاموں کو ان حرکتوں سے باز رکھیں جو وہ کر رہے ہیں۔"

پوپ نے سلطان کے دونوں ایلچیوں کو اپنا ایک خط دے کر فرڈی نینڈ کے پاس بھیج دیا لیکن اس میں مسلمانوں کے لیئے کوئی سفارش نہ تھی۔ صرف واقعات کا اعادہ کیا گیا تھا۔ فرڈی نینڈ اور ازبلا زمانہ بھر کے چالاک اور عیار تھے۔ انہوں نے ایک طرف تو پوپ کو یہ جواب دے کر زم کر دیا کہ "تمام جزیرہ نمائے اندلس پر ان کا حق ہے، اس حق کو ان لوگوں (یعنی

جلال الدین اکبر شہنشاہ ہند

(5رجب 949ھ 15 اکتوبر 1541ء تا 13 جمادی الثانی 1014ھ 17 اکتوبر 1605ء)

جلال الدین اکبر خاندانِ مغلیہ کا تیسرا بادشاہ عمر کوٹ سندھ میں پیدا ہوا۔ یہ دور ہمایوں کی جلاوطنی کا تھا لیکن وہ ہندوستان کا بادشاہ رہ چکا تھا۔ اکبر کی پیدائش کے وقت اس کے کمر بند میں مشکِ نافہ موجود تھی۔ اس نے اسے اپنے ساتھیوں میں تقسیم کیا تا کہ بادشاہی کا بھرم رہ سکے۔ خانِ اعظم مرزا عزیز کوکلتاش (جس کا تفصیلی ذکر آگے چل کر آئے گا) اکبر کا رضاعی بھائی تھا۔ اکبر ابھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ بادشاہ بیگم حمیدہ بانو نے مرزا عزیز کی والدہ سے کہہ دیا کہ میرے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو اسے تم دودھ پلانا۔ اکبر کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو انہوں نے اکبر کو دودھ پلانا شروع کر دیا اور زیادہ تر انہی نے یہ خدمت انجام دی۔ اکبر کی پیدائش کے تھوڑے عرصہ بعد ہمایوں اور بادشاہ بیگم ایران چلے گئے اور اکبر کی پرورش مرزا عزیز کی والدہ، اور والد کے سپرد کر گئے۔ وہ اسے لے کر ہمایوں کے بھائی مرزا عسکری کے پاس پہنچے اور بچے کی خبر گیری کرتے رہے۔

دو سال سے زیادہ عرصہ کے بعد ہمایوں ایران سے افغانستان آیا اور کابل فتح کر لیا تو اکبر اپنی حقیقی ماں اور باپ سے ملا لیکن بچے کی نگہداشت اب بھی مرزا عزیز کی والدہ کے سپرد تھی۔ اکبر پونے پانچ سال کا تھا جب ہمایوں کے خلاف اس کے دوسرے بھائی کامران نے بغاوت کر دی۔ کامران اس وقت کابل کے اندر تھا اور ہمایوں نے باہر گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ بے درد چچا نے یہ ظلم کیا کہ جس مورچے پر گولوں کا زور تھا وہاں دیوار پر معصوم بچے کو بٹھا دیا لیکن اس وقت بھی مرزا عزیز کی والدہ نے بڑی محبت اور وفاداری دکھائی۔ اس نے بچے کو گود میں لیا اور جدھر سے گولے آ رہے تھے، ادھر کو پشت کر کے بیٹھ گئی تا کہ اگر کوئی گولہ لگے تو پہلے اسے لگے، پھر بچے کو۔ اکبر کی خوش قسمتی سے یہ مرحلہ بھی گزر گیا۔ اکبر پیار سے مرزا عزیز کی والدہ کو جی جی کہتا تھا اور بڑے ادب سے پیش آتا بلکہ ماں سے زیادہ خاطر کرتا تھا۔

ہمایوں کو ہندوستان میں دوبارہ آئے ہوئے چند مہینے گزرے تھے اور خاندانِ سور اور مغلوں میں کشمکش ابھی چل رہی تھی کہ بادشاہ کتب خانہ کی سیڑھی سے گر کر انتقال کر گیا اور دہلی اور آگرہ پھر خاندان سور کے ہاتھ میں چلے گئے۔ مغلیہ حکومت کا استحکام اور اس کے اصل آغاز کا بارِ گراں ہمایوں کے تیرہ سالہ بیٹے اکبر کے کندھوں پر آن پڑا۔ اکبر 1556ء میں تخت نشین ہوا اور اس کی تخت نشینی سے اسلامی ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ بیرم خاں ہمایوں کا ساتھی جرنیل

Marfat.com

عرف خان خاناں اکبر کا اتالیق بنا، جسے استحکامِ سلطنت کے بعد معزول کر کے اکبر نے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے چونکہ بیرم خان شیعہ مسلک سے متعلق تھا، اس لئے اکبر کی شخصیت پر بیرم خاں کے اثرات تاحیات رہے۔

اکبر کے دادا بابر کے تعلقات ایران کے صفوی خاندان کے بانی شاہ اسمٰعیل سے بڑے خوش گوار تھے۔ جب شیر شاہ افغان نے ہمایوں کو ہندوستان سے نکال دیا اور اسے دوبارہ تخت و تاج ملا تو اس کے لئے طہماسپ صفوی نے ہمایوں کی بڑی مدد کی۔ ہمایوں نے ڈیڑھ سال کا عرصہ ایران میں گزارا۔ جب انسان کسی کی پناہ میں رہ رہا ہو تو پناہ دینے والے کے معاملے میں پناہ گزین کی انفعالیت اور اثر پذیری بہت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ ہمایوں کی شخصیت پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ بعض روایات اس کی شاہد ہیں کہ اس نے اہلِ تشیع کا مذہب اختیار کر لیا تھا۔ طہماسپ صفوی نے دہلی کا تخت دوبارہ حاصل کرنے کے لئے نہ صرف فوج مہیا کی بلکہ فوج کے ساتھ ایران کے علماء فضلاء اور بااثر افراد کا ایک انبوہ کثیر بھی ساتھ بھیجا۔ ان لوگوں نے ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ جو اب تک موجود ہے۔ اسی لئے ایران کو "دبستانِ ہند" بھی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اکبر کو اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے جو ٹیم میسر آئی یا حالات نے اسے جس ٹیم کی گرفت میں دیا وہ ایرانی نژاد بااثر لوگ اور ان کے ہم خیال ہندوستانی افراد تھے۔ اس ٹیم میں اکبر کے نورتن بھی شامل تھے۔ اس ٹیم کی مدد سے اکبر نے اپنی سلطنت کو برصغیر میں امکانی حد تک وسیع کر لیا۔ لیکن اکبر کی تمام تر وسعت سلطنت و حکومت اور ہمہ جہتی طاقت نے اسلامیانِ ہند کے دین و مذہب کو کسی بھی بادشاہ سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ اکبر کی وفات کو چار صدیوں سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا لیکن اکبر کی پالیسی اور سوچ کا اثر اب تک بڑی شدت سے موجود ہے۔ اپنی سوچ کے مطابق اکبر نے جو پالیسی اختیار کی اس کا بظاہر مقصد ہندوؤں اور غیر مسلموں کی دل جوئی تھی تاکہ سلطنت کو استحکام حاصل ہو لیکن ہندوؤں کی شراکت اقتدار اور حرم شاہی میں ہندو عورتوں کی موجودگی سے بعد ازاں جو پیچیدگیاں پیدا ہوئیں ان سے سلطنت مغلیہ کبھی عہدہ برآ نہ ہو سکی۔

اکبر کے دربار میں ایک بدعتی شیخ مبارک اور اس کے دو بیٹے ابوالفضل اور فیضی ایسے افراد تھے جو اکبر کو راہ راست سے بھٹکانے اور اس کی ہیجانی سوچ اور آرزو کو پورا کرنے کے لئے حدیثیں گھڑ دیتے اور موجود احادیث کی ایسی تاویلات پیش کرتے کہ اکبر کا دل خوش ہو جائے اور یہ لوگ اپنے من کی مراد پائیں۔ یہ ان کا ہمہ وقتی مشغلہ تھا۔ فیضی سے زیادہ ابوالفضل نے اپنی عقل و دانش کو اکبر کی خوشنودی کے لئے استعمال کیا۔ اس نے ہی یہ فلسفہ تراشا کہ بادشاہ فوق البشر ہوتا ہے، اس کی مطلق العنانیت پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ ہر مذہب اور دین سے بالاتر ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ شہنشاہ ہے، اسی لئے وہ زمین پر نہیں صرف قالین پر قدم رکھتا ہے۔ عام انسانوں سے اونچا ہو کر تخت پر بیٹھتا ہے اور دربار سے باہر نکلتا ہے تو سوار ہو کر نکلتا ہے۔ یعنی زمین سے اس کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ شیخ مبارک اور ابوالفضل کی فلسفیانہ موشگافیوں کا یہ اثر تھا کہ ناخواندہ اور ان پڑھ ہونے کی بنا پر اس نے بزعم خود خیال کر لیا کہ ایک امی (ناخواندہ) پیغمبر نئے مذہب کا بانی ہو سکتا ہے تو وہ (اکبر) کیوں نہیں ہو سکتا۔

اس مغل فرمانروا کی ذہنی اپچ کے مطابق ایسے علماء اور صوفیاء مل گئے جو بادشاہ کی خوشنودی کے لئے ہر قسم کا فتویٰ دینے کے لئے آمادہ رہتے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ بات یا حرکت شرعِ اسلامی میں جائز بھی ہے یا نہیں۔ اس طرح ان نام نہاد

Marfat.com

صدرِاعظم قرہ مصطفیٰ نے اپنی حد تک ابراہیم کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن سازشی درباریوں نے حرم سلطانی کے ساتھ سازش میں شریک ہو کر قرہ مصطفیٰ کو قتل کرا دیا۔قرہ مصطفیٰ کے بعد سلطان زادہ پاشا کو یہ عہدہ دیا گیا اس نے ابراہیم کو الٹی پٹی پڑھا دی۔سلطان زادہ نے ابراہیم کے ذہن میں یہ عقیدہ اتار دیا کہ وہ ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ ہے،اس کا ہر قول و فعل الہام ربانی کے مطابق ہوتا ہے۔لہٰذا جو جی میں آئے کر گزرو۔اس سے ابراہیم ہر اخلاقی بندھن سے آزاد ہو گیا۔جب خزانہ عامرہ بھی اس کی عیش پسندی اور عیش پرستی کی ضروریات پوری نہ کر سکا تو اس نے سلیمان کے وزیرِاعظم کی طرح بڑے بڑے عہدوں کی بولی لگانی شروع کر دی۔لہٰذا اہلیت کی جگہ نااہلی اور نالائقی نے لے لی اور پورے معاشرے کا تمدن اور نظام درہم برہم ہو گیا۔

ابراہیم کو خوشبوئیں بالخصوص عنبر بہت پسند تھی۔ساتھ ہی اسے سمور سے بڑی رغبت تھی۔اس نے علاوہ اور محصولات کے رعایا پر"عنبر ٹیکس"اور"سمور ٹیکس"بھی لاگو کر دیے۔حکومت کے تمام عہدیداروں یعنی صوبوں کے والی،قاضی اور فوجی امرا وغیرہ کے نام فرمان جاری کر دیا کہ وہ سمور کی متعین مقدار ضرور مہیا کریں۔

جب ان بے جا ٹیکسوں کے باوجود حرم اور تعیشات کی شاہ خرچیوں کے لئے رقم کم پڑ گئی تو اس نے زبردستی لوگوں کی جائیدادیں اور جاگیریں ضبط کر کے فروخت کرنا شروع کر دیں۔یہ وہ حالات تھے جن کی وجہ سے رعایا میں پھیلی ہوئی بے چینی شدت اختیار کر گئی اور لوگ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ابراہیم کے کردار اور بے راہ روی کی وجہ سے علماء،فوج اور پایۂ تخت کا ہر بااثر طبقہ متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچا کہ ابراہیم کو معزول کر دیا جائے۔ینی چری کے سردار اس تحریک میں پیش پیش تھے۔انجام کار سب نے مل کر ابراہیم کے خلاف فردِ جرم تیار کر لی جو درج ذیل ہے:

> "بادشاہ نے اپنے جبر و تعدی سے دولتِ عثمانیہ کو تباہ کر دیا ہے،عنانِ سلطنت عورتوں کے ہاتھوں میں ہے،خزانہ ان کے اخراجات پورے کرنے سے قاصر ہے،رعایا برباد ہو گئی ہے،اعدا کی فوجیں شہروں کا محاصرہ کر رہی ہیں،ان کے بحری بیڑے درہ دانیال کو روکے ہوئے ہیں۔"

ابراہیم کی معزولی

اس فردِ جرم کے بعد تمام بااثر طبقوں نے جو قسطنطنیہ میں موجود تھے اور جنہوں نے فردِ جرم تیار کی تھی،نے ابراہیم کو معزول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔سلطانہ والدہ نے اس کو بچانے کی انتہائی کوشش کی بالآخر اسے بھی معزول کرنے والوں کی بات ماننی پڑی۔چنانچہ 18 رجب 1058ھ بمطابق 8 اگست 1648ء کو فوجی سرداروں اور دارالسلطنت کے تمام بڑے بڑے عہدیداروں نے شہزادہ محمد کو جس کی عمر اس وقت صرف سات سال تھی،تخت پر بٹھا کر اطاعت کا حلف لیا اور ابراہیم کا 8 سال دورِ حکومت ختم کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔

ابراہیم کا قتل

ابراہیم کی قید ابھی دس دن ہی پوری ہوئی تھی کہ فوج میں اس کی حمایت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور معزول کرنے

والوں کو اندیشہ ہوا کہ وہ دوبارہ تخت پر بٹھا دیا جائے گا۔ اس خطرہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے لئے انہوں نے مفتی اعظم سے یہ استفتا کیا کہ ایسے فرمانروا کو معزول اور قتل کرنا جائز ہے جو سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر ان لوگوں کو مامور نہیں کرتا جو اس کے اہل ہیں، بلکہ ایسے عہدوں کو قیمتاً خریدنے والوں کو تعینات کرتا ہے۔ مفتی اعظم نے ایک لفظ "ہاں" میں اس فتویٰ کا جواب دیا اور اس کے بعد ابراہیم کو قید میں قتل کر دیا گیا۔

ابراہیم کی ساری داستان ہمیں یاد دلاتی ہے کہ سترھویں صدی عیسوی میں ترک مسلم معاشرہ اتنا جاندار تھا کہ اسے ایک نااہل اور عیاش حکمران قابل برداشت نہیں تھا۔ اے کاش دولتِ عثمانیہ کے اداروں میں کمزوریاں وارد ہو گئیں اور ادارے بروقت دولتِ عثمانیہ کو راہِ راست پر نہ لا سکے اور تین براعظموں پر حکومت کرنے والی دولتِ عثمانیہ خاک کا ڈھیر بن گئی۔

Marfat.com

ابراہیم

(1049ھ تا 1058ھ بمطابق 1640ء تا 1648ء)

سلیمان اعظم سلیم اول کے دور میں مختلف صوبوں کا حاکم اور کئی اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو چکا تھا۔ جب وہ 26 سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا تو وہ ایک تجربہ کار اور مدبر سلطان کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اس کی تخت نشینی کا رعایا نے بڑی خوش دلی سے استقبال کیا۔ سلیمان نے 46 سال حکومت کی۔ اس نے طرزِ حکومت اور وسعت، حکومت کو اوجِ کمال تک پہنچا دیا۔ اتنے لمبے عرصہ حکومت میں شاید سلیمان کو اپنے معاملاتِ حکومت کو چلانے میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی نے آ گھیرا تھا۔ اس نے اپنے عروج کے ساتھ ہی زوال کی بنیاد رکھ دی تھی۔ جس کے اثرات آئندہ صدیوں میں اتنے طاقتور ہو گئے کہ بعد میں آنے والے حکمران بھی اس سے چھٹکارا نہ حاصل کر سکے۔ سلیمان نے اپنی مردم شناسی کے باوجود ابراہیم کو وزیر اعظم بنایا۔ اس پر بے بہا اعتقاد کیا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے نام کے ساتھ "سلطان" لگانا شروع کر دیا۔ جلتی پر تیل کا کام سلیمان کی روسی نژاد بیوی خرم نے کیا۔ اصلاح احوال کی بجائے سلیمان کے ذہن کو اتنا ماؤف کر دیا کہ بالآخر ابراہیم وزیر اعظم جو کہ سلیمان کا بہنوئی بھی تھا کو قتل کر دیا گیا۔ ابراہیم 13 سال وزیر اعظم رہا تھا۔ اس کے بعد خرم نے اپنی سحر انگیزی سے سلیمان کو رام کیا اور اپنے داماد رستم پاشا کو وزیر اعظم بنوا لیا۔ رستم پاشا اور کینہ پرور خرم کی سازشوں کے نتیجے میں سلیمان نے اپنے دو فرزند قتل کروا دیے بلکہ بایزید کے بیٹے اور سلیمان کے چار پوتے جو ایران میں مقیم تھے، انہیں بھی بزور قسطنطنیہ لا کر قتل کروا دیا۔

جب رستم پاشا وزیر اعظم بنا تھا اس نے تمام چھوٹے بڑے عہدوں کی، جن کا عطا کرنا اس کے اختیار میں تھا، بولی لگانی شروع کر دی۔ حتیٰ کہ فوجوں کے سپہ سالار بھی بھاری رقوم ادا کئے بغیر کسی عہدہ کے حق دار نہیں بن سکتے تھے۔ اس زر اندوزی اور رشوت ستانی کی وجہ سے رستم پاشا اتنا امیر ہو گیا تھا کہ وفات کے وقت اس کی جائیداد کی فہرست حسب ذیل تھی۔ اناطولیہ اور رومیلیا میں 815 مزروعہ زمینیں، 476 پن چکیاں، 1700 غلام، 2900 زرہ بکتر، 800 عمامے، 760 تیغے، 600 جلدیں قرآن پاک کی اور دوسری کتابیں اور بیس لاکھ دوکات۔

سلیمان کا ایک اور رویہ بھی دولتِ عثمانیہ کے زوال کا سبب بنا۔ حکومت کے جو عہدیدار جائز و ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی کر لیتا سلیمان اس سے تعرض نہ کرتا تھا۔ جس کے نتیجہ میں معاشرے میں ناانصافیوں اور ظلم و جبر کا چلن عام ہونے لگا۔

Marfat.com

دستور تھا کہ دیوان کی ہر مجلس میں سلطان خود موجود رہے تا کہ مجلس میں موجود ہر قسم کے حکومتی عہدیداروں سے بالمشافہ مل سکے اور ہر اہم معاملہ پورے سیاق و سباق کے ساتھ اس کے علم میں آ سکے۔ سلطان سلیمان نے یہ رسم چھوڑ کر علیحدہ کمرے میں بیٹھ کر چھوٹی سی کھڑکی کے ذریعہ حکومتی عہدے داروں سے بڑا کمزور رابطہ رکھنا شروع کر دیا۔ سلیمان کے جانشینوں نے اس رسم کو بھی ترک کر دیا۔

سلیمان جابر، مدبر اور مردم شناس بادشاہ ہونے کے باوجود اپنی روسی نژاد بیوی خرم کے سحر سے نہ نکل سکا۔ بڑے بڑے فیصلے اس کی دخل اندازی کے بغیر نہ ہو پاتے تھے۔ حتیٰ کہ خرم نے سلیمان کے لائق اور راست باز بیٹے مصطفیٰ کو قتل کروا کر اپنا نااہل اور عیاش بیٹا سلیم دوم ولی عہد بنوالیا۔ قصر اقتدار میں زوال کی جو دراڑیں ابھی گہری نہیں ہوئی تھیں، انہیں سلیم دوم اور دوسرے آنے والوں نے انتہا تک پہنچا دیا۔

سلیم کی وفات سے ابراہیم (کردار زیر بحث) کی تخت نشینی تک 74 سال کے عرصہ میں 6 حکمران تخت نشین ہوئے۔ ساتواں بادشاہ ابراہیم تھا۔ سلیمان کے دور میں فوج کو ہر حال میں چاق و چوبند رکھا گیا تھا اور بہت سارے ایسے افراد تیار کر دیئے گئے تھے جو آئندہ آنے والے وقتوں میں فتوحات کا سلسلہ جاری رکھ سکتے تھے۔ ابراہیم کے دور میں بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔

اتنی لمبی تمہید ہم نے اس لئے باندھی کہ زوال کے تمام وہ اسباب جن کی ذمہ داری سلطان سلیمان پر ڈالی جائے گی، دولتِ عثمانیہ کے اختتام تک ان سے گلو خلاصی نہ ہو سکی۔ ان اسباب کو دو آتشہ کرنے کے لئے ابراہیم نے اپنا حصہ بدرجہ اتم ڈالا۔

دولتِ عثمانیہ کے جانشینوں کو حکومت دینے سے پہلے قید رکھا جاتا تھا۔ اس کام کی پوری وجوہات تو وہی سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے اس قبیح فعل کو شروع کیا۔ بہر حال تخت نشینی سے پہلے ابراہیم بھی آٹھ سال تک محل میں قید رہا۔ حکومت کرنے کی تھوڑی بہت صلاحیت جو موجود تھی وہ بھی ختم ہو کر رہ گئی۔

ابراہیم کے پیشرو مراد رابع نے جب اقتدار سنبھالا تو اسے ایک تو خزانہ بالکل خالی ملا اور دوسرے ملک بدامنی اور بدانتظامی کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے 18 سالہ دورِ حکومت میں بڑی جزرسی اور محنت سے خزانہ کو بھرا اور سختی سے قانون پر عمل کرتے ہوئے ملک کے اندر اور باہر امن بحال کر کے دولتِ عثمانیہ کی ساکھ کو بحال کیا۔ اس غرض کے لئے ملک کے اندر سلطان رابع نے طاقت کا بے دریغ استعمال کیا جس سے کچھ بے گناہ لوگ بھی مارے گئے۔

ابراہیم نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے آپ کو صرف اور صرف عیش پرستی کی نذر کر دیا۔ قتل و خونریزی میں وہ مراد سے بھی آگے نکل گیا لیکن مراد کے ہر عمل کے سامنے حکومت کا مفاد ہوتا تھا جبکہ ابراہیم کو اس مفاد سے کوئی غرض نہ تھی۔ ابراہیم نے قتل و خون ریزی کا بازار گرم کیا تو صرف ذاتی اغراض کی تکمیل کے لئے۔ اپنے پیشرو مراد کا جمع کیا ہوا خزانہ حرم کے تعیشات پر بے دریغ خرچ کر دیا اور تمام وہ برائیاں جنہیں مراد نے ختم کیا تھا اور جو حکومتوں کو برباد کر کے رکھ دیتی ہیں ابراہیم کے دور میں اس کے ہاتھوں پورے زور و شور سے جاری ہو گئیں۔

Marfat.com

اور مسلمانوں کی دفائی ترقیات کی تصویر تھے۔ ان کے علاوہ ادب اور فلسفہ، علم نباتات، علم ہیئت اور علم طب کی کتابیں بھی ان میں ہی تھیں۔ یہی وہ علوم تھے جن پر اندلسی مسلمانوں نے توجہ اور محنت کی تھی، کوئی شک نہیں کہ ان کتابوں میں زمانہ قدیم کے تراجم بھی ہوں گے جو ایک زمانہ میں سکندریہ کے یونانی کتاب خانوں کی زینت ہوں گے۔ یہ تراجم کی کتابیں دریائے نیل کے دور دراز سواحل سے جزیرہ نمائے اندلس میں پہنچی تھیں اور بلحاظ خوبی تحریر و کتابت و زیبائش مسلمانوں کی شان و شوکت، تکلف اور جاہ و جلال کا پورا نمونہ تھیں اور سونے چاندی اور مختلف رنگوں سے ان کا ہر صفحہ مزین تھا۔ بعض کی جلدیں مرصع چمڑے کی تھیں، بعض پر مختلف الالوان کام تھا، بعض پر کچھوے کی ہڈی، سیپ، ہاتھی دانت اور جواہرات لگے ہوئے تھے اور ان کے کنارے خالص سونے کے تھے۔

علوم و فنون کے یہ بے بہا خزانے باب الرملہ کے چوک میں لا کر ڈھیر کر دیئے گئے اور ان کو آگ لگا کر راکھ کر دیا گیا۔ پی اسکاٹ اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> "اس وحشیانہ مذہبی جوش سے جو نقصان دنیا کو پہنچا اس کا ادنیٰ سا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ غالباً دنیا بھر میں ایسا قیمتی ذخیرہ علوم و فنون کہیں نہ ہو گا جس کو شیمنس نے اس تاریخی چوک میں خاکِ سیاہ کر دیا۔ اس وحشیانہ فعل سے مالی نقصان تو بہت ہوا ہی تھا مگر اس کا مہلک اثر جو سوسائٹی پر پڑا وہ بالکل ناقابل بیان ہے۔ اس سے وہ یگانہ روزگار علمی یادگاریں تباہ ہو گئیں جن کا بدل ناممکن ہے۔ گھڑی بھر میں اس نے صدیوں کا جمع کیا ہوا وہ بیش بہا خزانہ خاکِ سیاہ کر دیا جس سے زمانہ حال کے مورخ مسلمانانِ اندلس کی تہذیب کے متعلق ایسے ماخذ پیدا کر سکتے تھے جن کا علمی دنیا میں اب پتہ لگنا بالکل ممکن نہیں ہے۔"

خود یورپ کے مورخین کا اندازہ ہے کہ شیمنس کے حکم سے صرف غرناطہ میں جو کتابیں جلا کر خاک بھسم کی گئیں ان کی تعداد اسی ہزار تھی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بلاد اندلس میں جو کتابیں جلائی گئیں اگر ان کو بھی شامل کر لیا جائے تو تعداد کہاں تک پہنچتی ہے۔

زندہ آگ میں جلانا

پھر یہی باب الرملہ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، مسٹر اسکاٹ لکھتے ہیں کہ اس جگہ کے مشہور و معروف چوک میں جہاں ہزاروں کھیل ہوا کرتے تھے، جہاں شیمنس نے مسلمانوں کے علوم کو سپرد آتش کیا تھا، وہیں مجرم مسلمانوں سے آخر عبادت کفارہ کرا کر سب کو زندہ جلا دیا۔

قتل عام

استاذ کرد علی متعدد مغربی مورخین و محققین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ 1499ء سے جبر و تشدد اور عام ظلم و ستم کا عہد شروع ہو گیا۔ اہل سپین عربوں کے بچوں کو پکڑ لیتے تھے اور انہیں جبراً عیسائی بنا لیتے تھے اور اس کے لئے عذر یہ کرتے تھے کہ یہ ابتدا

Marfat.com

عیسائی ہی تھے۔ ان کو محکمہ تفتیش مذہبی کے سامنے پیش کیا جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان بدنصیبوں میں سے جن کو جلایا جا سکتا تھا، انہیں جلا دیتے تھے۔ چونکہ کئی لاکھ انسانوں کو نذرِ آتش کرنا آسان کام نہیں تھا، اس لئے لارڈ بشپ نے سرزمین اندلس کو عربوں کے وجود سے بالکل پاک وصاف کرنے کے لئے یہ تجویز کیا کہ جو عرب دین مسیحی اختیار نہ کریں وہ خواہ مرد ہوں یا عورتیں اور یا بچے، بہرحال ان سب کو قتل کر دیا جائے۔

فرانس کا مشہور انقلابی مصنف ولیٹر کہتا ہے کہ جب عربوں نے اسپین فتح کیا تو انہوں نے یہاں کے ایک عیسائی کو بھی اسلام اختیار کر لینے پر مجبور نہیں کیا لیکن یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ جب عیسائیوں کا اس ملک پر قبضہ ہو گیا تو شیمنس نے تمام عربوں کو عیسائی کر لینا چاہا اور اس سلسلہ میں اس نے پچاس ہزار مسلمانوں کو اس پر مجبور کیا کہ وہ ایسے مذہب کا نشان (صلیب) لگائیں جن پر وہ ایمان نہیں لائے تھے۔

1560ء میں یہ حکم جاری ہوا کہ مسلمان عربی زبان کا استعمال اور اپنے شعائر کو ترک کر دیں اور اپنا لباس بھی نہ پہنیں۔ ان مصائب سے تنگ آ کر مسلمانوں نے غرناطہ اور البشرات میں بغاوت کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی سال تک جنگ ہوتی رہی۔ آخر کار مسلمانوں کو شکست ہوئی اور 1604ء میں اعلانِ عام ہو گیا کہ مسلمان سرزمین اندلس کو بالکل خالی کر دیں۔ چنانچہ دو سال کی مدت میں قریباً پانچ لاکھ مسلمانوں نے اس ملک کو خیرباد کہہ دیا اور زیادہ تر افریقہ میں اور بعض اور ملکوں میں جہاں ان کو پناہ ملی چلے گئے۔ مورخین مغرب کا اندازہ ہے کہ فرڈی نینڈ کے غرناطہ پر تسلط سے لے کر اس آخری حکم جلاوطنی تک جن لوگوں نے اسپین چھوڑا ان کی تعداد تیس لاکھ ہے لیکن ایک مورخ کا بیان ہے کہ افریقہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں میں سے تین چوتھائی مسلمان وہ تھے جن کو راستہ میں قتل کر دیا گیا اور وہ غریب منزلِ مقصود تک پہنچ بھی نہ سکے۔ بہرحال سترھویں صدی عیسوی کے شروع میں مسلمانوں کا اسپین سے بالکل خاتمہ ہو گیا۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

Marfat.com

علماء اور صوفیاء کی مدد سے اپنی سوچوں کا ایک ملغوبہ تیار کرلیا جسے بعد کے مورخین "دینِ الٰہی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایک صوفی تاج الدین اجودھنی نے قرآنی آیات اور احادیث نبوی کی من مانی تاویل کرتے ہوئے بادشاہ کو خلیفۃ الزماں اور انسانِ کامل قرار دیا۔ (حالانکہ انسان کامل صرف رسولِ اقدس ﷺ کی ذات والا صفات ہی ہے) اور بادشاہ کے لئے سجدہ تجویز کیا۔ اس سلسلے میں ایک واقع کا ذکر کرنا ضروری ہے جس سے واضح ہوگا کہ بعض ابن الوقت علماء نے کتمان حق کر کے بادشاہ کا ذہن کسی طرح خرافات سے بھرا۔ 1579ھ کا واقع ہے کہ شہر متھرا میں قاضی عبدالرحیم نے ایک مسجد کے لئے تعمیر کا سامان فراہم کیا۔ ابھی تعمیر کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ایک مقامی بااثر ہندو نے سامان پر جبری قبضہ کرکے مندر تعمیر کر لیا۔ جب مسلمانوں نے اس کو روکنا چاہا تو اس نے پیغمبر اسلام ﷺ کو گالیاں دیں اور اسلام کی توہین کی۔ اس معاملے کی شکایت اکبر کو کی گئی اور اکبر کو توہین رسالتؐ کی شرعی سزا سے بھی آگاہ کیا گیا لیکن اکبر نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی بلکہ کہا کہ وہ ان معاملات میں کوئی دخل اندازی نہیں چاہتا۔ تاہم اہانت کے مرتکب ہندو کو قید میں ڈال دیا گیا۔ بادشاہ کی ہندو رانیاں اس کی رہائی کے لئے بادشاہ پر اثر انداز ہوئیں۔ اسی دوران صدر الصدور شیخ عبدالنبی نے شرعی سزا نافذ کر کے ہندو مجرم کو اہانت رسولؐ کے جرم میں قتل کرادیا۔ اس پر ہندو رانیوں اور بادشاہ کے ہندو مصاحبین نے بادشاہ کو طعنے دیے کہ علماء خودسر ہو گئے ہیں اور بادشاہ کی خوشنودی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ابوالفضل اور فیضی کے باپ شیخ مبارک سے اس معاملے میں رائے لی گئی تو اس نے بادشاہ سے کہا کہ بادشاہ ایک مجتہد سے بلند درجہ رکھتا ہے اور احکام اسلامی کی وہ تاویل کرسکتا ہے جو وقت کی مصلحتوں کے مطابق ہو۔ ایک محضر نامہ تیار کیا گیا جس پر بعض علماء کے دستخط کرالئے گئے تاکہ آئندہ بادشاہ کے رائے اور حکم پر بلا چون وچراں (خواہ وہ شرع کے مطابق بھی نہ ہو) عمل ہو۔

اس کے بعد شیخ عبدالنبی جنہوں نے توہین رسالتؐ کے مجرم کے خلاف قتل کا فتویٰ جاری کیا تھا، کے خلاف حرم کی ہندو رانیوں کی وجہ سے بادشاہ کی نفرت انتہا کو پہنچ گئی۔ بادشاہ نے بھرے دربار میں ان کے منہ پر مکا مارا، پھر انہیں قید کر دیا گیا اور بعد میں بادشاہ کے اشارے پر گلا گھونٹ کر شہید کر دیا گیا۔

اکبر نے ہندوستان میں اسلام کو دیوار سے لگانے کے لئے مندرجہ ذیل انفرادی اور اجتماعی اقدام کیے۔

1- حدودِ شریعت پر نفسانی خواہشات کو ترجیح دی اور چار سے زیادہ بیویاں حرم میں ڈال لیں اور یہ اعلان کیا کہ بطور خلیفۃ الزماں وہ اس قسم کی قرآنی پابندی سے مستثنیٰ ہے۔

2- اس نے تبدیلی مذہب کرائے بغیر ہندو راجپوت رانیوں سے شادی کی، حالانکہ اسلامی شرع میں واضح پابندی ہے کہ ایک غیر کتابیہ اور کافر بُت پرست عورت سے مسلمان کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ گویا اکبر نے اس معاملے میں اپنی ذات کو احکام شرع سے بالاتر سمجھا یا پھر وہ سرے سے اسلام کا منکر ہو چکا تھا۔ یہ لکھتے ہوئے فقیر کا قلم بھی رو رہا ہے کہ اکبر نے اپنی ایک داشتہ اجودھا بائی کو "مریم زمانی" کا خطاب دیا۔ مریم زمانی کا پورا مفہوم تو علماء ہی سمجھا سکتے ہیں۔

3- اکبر نے ملک بھر میں گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگا دی اور خود بھی ہر قسم کا گوشت کھانا بند کر دیا۔

4- شرعِ اسلام کے برعکس اکبر نے تعظیم نورِ آفتاب کو پارسیوں کی طرح اپنے معمولات میں شامل کرلیا تھا۔ ہندوؤں کی

Marfat.com

خوشنودی کے لئے دیوالی کے روز کئی گائیوں کو سجا کر منگواتا اور "سید دلہا" کا اہتمام کرتا۔

الغرض اکبر اور اس کے درباریوں کا بنایا ہوا جہالت کا ملغوبہ نہ صرف اسلامی نقطہ نظر سے بلکہ عقلِ انسانی کی رو سے بھی قابل اعتراض تھا۔

اکبر کے دربار میں ان علماء کو نوازا جاتا تھا جو اس کی مرضی کے مطابق دن کو رات اور رات کو دن کہتے چلے جائیں۔ ورنہ ان کو عتاب شاہی کا شکار ہونا پڑتا۔ شیخ عبدالنبی کے متعلق ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اکبر کی علماء دشمنی کی چند مثالیں نقل کرتے ہیں۔

ایک شیعہ عالم نے حق گوئی کی مثال قائم کرتے ہوئے فتویٰ دیا کہ بادشاہ بدمذہب ہو چکا ہے۔ بادشاہ کے حکم سے اس عالم کو شکستہ کشتی میں سوار کر کے سیلابی دریا کی موجوں کے حوالے کر دیا گیا اور وہ اللہ کا بندہ غرقاب ہو گیا۔ یہی سلوک بنگال کے حق گو عالم معز الملک کے ساتھ کیا گیا۔ ایک اور عالم قاضی القضاۃ قاضی یعقوب مانپوری کو حق گوئی کے جرم میں پہلے گوالیار کے قلعے میں قید رکھا گیا اس کے بعد قتل کرا دیا گیا۔ مخدوم الملک کو حج کے نام پر جلاوطن کر دیا گیا اور حکم ہوا کہ وہ بلا اجازت واپس نہ آئیں۔ شیخ سعد اللہ اسرائیل صاحب تصنیف اور ممتاز عالم دین تھے۔ انہیں بھی گوالیار کی جیل میں ان کی وفات تک قید رکھا گیا۔ شہید ہونے والوں کی فہرست طویل ہے۔ علاوہ ازیں کئی دوسرے علماء کو ان کے وطن سے جلاوطن کر کے دور دراز علاقوں میں بھیج دیا گیا۔ جن قاضیوں کی وفاداریوں پر شک ہوا، انہیں معزول کر دیا گیا۔ پنجاب کے علماء اکبر کے زمانے میں زیادہ راسخ العقیدہ تھے۔ انہیں ملتان، تلنبہ اور لاہور جیسے علمی مراکز سے جلاوطن کر کے مملکت کے دور افتادہ علاقوں میں منتشر کر دیا گیا۔ ان کے مدارس بند کر دیئے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ علمائے حق خواہ وہ سنی ہوں یا شیعہ، کے لئے عہد اکبری بہت بھاری تھا اور ان پر ناقابل یقین ستم توڑے گئے۔ ان کی تصنیفی و تخلیقی سرگرمیوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے۔ اس طرح دورِ اکبری کی بعض قیمتی اسلامی تصانیف انتقامی کارروائیوں کے طوفان میں ہمیشہ کے لئے گم ہو گئیں۔ انجام کار ان ظالمانہ کارروائیوں اور بدمذہبی نے اپنا اثر دکھایا اور ملک میں جگہ جگہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں نے شورشیں اور بغاوتیں کر دیں لیکن ہندو راجاؤں اور ہندو رعیت کے بھرپور تعاون سے ان بغاوتوں کو دبا دیا گیا۔ سلطنت کا استحکام بذریعہ جبر، یہی وہ طریقہ تھا۔ کچھ نام نہاد مورخین کی طرف سے جس کا کریڈٹ اکبر کو دیا جاتا ہے۔

پرتگیزی، عیسائی مشنری ساحل گوا کی نو آبادی سے آتے تھے۔ وہ شہادت دیتے ہیں کہ اکبر نے حکم دیا تھا کہ ملک میں کوئی نئی مسجد تعمیر نہ ہو اور کسی پرانی مسجد کی مرمت نہ کی جائے۔ ان عیسائی مشنریوں نے اپنے ملک پرتگال میں یہ رپورٹیں بھجوائیں کہ اکبر کو عیسائیت سے دلچسپی ہے اور وہ اسلام کا مخالف ہو گیا ہے۔

1580ء میں عیسائی مشنری اکبر کے دربار میں آئے۔ انہیں بتایا گیا کہ اکبر نے نمازِ باجماعت میں پیغمبر اسلام ﷺ کے ذکر کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اکبر نے قرآنی آیات کی جگہ فیضی کی لکھی ہوئی دعائیں، نماز باجماعت میں پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ ایک انگریز مصنف کے مطابق اکبر نے یہ حکم دیا تھا کہ آئندہ کسی بچے کا نام "محمد" نہ رکھا

Marfat.com

جائے۔عربی دینیات اور فقہ اسلامی کی تعلیم و تدریس کی حوصلہ شکنی کی گئی۔پارسی مذہب کے زیر اثر آگ اور سورج کی تعظیم سرکاری طور پر شروع کر دی گئی۔ہندوؤں کی پرانی کتابوں مہابھارت۔رامائن اور دیگر مذہبی کہانیوں اور داستانوں کو سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرا کے رائج کرنے کی کوششیں شدومد سے ہوئیں جبکہ دینی اور اسلامی علمی سرگرمیوں پر جمود طاری رہا۔رقص اور موسیقی کی بے پناہ حوصلہ افزائی کی گئی نئی نئی راگنیاں بھی ایجاد ہوئیں۔تان سین اکبر کے نورتنوں میں شامل تھا۔اکبر کے ان اسلام دشمن خیالات اور اقدامات کے خلاف عامتہ المسلمین میں بے چینی اور غم وغصہ ایک قدرتی بات تھی لیکن قدرت کی طرف سے بھی انتباہ ہوتا رہا۔ 1595ء میں قلعہ لاہور میں پارسیوں کے انداز میں جشنِ نوروز منایا جارہا تھا کہ آسمان سے ایک آگ نازل ہوئی جس سے شاہی سائبان اور بہت سا ساز وسامان جل کر راکھ ہو گیا۔اس نقصان اور آسمانی آگ کے نزول کو بادشاہ کی غلط روی پر قدرت کی طرف سے سزا تصور کیا گیا۔بادشاہ پر اس واقع کا اثر ہوا اور اس کی خودسری اور مطلق العنانی میں کچھ کمی آئی۔

1595ء میں ہندوستان کی تاریخ کی بدترین قحط سالی شروع ہوئی اور ملک کے طول وعرض میں پھیل گئی۔یہ سلسلہ چار سال جاری رہا اور ساتھ ہی طاعون کی وبا پھوٹ پڑی۔جس کے نتیجے میں پورے پورے شہر اور گھر انسانوں سے خالی ہو گئے۔غلہ کی نایابی اور بھوک کے سبب لوگوں نے مردم خوری شروع کر دی۔سڑکیں، گلیاں اور راستے مُردوں سے اٹ گئے۔ ان لاشوں کو اُٹھانے کا کوئی بندوبست نہ تھا۔

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں اکبر کی مذہبی بدعات اور اس کے نتیجے میں اسلام کے انحطاط کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے۔اب ہم چند سطور میں اکبر کی حکومت کے پہلے بیس سالوں کا ذکر کریں گے تاکہ اکبر کی شخصیت کے سارے پہلو قارئین کے سامنے آجائیں۔

اکبر تخت نشینی کے بیس سال تک تو ایک کٹر مسلمان کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔صوفیائے کرام کے ساتھ اس کی عقدیت وارادت کا یہ عالم ہے کہ آگرہ سے اجمیر تک پاپیادہ جاتا ہے۔بچہ ہونے والا ہوتا ہے تو حاملہ بیوی کو برکت حاصل کرنے کے لئے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے حجرہ میں بھیج دیتا ہے۔لباسِ زعفرانی پہننے پر صدر الصدور سرِ دربار ٹوکتے ہیں اور اس طرح کہ عصا کا ایک سرا بادشاہ کو مس کر جاتا ہے تو اکبر اسے پی جاتا ہے اور صبر کر کے بیٹھ جاتا ہے۔عبادت گزاری کا یہ عالم ہے کہ "عبادت خانہ" کے پرانے حجرہ میں اکیلا بیٹھا ہوا اور اد و وظائف اور مراقبوں میں مصروف رہتا ہے لیکن بدقسمتی سے جب علماء اور مشیرانِ جہالت کے زنغے میں آتا ہے تو اکبر یکسر تبدیل ہو کر اپنی مذہبی اور دیندار شخصیت کو بالکل فراموش کر دیتا ہے۔ اکبر پر یہ شعر صادق آنے لگتا ہے۔

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلائے شیخ
تو کہے گبر مجھے گبر مسلمان مجھ کو

ان وجوہ کی بنا پر اکبر کے عہد حکومت کا یہ زمانہ جو اس کی موت سے ایک سال قبل تک جاری رہا، اسلام اور مسلمانوں کے لئے بڑا نازک وقت تھا۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اس زمانہ میں اپنی دعوتِ تجدید و اصلاح کی

پوری قوت و طاقت کے ساتھ نہ اُٹھتے تو اسلام اِس ملک میں بالکل غریب الوطن ہو گیا تھا اور آج کا ہندوستان صحیح معنی میں ہندو استھان ہوتا۔

اکبر کا انتقال

اکبر کی عمر کا آخری حصہ بڑی پریشانیوں میں گزرا جس کی بڑی وجہ اس کے بیٹوں کا طرزِ عمل تھا۔ 1599ء میں کثرتِ شراب نوشی کے باعث شہزادہ مراد انتقال کر گیا۔ 1601ء میں سلیم نے اس مذہبی طبقہ کی حمایت حاصل کر کے جو اکبر کے مذہبی عقائد کے باعث حد درجہ نالاں تھے، علم بغاوت بلند کر دیا۔ اکبر نے جلد ہی اس بغاوت پر قابو پالیا اور پھر سزا دینے کی بجائے اس کو بنگال اور اڑیسہ کا گورنر مقرر کر دیا لیکن شہزادہ سلیم نے اب بھی اپنے رویہ میں تبدیلی کے کوئی آثار پیدا نہ ہونے دیے۔ الٰہ آباد میں قیام کر کے شب و روز دادِ عیش و طرب دیتا اور باپ کے خلاف منصوبہ بندی کرتا۔ اس سلسلہ میں اس نے اکبر کے محبوب وزیر ابوالفضل کو قتل کرایا جس کی خبر سن کر اکبر کو بے حد رنج ہوا۔ اس واقعہ کے بعد شہزادہ دانیال بھی کثرتِ شراب نوشی اور بے اعتدالیوں کے باعث دنیا سے چل بسا۔ ان مصائب کے علاوہ محل شاہی سازشوں کا ایک اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ کچھ لوگ مشورہ دیتے تھے کہ شہزادہ سلیم کو محروم کر کے اس کے بیٹے خسرو کو ولی عہد بنا دیا جائے۔ ان سے تنگ آ کر اکبر نے خود سلیم کو بلایا، راضی کیا اور اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ اس واقعہ کے چند مہینوں بعد آگرہ میں 1605ء مطابق 1014ھ بڑی سخت پیچش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ طبیبوں کی پوری کوشش کے باوجود اکبر صحت یاب نہ ہو سکا۔

بہت تھوڑے لوگوں نے اکبر کے جنازے میں شرکت کی اور اسے جلد دفنا دیا گیا۔ اس کی موت کے 80 سال بعد آگرہ میں اس کی قبر کو جاٹوں نے ادھیڑ دیا، دیواریں اور آرائش تباہ کر دیں۔ قبر میں سے اکبر کی ہڈیوں کو نکال کر آگ میں ڈالا اور راکھ اڑا دی۔ یہ تھا اس مطلق العنان بادشاہ کا انجام، جس نے پچاس سال تک اسلامیانِ ہند کو انسانیت سوز اور اذیت ناک حالات سے دوچار کئے رکھا۔

اہلِ بصیرت علم کی دو شاخیں بیان کرتے ہیں۔ ایک کو "العلم" کہا جاتا ہے اور دوسری شاخ کو "فن" یا "ہنر" کہا جاتا ہے۔ العلم بنیادی علم ہے جو انسان کو ایک طرف ذاتِ باری سے منسلک کرتا ہے اور انسان کو اعلیٰ علیین کی منزل تک رسائی کے رستوں سے روشناس بھی کراتا ہے۔ اس مقام کی امید بھی دیتا ہے اور دورِ آخرت کی راحتیں بھی العلم والے کے نصیب میں درج کرتا ہے۔ اسی العلم کی روشنی میں انسان ذاتِ باری کے احکامات کو پہچانتا ہے، ان پر عمل کرتا ہے اور اپنی زندگی کو ہر میدان میں سنوارتا چلا جاتا ہے۔ بھٹے پر اینٹیں تھاپنے والے پتھیرے سے لے کر ستاروں پر کمند ڈالنے والا سب العلم نہیں فن کی پیداوار ہیں۔ العلم ان سب کے فن کو سنوارتا ہے اور بنی نوعِ انسان اس فن سے مستفید اور مستفیض ہوتے ہیں۔ اگر العلم فن کی حنابندی نہ کرے تو فن دو دھاری تلوار بن جاتا ہے جو اپنے مالک کو بھی کاٹ دے اور اس کے متعلقین کو بھی اذیت میں مبتلا کئے رکھے۔ مولانا رومؒ نے اسی لئے یہ فرمایا تھا کہ

علم را بر دل زنی یارے بود
علم را بر تن زنی مارے بود

یعنی علم کو دل کی زندگی سنوارنے اور اسے روشن کرنے کے لئے استعمال کرو گے تو یہ تمہارا دوست اور غمگسار ہے۔ علم کو صرف اپنی ذاتی اغراض کے لئے مصرف میں لاؤ گے تو یہ سانپ بن کر تمہیں ڈس لے گا۔ ہمارے خیال میں پہلے مصرعے میں علم سے مراد العلم ہے اور دوسرے مصرعے میں علم کی دوسری شاخ فن یا ہنر ہے۔ اس بحث کا بدیہی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ العلم والے فن کو بنی نوعِ انسان کے لئے مفید اور کارآمد بنانے کے لئے رستے بناتے اور بتاتے ہیں۔ پورے معاشرے کے تمدن کی تشکیل کرتے ہیں تاکہ العلم کی رہنمائی میں معاشرے کا ہنر اور فن پروان چڑھ سکے اور ہنر و فن کی یہ ترقی بنی نوع انسان کے لئے رحمت ثابت ہو۔

اکبر نے اپنی حکومت کے بیس سال پورے ہونے کے بعد 'صاحبانِ العلم' پر حملے شروع کر دیے۔ انہیں جن مشکلات وتعذیب سے گزارا اس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ العلم والے اکبر کی مذہبی کارستانیوں کا توڑ کرنے میں جتے رہے۔ وہ اہل ہنر اور فن کی طرف کچھ بھی منتقل نہ کر سکے۔ پرتگیزی اہل ہنر، بحرِ ہند کے اطراف واکناف میں جہاز رانی کے جوہر دکھا رہے تھے۔ بحرِ ہند سے گزرنے کے لئے شاہی بیگمات کو بھی ان سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ جبکہ اکبر جیسا حرم سرا کی بھول بھلیوں میں گم رہنے والا حکمران مغرب سے تکنیکی اور ہنر و فن کے اٹھتے ہوئے طوفان کا شعور ہی نہیں رکھتا تھا۔ مغربی دنیا ستاروں پر کمند ڈال رہی تھی اور ہمارا 'اکبرِ اعظم' ستاروں کی پوجا پاٹ میں جتا ہوا تھا۔ ہندوستان جسے سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔ اس کے بے پناہ خزانوں کا مالک راجپوت رانیوں اور حرم سرا کی بیگمات کے سحر سے باہر نہ نکل سکا۔ اصل میں اکبر نے ہندوستان کی رعایا کو غلام اور خزانوں کو شیرِ مادر سمجھ رکھا تھا۔

اگر وہ اس سب کچھ کو اللہ کی امانت سمجھ کر اور اس کی عطا کردہ نعمت سمجھتا تو اس کا رویہ خدا خوفی اور خدا ترسی کو بنیاد بنا کر بنی نوعِ انسان اور خصوصاً اسلامیانِ ہند کو ایسے سکون واطمینان سے ہمکنار کرتا جو کئی صدیاں اس کے نام اور مقام کو خراجِ تحسین پیش کرتے رہتے۔

اکبر کی عیاشیوں اور مطلق العنانی اور اللہ کے ڈر سے دوری نے تیموری خون میں کافرہ عورتوں کا خون شامل کر کے پوری نسلِ تیمور کو برباد کر دیا۔ بالآخر نسلِ تیمور پوری طرح بے حمیت اور مفسد ہو گئی اور سات سمندر پار سے آئے ہوئے جابر اور قاہر گورے صدیوں تک مشیتِ ایزدی سے باشندگانِ ہند پر بالعموم اور اسلامیانِ ہند پہ بالخصوص مسلط کر دیے گئے۔ گورے اس مضبوطی سے مسلط ہوئے کہ نسلِ تیمور کے لئے کوئی رونے والا بھی نہ چھوڑا۔

ہمارے مورخ تاریخ کو صرف بادشاہوں کی تاریخ سمجھتے ہیں، ان کی فتوحات، لاؤ لشکر، خزانوں اور کروفر کا ذکر کرتے ہیں، ان کی عیاشیوں اور شاہ خرچیوں کے قصے سناتے ہیں لیکن کروڑوں انسانوں کے لشکر اور معاشرہ، جن کے کندھوں پر اپنے تخت سجاتے ہیں، ان کے ذکر کو گول کر جاتے ہیں۔ اصل میں تو وہی لوگ ہیں جن کا حال اور مستقبل بتاتا ہے کہ ان کے حکمران اور بادشاہ سلامت ان سے کیا سلوک کرتے ہیں۔ تاریخ میں مغل خوش حال اور سنہری دور کا تصور اس لئے ابھرا کہ مورخین نے ہندوستان کے عوام کی اقتصادی اور سماجی زندگی کا جائزہ ہی نہیں لیا۔ مغل معاشرے میں رعیت کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور نہ ہی بادشاہ اور امراء کے مقابلے میں انہیں کسی قسم کے حقوق حاصل تھے۔ اس لئے یہ طبقہ محنت مزدوری کر کے

حکمران طبقوں کو دولت مہیا کرتا تھا اور سلطنت و حکومت کے معاملات میں اس کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ اس لئے مغلیہ دور کے مورخین نے اس بات کی کوشش ہی نہیں کی کہ عوام اپنی محنت سے مغل معاشرہ کی تعمیر و تشکیل میں جو حصہ ادا کر رہے تھے اس کی نشان دہی کریں۔ یعنی تاریخ کے کردار اور تاریخ ساز صرف حکمران تھے، نہ کہ وہ کروڑوں انسان جن کی گردنوں نے بادشاہوں کی غلامی کے جوئے اٹھا رکھے تھے۔

Marfat.com

روشن اختر محمد شاہ رنگیلا

جہان شاہ ولد بہادر شاہ کے بیٹے خجستہ اختر کے ہاں شہزادہ روشن اختر بروز جمعہ 13 اگست 1702ء غزنی میں پیدا ہوا اور 1719ء تک وہ اپنی والدہ نواب قدسیہ بانو کے ساتھ فتح پور سیکری میں قید رہا۔ 25 ستمبر 1719ء، 16 ذیقعد 1131ھ کے دن سید بھائیوں نے اسے قید سے نکال کر تخت پر بٹھایا جس نے ابوالفتح ناصرالدین محمد شاہ کا لقب اختیار کیا۔ بعد ازاں اس کی والدہ کو بھی آزاد کر دیا گیا۔ نواب قدسیہ بانو بڑی دور اندیش خاتون تھی۔ چنانچہ اس نے سید برادران کا اعتماد حاصل کر کے حکومت میں عمل دخل پیدا کر لیا اور محمد شاہ کی بھی سرپرستی کرنے لگی۔

لیکن سید برادران نے مادر ملکہ اور محمد شاہ کو فتح پوری میں رکھا ہوا تھا۔ جن کی خدمت پر مامور عملہ ضلع مظفر نگر کے گاؤں "بارہہ" سے لا کر بھرتی کیا گیا تھا۔ کیونکہ سید برادران کا آبائی وطن بھی بارہہ تھا۔ محمد شاہ نے خود کو قیدی بادشاہ تصور کیا تو اس کے والدہ نے اعتمادالدولہ محمد امین کی وساطت سے نظام الملک آصف جاہ کو دکن سے بلا کر مغل بادشاہ کی مدد کا منصوبہ بنایا۔ وہ اپنی فوج لے کر برہان پور آ پہنچا جس کے مقابلے کے لئے سادات بارہہ نے بھی فوج بھیج رکھی تھی۔ اس معرکہ میں سید بھائیوں کو شکست سے دو چار ہونا پڑا اور نظام الملک دہلی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس پر سید عبداللہ دہلی میں انتظامات کے لئے رک گیا اور حسین علی شاہ کو ساتھ لے کر مقابلہ کے لئے نکلا۔ اکتوبر 1720ء کو فتح پور سے 35 میل دور تودہ کے مقام پر میر حیدر علی کاشغری نے حسین علی کی خدمت میں نظام الملک کی شکایت کے بہانے رسائی حاصل کر کے اچانک حسین علی کو قتل کر دیا۔ اس پر لشکر میں پھوٹ پڑ گئی اور دو دھڑے بن کر آپس میں لڑنے لگے۔ ایک محمد شاہ کا حامی تھا۔ دوسرا سادات بارہہ کا طرفدار تھا۔ اس جنگ میں محمد شاہ کو کامیابی ملی اور آگرہ میں فوج نے سادات اور ان کے حامیوں کے نہ صرف گھر لوٹے بلکہ ان کی مستورات کی بے حرمتی بھی کی۔

حسین علی کے قتل کی خبر اس کے دوسرے بھائی سید عبداللہ کو پہنچی تو اس نے دہلی میں فوج تیار کی اور اس اثناء میں محمد شاہ کو معزول کر کے رفیع الشان کے بیٹے محمد ابراہیم کو ابوالفتح ظہیرالدین محمد ابراہیم کے لقب سے 15 اکتوبر 1720ء کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد سید عبداللہ کی فوج مقابلہ کے لئے نکلی۔ محمد شاہ کی فوج محمد امین خان کی سرکردگی میں دہلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دونوں فوجیں شاہ پور اور حسن پور کے نواح میں ٹکرا گئیں۔ دو دن مقابلہ جاری رہا، آخر شکست کے بعد سید عبداللہ گرفتار ہوا۔ جس نے قید خانے میں خودکشی کر لی اور اس طرح بادشاہ گر خاندان سید برادران کا خاتمہ ہو گیا اور خاندانِ مغلیہ

Marfat.com

نے سکھ کا سانس لیا۔

محمد شاہ کو اقتدار ملا تو اس نے اپنے آپ کا جہانبانی کی ذمہ داریوں سے بالکل تہی دامن ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس نے اقتدار کو حصولِ عیش ولذت کا موقع سمجھا۔ معمولی معمولی واقعات پر کئی کئی روز تک جشنِ طرب منائے جاتے تھے۔ سابق بادشاہ فرخ سیر کی بیٹی سے محمد شاہ کی شادی ہوئی تو شادی سے پہلے ہفتوں رقص وسرود اور آتش بازی اور ضیافت کا سلسلہ جاری رہا۔ کوکی نام کی ایک لڑکی تھی جو بڑی خوبصورت، مغنیہ اور شاعرہ تھی۔ محمد شاہ چونکہ جوان اور بے صبر تھا اس لئے وہ سارا وقت عیش ونشاط اور رقص وسرود میں گزارتا تھا۔ کوکی اس کے مزاج پر اتنی حاوی ہوگئی تھی کہ وہ ہر وقت دربار اور حرم میں رہتی تھی اور بادشاہ نے اسے یہ اختیار دے رکھا تھا کہ وہ اہل حاجت کی درخواستیں وصول کرتی اور انہیں اپنی مرضی سے منظور بھی کرتی۔

کوئی اہم سیاسی مسئلہ اگر محمد شاہ کے سامنے لایا جاتا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے وہ خوش طبعی اور خوش گوئی سے وقت ضائع کر دیتا۔ اس نے کبھی امورِ سلطنت میں خاص دلچسپی نہ لی اور نہ ان امور کو وہ اہمیت دی جس کے وہ مستحق تھے۔ محمد شاہ اپنی انہی خصلتوں کی وجہ سے عوام میں "رنگیلے" کے نام سے مشہور ہوگیا۔

آخرکار عوام کے دل سے بادشاہ کے نام کی ہیبت جاتی رہی۔ امرائے سلطنت ہوں یا عام لوگ سب بادشاہ کے جاہ وجلال سے بے نیاز اور خودسر ہو گئے۔ نظام الملک آصف جاہ (قدیمی نمک خوار خاندانِ مغلیہ) بادشاہ کو اپنے خیالات وآراء سے چلانا چاہتا تھا تاکہ بادشاہ رنگین صحبتوں سے نکل کر سلطنت کے معاملات کی طرف توجہ دے۔ وہ چاہتا تھا کہ بادشاہ کوکی جیسی نازنینوں کے چنگل سے باہر آئے لیکن افسوس کہ نظام الملک کے خیالات نہ بادشاہ کو پسند آئے اور نہ ہی اس کے مصاحبوں نے ان کو درخورِ اعتنا سمجھا۔ بلکہ الٹا یہ لوگ نظام الملک کا مذاق اور تمسخر اڑاتے تھے۔ جونہی وہ دربار سے باہر نکلتا درباری خوشامدی اس کے خلاف فقرے کستے۔ ان باتوں کی نظام الملک کو خبر ملتی رہتی تھی۔ چنانچہ ان فقرہ بازیوں، تمسخر اور تضحیک سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس نے گجرات اور دکن جانے کا فیصلہ کرلیا اور بیماری کا بہانہ بنا کر گھر میں گوشہ گیر ہو گیا۔ وہ مسندِ وزارت بھی چھوڑنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک دن نظام الملک آصف جاہ شکار کھیلنے کے بہانے دہلی سے نکلا اور دکن پہنچ گیا۔

چونکہ آصف جاہ بادشاہ کو راہ راست پر رکھنے کے ساتھ تمام وہ آداب بجالاتا اور ایسا لباس پہننا پسند کرتا جو ایک وزیر سلطنت کے شایانِ شان تھا۔ آصف جاہ کے دکن چلے جانے کے بعد قمر الدین کو وزیر مقرر کیا گیا۔ قمر الدین کے ذمہ اور کاموں کے علاوہ یہ بھی تھا کہ وہ آصف جاہ کا مذاق اڑائے اور نقلیں اتارے۔ قمر الدین کے اس فعل سے بادشاہ اور درباری خوب خوش ہوتے تھے۔ جس مزاج کا بادشاہ اسی مزاج کے درباری۔ عیاشی اور آخرت فراموشی زمانے کی ہوا میں شامل ہو گئی تھی۔ بنگال کا صوبہ دار شجاع الدولہ حد درجہ عیاش اور عورت پرست تھا۔ عورت پرستی کی انتہا یہ تھی کہ وہ دربار میں سرکاری امور میں مصروف ہوتا کہ ایک دم تخلیہ میں چلا جاتا اور جب ایک آدھ گھنٹے بعد واپس آتا تو ایمان سوز بے حیائی کے ساتھ کہتا کہ میرے پاس ایک بھوکا ٹٹو (شہوت پرست نفس) ہے جو میرے لئے دردِ سر بن چکا ہے۔ گویا محمد شاہ رنگیلا کے زمانے

میں مقتدر طبقے نے اپنا یہ چلن بنا لیا تھا کہ جب تک ہاتھ میں اقتدار ہے اور تن میں قوت ہے لذت وانبساط اور نشاط وسرور میں مگن رہنا ہی زندگی کا حاصل ہے۔ امرائے سلطنت ان افعال سے شرمانے کی بجائے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں منہمک رہتے تھے۔

دربار میں رشوت لینے والے امراء خلق خدا کو لوٹتے تھے۔ ایک امیر ظفر خاں لوگوں کے کام کرنے اور کرانے کے لئے کھل کر رشوت وصول کیا کرتا تھا اور محمد شاہ کے اہم دوستوں میں شامل تھا۔ اسے ہر ماہ صوبہ کے انتظام کے لئے بارہ لاکھ روپے بھیجے جاتے تھے۔ اس رقم میں سے وہ آدھی اپنے پاس رکھ لیتا تھا جب اس کا پول کھلا تو اس نے دو کروڑ روپے غبن اور رشوت میں جمع کرنے کا اعتراف کیا۔ یہ رقم قدر و قیمت میں آج کل کے بیس ارب روپوں سے زیادہ بنتی ہے۔ ایسے درجنوں امراء تھے جو اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے تھے۔

معاصر مورخین اورنگ زیب کے بعد آنے والے حکمرانوں، بالخصوص محمد شاہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ اسے عیش وعشرت اور نازنینوں سے ہم آغوش ہونے کے علاوہ کسی کام کے لئے فرصت ہی نہ تھی مرہٹے افغان اور سکھوں نے ملک کا نظم ونسق بالکل برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ لوگ جتھوں کی صورت میں لوٹ مار کرتے۔ عورتوں کی بے حرمتی کرتے اور ہر امن پسند ہندوستانی ان کے مظالم کی وجہ سے لرزاں وترساں رہتا تھا لیکن بادشاہ کی قوت ارادی، حوصلہ مندی اور ذمہ داری کا دور دور تک نشان نہیں ملتا تھا۔ ان حالات میں رعایا کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب انہیں اندازہ ہوتا کہ کوئی مرہٹہ سکھ یا افغان جتھہ ان کے علاقے سے گزرنے والا ہے تو وہ اپنا توشہ کندھے پر رکھتے اور جنگل کی طرف نکل جاتے، جہاں اژدھے اور شیر تو تھے لیکن اژدھوں اور شیروں سے زیادہ خطرناک انسان نما درندے نہیں تھے۔

محمد شاہ رنگیلا اپنی دھن میں مست تھا۔ اس کے امراء کے ہاتھ جو کچھ حکومتی آمدنی کی مد میں لگتا اسے خزانے میں جمع کروانے کی بجائے خود ہڑپ کر جاتے۔ اگر کچھ خزانے میں جمع ہو جاتا تو بادشاہ کی عیاشیوں کی نذر ہو جاتا۔ بعض اوقات بادشاہ کو اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے اپنے بزرگوں اور بادشاہوں کے جمع کردہ ہیرے اور جواہرات کو بیچنا پڑتا۔ پورے ہندوستان کے امراء اور راجے مہاراجے خودسر اور آزاد ہو چکے تھے۔ صرف تبرک کے طور پر بادشاہ سے حکومت کا پروانہ حاصل کرتے اور اس کے عوض بادشاہ کی خدمت میں رشوت اور نذرانے پیش کرتے۔

محمد شاہ کی داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے ہم ایک حقیقت کا اعتراف کرنا چاہتے ہیں کہ محمد شاہ کے زمانے میں پنجاب میں پورے بیس سال امن رہا۔ نہ یہاں کوئی بغاوت اٹھی اور نہ کوئی مشکل پیش آئی۔ اس کی وجہ سلطنت مغلیہ کے پرانے نمک خواروں کی کارکردگی تھی جس نے پنجاب جیسے زرخیز اور مردم خیز صوبہ کو قابو میں رکھا۔ اسی چیز نے محمد شاہ رنگیلے کی حکومت کے تسلسل کو برقرار رکھا۔

محمد شاہ رنگیلے کے دور میں بے عملی، بدعنوانی، غیر ذمہ داری، تساہل اور بزدلی کی یہ کیفیت تھی کہ نادر شاہ شاہ ایران کو اپنے ذرائع سے حکومت کی کمزوریوں کا علم ہوا اور ساتھ ہی ایسی کمزور حکومت کے قبضے میں خزانوں کا تصور کر کے اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے حیلے بہانے سے ہندوستان پر چڑھائی کر کے سب کچھ لوٹ لینے کا پروگرام بنایا۔

Marfat.com

اٹھارہویں صدی عیسوی میں افغانستان کے قبائل میں ایرانی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہو چکی تھی۔ 1708ء میں ایک افغان سردار میر ویس نے قندھار پر قبضہ کر کے اپنے غلزئی قبیلے کی حکومت قائم کر لی تھی۔ جو پوری طرح خود مختار تھی ایرانیوں نے قندھار کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ چنانچہ افغانیوں نے ہرات اور خراسان پر بھی قبضہ کر لیا اور میر ویس کے بیٹے محمود نے 1722ء میں ایران کے پایہ تخت اصفہان پر قبضہ کر لیا اور اگلے چھ سال تک غلزئی قبیلے کے چرواہے ایران پر حکومت کرتے رہے۔

نادر قلی نامی قزاقوں کی زندگی بسر کرنے والا شخص اپنے لٹیرے ساتھیوں سمیت شہزادہ طہماسپ صفوی کا مددگار بن گیا اور چند سال کی کوشش سے ہرات اور اصفہان وغیرہ علاقے واپس لے کر ایرانی حکومت کو بحال کر دیا۔ چنانچہ ایرانی سرداروں اور فوجی حکام نے ایک جلسہ عام میں 1736ء میں نادر قلی کو اپنا بادشاہ بنا لیا اور نادر شاہ نے فوج جمع کر کے قندھار پر حملہ کر دیا اور غلزئی قبیلے کے لوگ مغل علاقوں میں آ کر پناہ گزین ہو گئے۔

نادر شاہ کو قندھار کے محاصرے کے دوران ہندوستان میں قائم سلطنت کی کھوکھلی بنیادوں کے بارے میں پتہ چلتا رہتا تھا۔ چنانچہ غلزئیوں کی نقل مکانی کے بعد نادر قلی جو اب نادر شاہ بن چکا تھا نے محمد شاہ کو لکھا کہ ہمارے بھگوڑے غلزئی قبائل کے لوگ آپ کے ملک میں موجود ہیں۔ انہیں واپس کیا جائے لیکن رنگینیوں میں کھوئے ہوئے محمد شاہ رنگیلے نے اس کا جواب تک نہ دیا۔ بلکہ پیغام رساں سفارت کو بھی روک لیا۔ اس کے بعد نادر شاہ نے دو سفارتیں اور بھیجیں لیکن محمد شاہ نے کسی کو بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ بعض روایات میں ہے کہ ان دو سفارتوں کو بھی واپس نہ بھیجا بلکہ جن ڈاکوؤں نے اس سفیروں کا مال و متاع لوٹ لیا تھا۔ سزا دینا تو دور کی بات تھی، انہیں گرفتار تک بھی نہ کیا۔ محمد شاہ رنگیلے نے بے مروتی کی انتہا کر دی کہ لٹنے والے سفیروں کو واپسی سفر کے لئے زادِ راہ بھی نہ دیا۔ چنانچہ محمد شاہ رنگیلے کی اس بے اعتنائی اور غیر ذمہ داری کے بعد نادر شاہ نے حملہ کر دیا اور مغل حکومت کی عملداری میں واقع غزنی اور کابل پر قبضہ کر لیا۔

ستمبر 1738ء میں نادر شاہ نے پنجاب پر حملہ کر دیا جہاں لاہور میں ذکریا خاں گورنر تھا۔ اسے مرکزی حکومت سے کمک کی کوئی امید نہ تھی۔ لہٰذا اس نے بیس لاکھ روپے دے کر نادر شاہ سے صلح کر لی۔ جس نے ذکریا خان کو اس کے عہدے پر بحال کر دیا۔ اس طرح لاہور کے لوگ نادر شاہ کے قتل و غارتگری سے بچ گئے۔ نیز ذکریا خاں نے بہت سے ہاتھی اور پانچ ہزار گھڑسوار فوجی بھی نادر شاہ کے ہمرکاب کرنا منظور کر لیا۔ چنانچہ ذکریا خاں کے بھائی حیات اللہ خاں کی کمان میں یہ پانچ ہزار فوجیوں کا دستہ نادر شاہ کی ملازمت میں چلا گیا۔ اس دوران نادر شاہ نے فخر الدولہ امین الدین خاں کو کشمیر کا گورنر مقرر کیا۔ نیز لاہور کی ٹکسال میں اپنے نام کا سونے کا سکہ جاری کرنے کا حکم دیا۔

لاہور کو اپنی مرضی کے مطابق زیرنگیں کرانے کے بعد نادر شاہ نے براہ راست دہلی کا رخ کیا۔ اب محمد شاہ رنگیلے کو بھی خطرے کا کچھ احساس ہوا اور اپنی کثیر فوج کے ساتھ دہلی سے باہر نکلا۔ فوج میں ہاتھیوں کی کثیر تعداد کے علاوہ بے شمار خیمے اور مال اسباب بھی محمد شاہ رنگیلے کے ساتھ تھا۔ طرفہ تماشا یہ کہ دہلی سے کرنال تک چالیس پچاس میل کا فاصلہ تھا جسے دو ماہ میں طے کیا گیا۔ جبکہ نادر شاہ گھوڑے دوڑاتا ہوا طوفان کی طرح امڈ آیا۔ نادر شاہ نے کرنال میں پڑاؤ ڈال دیا اور اپنے

کے گرد توپیں نصب کروائیں اور دفاع کو پوری طرح مستحکم کر لیا۔

اس موقع پر مغل بادشاہ نے ہندو راجاؤں سے مدد کی اپیل کی لیکن جب اپنی صفوں میں اتحاد و اتفاق نہ ہو تو غیر بھی تعاون سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ ویسے بھی شہنشاہ اسلام کے لئے ڈوب مرنے کا مقام تھا کہ وہ کافروں سے فوجی مدد کی بھیک مانگ رہا تھا۔ بہر حال کسی ہندو راجے نے کوئی مدد نہ کی بلکہ یہ راجے اس کے منتظر تھے کہ مغلیہ حکومت کا چراغ گل ہو تو انہیں بھی ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم کرنے کا موقع ملے۔

مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلا عیش و آرام کے تمام لوازمات کے ساتھ کرنال میں مقیم رہا۔ خطرے کے باوجود ان لوازمات میں کمی نہ آئی تھی۔ محمد شاہ کے زمانہ میں دہلی میں "نور بائی" نامی ایک طوائف رہتی تھی۔ طوائفوں کی دنیا میں اس کا بڑا نام تھا۔ یہ طوائف حسن و جمال کی خوبی کے ساتھ رقص و نغمہ میں بھی کمال رکھتی تھی اور بادشاہوں کی محفلوں کی جان تھی۔ نادر شاہ سے جنگ کے پیش نظر محمد شاہ کو گھوڑے، ہاتھی اور اسلحے کے علاوہ سب فکریں ختم کر دینی چاہیے تھیں لیکن محمد شاہ نور بائی کو ساتھ لے جانا اب بھی نہ بھولا۔ طبل جنگ کی کرختگی کو بے اثر کرنے کے لئے نور بائی کی عشوہ طرازیاں اور دل آویزیاں محمد شاہ اور اس کے امراء کے لئے اشد ضروری سمجھی گئیں۔ یوں لگتا تھا یہ لوگ نادر شاہ کے خلاف جنگ لڑنے نہیں آئے۔ بلکہ کوئی پکنک منانے آئے ہیں۔

بادشاہ نے دشمن کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لئے کوئی انتظام نہیں کیا ہوا تھا۔ جب نادر شاہی لشکر بالکل قریب پہنچ گیا تو ایک دن شاہی گھسیارے گھوڑوں کے لئے گھاس کاٹتے ہوئے اپنے لشکر سے تھوڑا سا دور نکل گئے۔ نادر شاہ کے فوجیوں نے انہیں پکڑ کر زخمی کر دیا، وہ اس حالت میں اپنے لشکر پہنچے تو بادشاہ کے لشکر کو احساس ہوا کہ نادر شاہ ہمارے سر پر پہنچ چکا ہے۔ گھسیاروں نے نادر شاہی فوج کی تصویر اس طرح پیش کی کہ اس سے بادشاہ کی فوج میں دہشت پھیل گئی۔ فوری طور پر جنگ کی تیاریوں کے لئے نقارہ بجایا گیا۔ نظام الملک آصف جاہ نے مشورہ دیا کہ پوری تیاری اور مزید کمک آ جانے کے بعد اگلے روز جنگ شروع کی جائے لیکن خانِ دوراں نے فوری جنگ کا فیصلہ کیا۔ سپہ سالار سعادت خاں، جسے اپنی شجاعت اور بہادری پر بڑا ناز تھا، اپنے آدمیوں کو لے کر نادر شاہ کے مقابلے کے لئے روانہ ہو گیا۔ طرفہ تماشا یہ کہ خانِ دوراں کی فوج الگ لڑنے جا رہی تھی اور سعادت کا لشکر الگ مورچہ بند تھا۔ اس وقت دن ڈھل رہا تھا۔ نادر شاہ نے دشمن کو سامنے دیکھ کر فوج کی صف بندی کی اور خود ہراول دستے کے ساتھ میدانِ جنگ تک آ گیا۔ اس کی فوج کے دو حصے خانِ دوراں اور سعادت خاں سے لڑنے کے لئے چلے گئے۔ ایک ایسا فاتح جس نے ایران کے بعد افغانستان کو روند ڈالا تھا، جس کے خوف سے وسط ایشیاء کانپ رہا تھا، اس کا مقابلہ ہندوستان کی ایسی فوج کر رہی تھی جو دو سپہ سالاروں کی رقابتوں کی وجہ سے دو حصوں میں منقسم تھی اور دونوں حصے الگ الگ لڑ رہے تھے۔ قزلباشوں کے برق رفتار گھوڑوں نے آنِ واحد میں دشمنوں پر ہلہ بول دیا اور خانِ دوراں اور سعادت خاں کی فوج گاجر مولی کی طرح کٹنے لگی۔ دونوں سپہ سالاروں کی فوج میں انتشار پھیل گیا۔ خصوصاً خانِ دوراں کے بے شمار جری بہادر اور نامور سالدار ہلاک ہو گئے۔ خانِ دوراں کو اتنے زخم آئے کہ وہ بے ہوش ہو گیا ادھر شاہ ہند کی فوج کا یہ عالم تھا کہ اس کا کوئی خیمہ درست حالت میں نہ ملا۔ جس میں خانِ دوراں کو آرام پہنچایا جا سکے۔ اس کا خزانہ

Marfat.com

مال واسباب، گھوڑے مویشی غرضیکہ سب کچھ لوٹ لیا گیا اور لوٹنے والوں میں زیادہ تر اس کے اپنے آدمی تھی۔ زخمی خان دوراں کو لٹانے کے لئے مشکل سے ایک خیمہ ڈھونڈا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو اس نے زبان سے یہ الفاظ ادا کئے، میں اپنا کام ختم کر چکا۔ بلاشبہ ہم نے جو کچھ کیا اس میں ہماری مرضی شامل تھی۔ سعادت خاں بظاہر میدان میں ڈٹا ہوا تھا۔ ایک قزلباش نے جو کہ اس کے وطن نیشاپور (ایران) کا تھا، اسے مخاطب کر کے کہا تم کس کے خلاف لڑ رہے ہو اور تمہارا تعلق کس لشکر سے ہے۔ سعادت خان اس انداز تخاطب سے متعجب ہوا اور اس نے جنگ بند کر دی اور ساتھ ہی گرفتاری دے دی۔ وہ حالتِ اسیری میں نادر شاہ کے سامنے حاضر کیا گیا۔ نادر شاہ اس کے ساتھ محبت سے پیش آیا۔

یہ یقین کرنے کے لیے مضبوط وجوہ موجود ہیں کہ مغلیہ دربار میں اپنی ناقدری پر سعادت خاں نے ایک غدارو الا گھٹیا کردار ادا کیا۔ اس نے اپنی فوج کو الگ کر کے خان دوراں کو راستے سے ہٹایا، بلکہ مروا دیا۔ جب اسے خان دوراں کی ہلاکت کی خبر ملی تو اس نے نادر شاہ کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دیے اور قیدی بن گیا۔ یاد رہے کہ سعادت خاں نادر شاہ کا ہم مسلک اور ہم وطن تھا۔ اس وطنی اور مسلکی عصبیت کے علاوہ سعادت خاں کو شہنشاہ محمد شاہ سے یہ گلہ بھی تھا کہ اس نے آصف جاہ کو خان دوراں کے بعد وزیر اعظم بنا دیا۔ لہٰذا اس نے عباسی دور کے علقمی کی پیروی میں سلطنت مغلیہ کو تباہ کرنے کا عزم بالجزم کر لیا تھا۔

سعادت خاں نے نادر شاہ کی برائے نام قید میں مغلیہ سلطنت کی تذلیل اور تباہی کی سفارش کی اور بادشاہ دہلی کی دولت وثروت کے افسانے نادر شاہ کو سنائے۔ سب سے پہلے سعادت خاں نے نادر شاہ کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ بادشاہ دہلی سے دو کروڑ روپے لے کر واپس چلا جائے گا اور ملک ہندوستان پر قبضہ نہیں کرے گا۔ صلح نامہ کی شرائط طے کرنے کے لئے محمد شاہ نے امیر الامرا (وزیر اعظم) آصف جاہ کو نادر شاہ کے پاس بھیجا تا کہ صلح کی یہ شرط پختہ ہو جائے۔ وزیر اعظم خود نادر شاہ کے خیمے میں آیا۔ طے ہوا کہ اگلے روز خود بادشاہ دہلی بادشاہ ایران سے ملاقات کے لئے اس کے خیمہ میں جائے گا تا کہ صلح کی شرائط پر دونوں طرف سے دستخط ہو سکیں۔

سعادت خاں کی تیار کردہ سازش کے مطابق نادر شاہ نے محمد شاہ، اس کے حرم، مقربین اور متوسلین کے لئے ایک خصوصی خیمہ نصب کروایا اور دوسرے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ واپس دہلی چلے جائیں۔ نادر شاہ نے اپنے معزز قیدی بادشاہ دہلی سے ایک حکم نامہ پر دستخط کروائے جس کے مطابق سعادت خاں کے لئے دہلی میں شاہی محل کے دروازے کھول دیے جائیں۔ شہر کے نائب ناظم لطف اللہ صادق نے حکم کی تعمیل کی اور سعادت خاں کو اس کے ساتھیوں سمیت شاہی محل میں داخل ہونے دیا۔ جہاں سوائے پہرے داروں کے اور کوئی موجود نہ تھا۔ بہر حال سعادت خان نے محل میں داخل ہو کر خوب لوٹ ماری اور نادر شاہ کی توقعات سے بھی زیادہ خزانہ سمیٹ کر اس کے پاس لایا۔

چونکہ محمد شاہ ہر لحاظ سے شکست خوردہ تھا، اس کی فوج بھی کٹ چکی تھی اور کم از کم دس شہزادے اور تمام فوجی سردار قتل ہو چکے تھے، اب نادر شاہ کے لئے اس معزز قیدی سے کوئی کام لینا مشکل نہ تھا۔ چنانچہ سعادت خاں کی واپسی کے بعد نادر شاہ اور محمد شاہ دونوں اکٹھے دہلی روانہ ہوئے۔ تاہم پہلے محمد شاہ شہر میں داخل ہوا تا کہ نادر شاہ کا استقبال کیا جا سکے۔

Marfat.com

نادر شاہ کو محمد شاہ کے ساتھ لال قلعے میں رہتے ہوئے دوسرا دن تھا کہ دہلی میں کسی چنڈو خانے سے خبر یا گپ نکلی کی نادر شاہ مرگیا ہے۔ اس خبر کے سنتے ہی دہلی والوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور انہوں نے ایرانی افواج کا جو فرد بھی ملا اسے قتل کر دیا۔ حالانکہ نادر شاہ لال قلعے کے اندر تھا اور دروازے پر اس کے ایرانی فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ نادر شاہ کو جب ایرانی سپاہیوں کے قتل عام کی خبر ملی تو وہ ہاتھی پر سوار ہو کر لال قلعے سے باہر آیا اور اپنے سپاہیوں کو دہلی میں قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ خود مسجد کی سیڑھیوں میں بے نیام تلوار لے کر بیٹھ گیا۔ جس کا مقصد تھا کہ پورے زور سے دہلی کے باشندوں کو قتل کیا جائے۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ جہاں کسی ایرانی سپاہی (قزلباش) کی لاش ملے وہاں ایک شخص کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سپاہیوں نے گھروں میں گھس کر نہ صرف قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا بلکہ مقتولوں کی بیویوں اور بیٹیوں کو زبردستی لے بھاگے۔ کئی مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ اس ایک روزہ کارروائی میں نادر شاہ نے ایک لاکھ باشندوں کو قتل کرایا۔ بالآخر امیر الامرا آصف جاہ اپنی دستار گلے میں ڈال کر نادر شاہ کے پاس حاضر ہوا اور قتل عام بند کرانے کی درخواست کی جو اس نے منظور کر لی۔

کہتے ہیں جب دہلی پر نادر شاہ کا قبضہ ہر لحاظ سے مکمل ہو گیا تو اس نے تورانی سردار آصف جاہ اور ایرانی سردار سعادت خاں کو اپنے حضور طلب کیا۔ باہمی عداوت اور سازش پر دونوں کی سرزنش کی۔ اگر یہ دونوں باہم متفق رہتے اور سعادت خاں غداری نہ کرتا تو یہ حادثہ شاید رونما ہوتا۔ نادر شاہ بھی تیمور کی طرح غداروں سے کام لیتا تھا لیکن انہیں پسند نہیں کرتا تھا۔ دونوں کو خوب برا بھلا کہنے کے بعد نادر شاہ نے ان کی ڈاڑھیوں پر تھوکا اور انہیں اپنے سامنے سے دھتکار کر باہر نکال دیا۔ اس بے عزتی پر دونوں اس قدر دلبرداشتہ ہوئے کہ انہوں نے زہر پی لیا۔ جس کے نتیجے میں سعادت خاں تو فوراً مر گیا لیکن آصف خاں بچ گیا۔

دہلی کی تباہی اور قتل عام کے بعد محمد شاہ نے بھی اس جشن بے چارگی اور ذلت کو اپنے طریقے سے منایا۔ اس نے اپنی محبوب طوائف نور بائی کو بلایا اور نادر شاہ کے ساتھ بیٹھ کر مجرے کا حکم دیا۔ نور بائی نے دونوں بادشاہوں اور امرا کی محفل کو خوب گرما دیا تو نادر شاہ کو نور بائی پر غصہ آ گیا۔ اس نے کہا کہ ''نور بائی روئے ہندسیاہ کن یا کہ ایرانت بردہم'' نور بائی یہ نادری حکم سن کر گھبرا گئی لیکن فوراً ایک شاطر حرافہ کی طرح اس نے نئی غزل چھیڑ دی جس کے دو شعر اس طرح تھے:

من شمع جاں گدازم تو صبح دلکشائی	سوزم گرت نہ بینم میرم چوں رخ نمائی
نزدیک ست ایں چنینم وراں چناں کہ گفتم	نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

نادر شاہ نے پانچ روز تک دہلی میں قیام کیا۔ اس کے قیام اور فوج کے قیام کا تمام خرچ محمد شاہ رنگیلے کو اٹھانا پڑا۔ محمد شاہ نے شاہی خزانہ کے نوادرات اور زر و جواہر نادر شاہ کے روبرو پیش کئے۔ نادر شاہ نے سب پر قبضہ کر لیا۔ اس نے مغل بادشاہ اور اس کے امراء سے جو دولت لوٹی اس کی مالیت آٹھ کروڑ پونڈ سٹرلنگ کے برابر تھی۔ اس کے علاوہ گھوڑے، ہاتھی، مال مویشی اور عام عوام کو جس طرح نچوڑا، اس کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ آج کل کے اندازے کے مطابق نادر شاہ کی لوٹی ہوئی رقم

Marfat.com

پچیس ارب روپوں سے زیادہ تھی۔اس کے علاوہ نادر شاہ شاہ جہاں کا بنوایا ہوا تختِ طاؤس اور مشہور ہیرا کوہِ نور پگڑی بدلنے کے بہانے محمد شاہ سے ہتھیا کر لے گیا۔مغل بادشاہوں کا صدیوں پرانا خزانہ لٹانے اور ملک کی بے حرمتی کروانے کے بعد محمد شاہ خوش تھا کہ جان بچ گئی اور نادر شاہ دہلی چھوڑ کر چلا گیا۔

محمد شاہ نے 1719ء سے 1748ء تک پورے اٹھائیس سال ہندوستان پر حکومت کی۔نادر شاہ نے 1735ء میں دہلی کو تاراج کیا۔نادر شاہ کے بعد عملاً مغلوں کی حکومت ختم ہو گئی تھی۔محمد شاہ نے نادر شاہ کے چلے جانے کے بعد 8 سال اپنی سابقہ کرتوتوں کے ساتھ گزارے اور سلطنتِ مغلیہ کے پورے سانحے میں شہ مات کا کردار ادا کیا۔

نواب زکریا خاں گورنر لاہور جس کا ذکر نادر شاہ کے لاہور پر حملہ میں آ چکا ہے۔کے چھوٹے بیٹے شاہ نواز خاں جو ملتان کا گورنر تھا۔نے لاہور کی باگ ڈور اپنے بڑے بھائی یحییٰ خاں سے زبردستی لینے کی کوشش کی۔لاہور پر حملہ کر دیا اور فتح پائی۔اس طرح لاہور بھی شاہ نواز کی عملداری میں چلا گیا۔شاہ نواز نے یحییٰ خاں کو گرفتار کر لیا تھا لیکن وہ کسی طرح فرار ہو کر محمد شاہ کے پاس دہلی پہنچ گیا۔جس کی مدد کے لئے قمر الدین وزیر اعظم کا مستعد ہونا فطری عمل تھا کیونکہ میر قمر الدین اور یحییٰ میں قریبی رشتہ داری تھی۔چنانچہ دہلی کی طرف سے متوقع حملہ کے پیشِ نظر شاہ نواز نے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھ کر اپنی مدد کے لئے بلا لیا۔جو خود نادر شاہ کی جگہ لے چکا تھا۔کیونکہ نادر شاہ کے قتل کے بعد 1748ء میں وہ برسرِ اقتدار آ چکا تھا۔

احمد شاہ ابدالی 1738ء میں نادر شاہ کی رکاب میں برصغیر آ چکا تھا۔نیز وہ پنجاب کو ایرانیوں کی سلطنت کا حصہ سمجھتا تھا۔چنانچہ شاہ نواز کا پیغام سنتے ہی اس کے ایلچی کی خوب پذیرائی ہوئی اور چند ہفتوں کے بعد احمد شاہ نے پنجاب پر حملہ کر دیا۔

ادھر شاہ نواز کے ماموں میر قمر الدین نے اسے سلطنتِ دہلی کی طرف سے ایک فرمان کے ذریعے لاہور، ملتان، کشمیر، کابل اور سندھ کی صوبیداری عطا کر دی۔چنانچہ اب شاہ نواز خان خود بخود احمد شاہ کے مقابل آ گیا۔احمد شاہ نے اس وعدہ خلافی کا سخت نوٹس لیا اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔اسے قلعہ لاہور اور مغل پورہ کے شاہانہ رہائشی علاقے سے بے حساب دولت ہاتھ لگی۔شاہ نواز دہلی کی طرف فرار ہو گیا۔اب احمد شاہ نے دہلی پر چڑھائی کا قصد کیا جبکہ لاہور میں زکریا کے بیٹے کو دیوان لکھپت رائے کی قید سے آزاد کر کے اسے پنجاب کا گورنر بنا دیا۔اس نے شاہی فرمان جاری کرنے کی غرض سے شاہی مہر تیار کروائی نیز اپنے نام کا سکہ بھی تیار کرنے کا حکم دیا۔بعد ازاں 13 مارچ 1748ء کو سرہند پر قبضہ کر لیا۔

سرہند سے قریباً نو میل کے فاصلے پر احمد شاہ اور محمد شاہ رنگیلے کی فوج میں جنگ ہوئی جس کی قیادت رنگیلے کا بیٹا احمد شاہ کر رہا تھا۔لشکر کے ساتھ محمد شاہ رنگیلا بھی موجود تھا۔نیز جے پور کا راجہ بھی 12 ہزار راجپوتوں کے ساتھ شاہی فوج کا مددگار تھا۔یہ جنگ ایک ماہ تک جاری رہی۔ایک دن نماز کے دوران مغل وزیر اعظم پر توپ کا گولا گرا اور وہ جاں بحق ہو گیا۔پھر راجہ جے پور دل چھوڑ کر میدان سے بھاگ نکلا۔تاہم میر قمر الدین کے بیٹے میر معین الدین عرف میر منو اور صفدر جنگ نے ڈٹ کر مقابلہ جاری رکھا۔انجام کار احمد شاہ ابدالی کی فوج بھاگ نکلی۔مغل فوج نے اس فوج کا تعاقب کیا تاہم احمد شاہ مسلسل سفر کرتا ہوا۔1748ء میں کابل جا پہنچا۔اس جنگ سے مغلوں کی ساکھ بحال ہو گئی اور 16 اپریل 1748ء کو محمد شاہ رنگیلے نے اس وقت وفات پائی جب شاہی لشکر فتح کے شادیانے بجاتا دہلی کی طرف جا رہا تھا۔

Marfat.com

محمد شاہ رنگیلا ضرور تھا لیکن وہ بزدل نہیں تھا۔ اس نے سید برادران کو حکمت عملی سے شکست دی اور 1722ء میں ان سے مکمل گلو خلاصی کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن وہ اس آزمائش سے گزرنے کے باوجود اپنے حقیقی فرائض کو فراموش کر کے عیش و نشاط میں مگن رہا۔ حتیٰ کہ جب نادر شاہ دہلی کے قریب پہنچ گیا تو محمد شاہ نے اس وقت بھی نادر شاہ کی تگ و تاز کو سنجیدگی سے نہ لیا اور عیش و عشرت میں محو رہا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ نظام الملک آصف جاہ جیسے وفادار اور عقلمند امیر نے اس کی بادشاہی کو سہارا دیے رکھا۔

محمد شاہ بڑا خوبصورت، نہایت حسین و جمیل، دلیر، عقلمند اور شکار اور پولو کا دلدادہ تھا۔ لیکن یہ سب صفات اس کی عیش پسندی کی وجہ سے نفرت انگیز برائیاں بن گئیں۔ وہ ان صفات سے منہ پھیر کر محض عیش و عشرت اور لہو و لعب کا پجاری بن گیا۔ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کی شکر گزاری کی بجائے نعمتوں کے کفران میں غرق ہوگیا۔ ملت اسلامیہ اسے اپنی صفوں میں کھڑے ہوئے دیکھ کر شرم محسوس کرتی ہے۔

Marfat.com

بہادر شاہ ظفر

بہادر شاہ ظفر کا پورا نام ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی اور ظفر تخلص تھا۔ بہادشاہ اکبر شاہ ثانی کا بیٹا تھا۔ اکبر شاہ ثانی شاہ عالم ثانی بادشاہ دہلی کا تیسرا بیٹا تھا۔ شاہ عالم ثانی نے 1761ء سے 1806ء تک حکومت کی۔ بہادر شاہ کے والد اکبر شاہ ثانی 1806ء سے 1837ء تک سربراہ سلطنت رہے۔ بہادر شاہ ظفر 1775ء میں پیدا ہوا اور 1837ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس طرح تخت نشینی کے وقت بہادر شاہ ظفر کی عمر 62 سال تھی۔

ابوالمظفر بہادر شاہ خاندانِ مغلیہ کا آخری تاجدار اور اردو کا ایک بہترین شاعر تھا۔ بہادر شاہ اکبر ثانی کا دوسرا بیٹا تھا اور لال بائی کے بطن سے تھا۔ اس کا سلسلہ نسب گیارھویں پشت پر شہنشاہ بابر سے ملتا ہے۔ بادشاہ ابوالمظفر بہادر شاہ بیس سال تخت نشین رہا۔ اسی بیس سالہ دور میں بادشاہ کا زیادہ وقت انگریز ریذیڈنٹ کے ساتھ ذاتی مسائل پر خط وکتابت اور بحث وتکرار میں گزرا۔ ایک ولی عہدی کی نامزدگی کا مسئلہ (انگریز جس شہزادے کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے، بادشاہ اس سے متفق نہیں ہوتا تھا) دوسرا مسئلہ وظیفہ (پنشن) میں اضافے کا تھا۔ بادشاہ کو انگریزوں سے جو گرانٹ ملتی تھی وہ اس قدر کم تھی کہ لال قلعہ کا سال بھر کا انتظام وانصرام مشکل سے چلتا تھا۔ لہٰذا بادشاہ سلامت کے دسترخوان پر عموماً دال ہی پکتی تھی۔ اختیارات کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ لال قلعہ کی اندرونی حدود میں بھی بادشاہ کو بعض اوقات ریذیڈنٹ کی اجازت ہی سے ضروری اقدامات کرنے پڑتے تھے لیکن اس تمام نمائش کے باوجود مغل بادشاہ کا نام ہندوستان کے عوام اور شہزادوں کے ذہن پر اثر رکھتا تھا۔ تھوڑا عرصہ پہلے تک ہندوستانی سکے پر بادشاہ کا نام ہی کندہ ہوتا تھا اور ہندوستان کے راجوں اور نوابوں کے نزدیک بادشاہ کے محض سایے کی طرف سے سندِ قبولیت برطانوی حکومت کی طرف سے تسلیم کئے جانے کی نسبت زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ جب بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوا تو وہ پہلے ہی ایک عمر رسیدہ کمزور اور ضعیف شخص تھا۔ نظر کمزور ہو چکی تھی، آداب والقاب پر جائیں تو وہ "جہاں پناہ، ظلِ سبحانی، شہنشاہ ہند" اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ لیکن درحقیقت بادشاہ سلامت ایک غیر ملکی کمپنی کے وظیفہ خوار تھے اور محدود آمدنی میں نہایت عسرت اور تنگی کے ساتھ گزر بسر کر رہے تھے۔ بادشاہ کے وسائل کچھ اس طرح تھے کہ اسے برطانوی کمپنی کی طرف سے ماہانہ ایک لاکھ روپے ملتے تھے۔ علاوہ ازیں اسے ڈیڑھ لاکھ روپے دہلی کے نواح میں بادشاہ کی ملکیتی زمینوں کی آمدن سے ملتے تھے اور دہلی شہر میں شاہی خاندان کے مکانات کے کرائے سے بھی معقول رقم حاصل ہوتی تھی۔ اس آمدن سے شاہی خاندان کے افراد اور شاہزادوں کے علاوہ بے شمار اہالی موالی کی فوج کے اخراجات پورے کرنے پڑتے تھے۔ ظاہر ہے کہ شاہانہ اخراجات کے مقابلے میں آمدن کم تھی۔

Marfat.com

تخت نشین ہوتے ہی بادشاہ نے ایک نوجوان خاتون زینت محل سے شادی رچالی۔ زینت محل سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ لڑکا بادشاہ کو اپنی جوان بیوی زینت محل کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی پیارا تھا۔ زینت محل کی ہر ممکن کوشش تھی کہ اسے ولی عہد قرار دیا جائے۔ چونکہ ولی عہدی کی منظوری بھی اب ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقرر کردہ گورنر جنرل دیتا تھا۔ اس لئے اس معاملے میں لال قلعہ اور ریذیڈنٹ کے درمیان خوب خط وکتابت ہوئی۔ تاہم کمپنی اس معاملے میں لال قلعہ سے متفق معلوم نہ ہوتی تھی۔ روایت یہ ہے کہ زینت محل کے بیٹے جوان بخت کو ولی عہدی پر فائز کرنے کے لئے ایک منصوبہ تیار ہوا۔ جس کے تحت موجودہ اُمیدواروں (شاہ کی بڑی اولاد) کو راستے سے اس طرح ہٹانا تھا کہ اس پر کسی کو گمان بھی نہ ہو سکے۔

کہانی اس طرح ہے کہ 1846ء میں ولی عہد نامزد بڑا شہزادہ دارا بخت اچانک انتقال کر گیا۔ یہ موت انتہائی غیر فطری انداز اور مشکوک حالات میں واقع ہوئی تھی۔ اس وقت بادشاہ کی عمر 70 سال تھی۔ دارا بخت کے بعد ترتیب کے لحاظ سے تیس سالہ شہزادہ مرزا فخرو کی ولی عہدی کی باری تھی۔ یہ شہزادہ ذرا آزاد خیال اور تیز طبع تھا۔ انگریزوں نے اپنے طور پر اس شہزادے کی بطور ولی عہد منظوری لال قلعہ بھیج دی لیکن بادشاہ اور ملکہ زینت محل نے اس پر شدید احتجاج کیا اور اپنے گیارہ سالہ بیٹے جواں بخت کی ولی عہدی اور جانشینی پر اصرار کیا۔ اس سلسلہ میں ایک روایت جو بظاہر ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ مغلیہ خاندان میں لڑکوں کا ختنہ کرانے کی رسم ایک عرصہ سے موقوف چلی آ رہی تھی لیکن بعض جسمانی اور طبی ضرورت کے تحت شہزادہ مرزا فخرو کو مختون کیا گیا تھا۔ اب لال قلعہ سے مرزا فخرو کی نامزدگی کے خلاف جو اعتراض بھیجا گیا تھا وہ یہ تھا کہ کسی ایسے شخص کو جس کا کوئی عضو کٹا ہوا ہو۔ اسے تخت نشینی کا اہل نامزد نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ شہزادہ مرزا فخرو مختون ہے اس لئے وہ ولی عہد یا بادشاہ نہیں بن سکتا۔ ان اعتراضات کے باوجود مرزا فخرو کی ولی عہدی برقرار رہی۔ اچانک یہ شہزادہ بھی ایک دن انتقال کر گیا۔ شبہ یہ تھا کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ کیونکہ کھانا کھانے کے بعد اسے قے کا شدید دورہ بھی پڑا تھا۔ یہ واقع 1856ء کا ہے۔ اس طرح شہزادے کو راستے سے ہٹا دیا گیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس واقع پر کئی روز تک سوگ منایا جاتا لیکن اگلے روز جب انگریز ریذیڈنٹ تھامس منکاف لال قلعہ میں تعزیت کے لئے آیا تو بادشاہ نے اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھما دیا جس میں ایک بار پھر شہزادہ جواں بخت کو بطور ولی عہد تسلیم کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی محل کے دوسرے شہزادوں کی طرف سے جن کی تعداد آٹھ تھی، شہزادہ جواں بخت کے تقرر کی حمایت کی گئی تھی۔ اس سے اگلے دن شہزادہ نوباش نے درخواست دی کہ جانشینی کا حقدار وہ ہے نہ کہ جواں بخت، ملکہ اور بادشاہ نے رشوت دے کر شہزادوں کو ساتھ ملایا ہے۔ جب اس جانشینی کے معاملے نے طول کھینچا تو انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ شہزادہ نوباش کو ولی عہد مقرر کیا جائے اور آئندہ جو جانشین ہوگا اسے بادشاہ کی بجائے شہزادہ ہی کہا جائے گا اور نوباش شہزادے ہی کو بہادر شاہ کی موت کے بعد خاندان کا سربراہ تسلیم کیا جائے۔ اس فیصلے سے بادشاہ ملکہ زینت محل اور شہزادہ جواں بخت کو بہت رنج پہنچا۔ بالخصوص شہزادہ جواں بخت کے ذہن میں انگریزوں کے خلاف نفرت میں شدت آ گئی لیکن شہزادہ جواں بخت کی تربیت ایسی نہ ہوئی تھی کہ وہ جرأت اور دلیری کا پیکر بن کر اصل تیموری جذبے سے سامنے آتا اور انگریزوں کے خلاف کوئی محاذ کھڑا کرتا۔ جہاں بادشاہ کی رگوں میں کئی نسلوں سے خواہی نخواہی بزدلی اور نامردی اتاری جا رہی تھی۔ وہاں جواں بخت سے کسی بھی پامردی اور دلیری کی اُمید رکھنا عبث تھا۔

Marfat.com

لال قلعے میں مقیم بادشاہ، اس کے اہل وعیال، رشتہ دار اور متوسلین کے اخراجات پورے کرنا بادشاہ کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ قلعہ کے اندر ولی عہدی کا مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا۔ غرض بادشاہ کی ساری توجہ انہی دو مسائل نے نچوڑ رکھی تھی۔ وہیں دوسری طرف لال قلعہ جہاں شاہ اور اس کا وسیع خاندان آباد تھا، ایک ایسی دنیا تھی جہاں کوئی قاعدہ قانون نہ تھا۔ شاہی خاندان کے افراد اور شہزادوں کو حقائق کی تلخیوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ یہ قلعہ اپنی جگہ ایک شہر تھا۔ وہاں جرائم اور زیادتیاں ہوتی تھیں لیکن کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ شاہی خاندان کے ارکان سست، نکمے اور شب و روز عیاشیوں کے بہانے اور ٹھکانے ڈھونڈتے تھے۔ قلعہ کے پر پیچ کونوں کھدروں میں برائی کے بھیانک واقعات ہوتے تھے لیکن بیرونی دنیا کی ہوا تک نہ لگتی تھی۔ عورتوں کی عصمت دری قلعہ کی دیواروں کے پیچھے عام تھی۔ بعض اوقات عورتوں کو قتل کر کے وہیں دفن کر دیا جاتا تھا۔ رعیت ان تمام گھناؤنے واقعات سے بے خبر رہتی تھی۔ انگریز کا قانون قلعہ کی حدود میں نافذ العمل نہیں تھا اور بادشاہ کو ان معاملات کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہ تھی۔

بوڑھے بہادر شاہ ظفر کی نبض ہر وقت اس کی جوان عمر ملکہ زینت محل کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ جو سبق وہ دیتی، بادشاہ اسی پر چلتا رہتا۔ یوں لال قلعہ کی چار دیواری تک محدود مغل سلطنت میں بھی اصل اقتدار ایک عورت کو حاصل تھا۔ بادشاہ اس کے اشاروں پر چلتا تھا۔ افیون لال قلعہ میں مدت سے استعمال ہو رہی تھی۔ تمام شہزادے اس کے رسیا تھے۔ تمباکو نوشی بھی بہت زیادہ ہوتی تھی۔ بادشاہ حقے کی نے اپنے سے علیحدہ نہیں ہونے دیتا تھا۔ شعر و شاعری کا مشغلہ جاری رہا۔ ابراہیم ذوق استاد تھے۔ غالب بھی مصاحب شاہ ہونے کے دعویدار تھے۔ اگرچہ 1857ء کے ہنگامے کے بعد اس خصوصی تعلق سے انکار کرنے والوں میں وہ بھی شامل تھے۔ قید سے پہلے بہادر شاہ کی شاعری روکھی پھیکی، جذبات سے عاری تھی۔ انگریزوں کا قیدی بن جانے کے بعد بہادر شاہ کی شاعری حقیقی کرب اور اضطراب کی نشان دہی کرتی ہے اور عمدہ شاعری کا نمونہ ہے۔ بڑھاپے میں جوانی کا لطف اٹھانے کے لئے بادشاہ کو ہر وقت طاقت و قوت کی دواؤں کی ضرورت تھی۔ حکیم احسن اللہ شاہی طبیب تھا۔ یہ حکیم لاجواب تھا اور حکیمانِ وقت میں انتخاب تھا۔ بادشاہ کی نبض اسی کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اس نے وہ مقویات و مغزیات بادشاہ کو کھلائیں کہ عہد پیری میں نخوت شباب مزاج میں پیدا ہوئی اور وہ مفرحات استعمال میں لایا کہ طبیعت نے کیفیت معاشرت میں زبردست تبدیلی محسوس کی۔

لال قلعہ میں شاہی خاندان کے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا لیکن افسوس کہ اس دور میں جوانمردی اور قائدانہ صلاحیت کا مالک ایک شہزادہ بھی سامنے نہ آیا۔ 1856ء میں ولی عہدی کے جھگڑے کے وقت انگریز ریذیڈنٹ نے شاہی خاندان کے تمام افراد کی جامع فہرست تیار کی تھی۔ یہ فہرست دو ہزار ایک سو چار افراد پر مشتمل تھی جبکہ لال قلعہ میں شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے اہم اور کم اہم افراد، متوسلین اور خدام کی تعداد 1857ء میں جب دہلی پر قیامت ٹوٹی، تعداد کا اندازہ دس ہزار لگایا گیا۔

1857ء کا ہنگامہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ بہادر شاہ ظفر کے متعلق مشہور ہو گیا کہ وہ اودھ میں مقیم اپنے اقرباء مرزا سلیمان شکوہ اور مرزا حیدر شکوہ وغیرہ کے زیر اثر سنیوں کا عقیدہ ترک کر چکا ہے اور اس سلسلے میں بادشاہ کی صحت یابی کی منت

Marfat.com

کے طور پر علم بھی چڑھایا گیا۔ غالباً اس کا چرچا ایک سیاسی مقصد کے لئے کیا گیا تاکہ نواب اودھ کے توسط سے انگریزوں کے خلاف ایران سے مدد حاصل کی جاسکے۔

کہتے ہیں اس سلسلے میں اودھ کا ایک شہزادہ بادشاہ کا ایک خط لے کر ایران بھی گیا تھا۔ بہر حال حقائق جو بھی ہوں۔ بہادر شاہ نے بڑا اہتمام کر کے اپنے فقہی مسلک میں تبدیلی کی افواہ کی تردید کی۔

انگریزوں کی مذہبی سیاسی اور معاشی پالیسیوں کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دلوں میں بے چینی اور اضطراب بڑھنے لگا۔ ہندوستان کا بادشاہ ایک مسلمان تھا۔ ہندوؤں کے معاملے میں مغلوں نے ہمیشہ رواداری کی پالیسی اختیار کیے رکھی۔ اس لئے ہندو بالعموم اور مسلمان بالخصوص بادشاہ سے جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ مغل بادشاہ کے ساتھ انگریزوں کے ہتک آمیز رویہ کی وجہ سے ہندوستانیوں کے جذبات مجروح ہو رہے تھی۔ انگریزوں کے خلاف نفرت کا لاوا پک رہا تھا۔ بے چینی اور اضطراب کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف بغاوت کے اسباب پیدا ہو رہے تھے۔ وہ مسلسل ان کے جذبات کا خون کر رہے تھے۔ انگریزوں کے خلاف آگ بھڑکنے کے لئے فضا تیار تھی۔ صرف تیل دکھانے کی دیر تھی۔ ہندوستانیوں کو یہ موقع خود انگریزوں نے مہیا کر دیا۔

1856ء میں انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ مختلف چھاؤنیوں میں پرانی بندوق کی جگہ خصوصی رائفل جاری کر دی جائے۔ اس نئی رائفل میں جو کارتوس استعمال ہوتے تھے۔ ان کے اوپر چربی لگی ہوتی تھی۔ جسے سپاہیوں کو دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا۔ ان کارتوسوں کے بارے میں یہ خیال گردش کرنے لگا کہ ان پر جو چربی لگی ہوئی ہے وہ گائے اور سور کی چربی ہے اور اس حرکت سے انگریز کا مقصد مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا ہے۔

اس افواہ کی تقویت ایک نیچ ذات کے ہندو کے بیان سے پہنچی۔ اس نے ایک روز ایک برہمن سے کہا کہ اپنے لوٹے سے مجھے پانی پلا دے۔ برہمن نے پانی پلانے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے کیا معلوم کہ تیری ذات کیا ہے؟ اس نیچ ذات ہندو نے برہمن سے کہا کہ یہ تمہاری ذات پات کا بت۔ بہت جلد چکنا چور ہونے والا ہے۔ اس لئے کہ تمہیں وہ کارتوس دانتوں سے کاٹنے پڑیں گے جن پر گائے اور سور کی چربی لگائی جاتی ہے۔

انگریزی حکومت نے اس کارتوس کے متعلق بے چینی کا احساس نہ کیا۔ چنانچہ اس افواہ نے حقیقت کا روپ دھار لیا اور اچانک یہ لاوا ابل پڑا۔ بیرک پور چھاؤنی کے ایک ہندوستانی سپاہی منگل پانڈے نے سارجنٹ میجر پر گولی چلا دی۔ منگل پانڈے کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر مقدمہ چلا اور 8 اپریل 1857ء کو بیرک پور چھاؤنی میں منگل پانڈے کو پھانسی دے دی گئی۔ 9 مئی کو میرٹھ کی فوجی چھاؤنی میں سپاہیوں نے چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ ان پر بھی مقدمہ چلا اور انہیں دس سال قید بامشقت کی سزا دے دی گئی۔ انگریز جتنی سختی کے ساتھ ان کے جذبات دبانے کی کوشش کر رہے تھے، اتنی ہی تیزی کے ساتھ جذبات میں شدت پیدا ہو رہی تھی۔ چنانچہ میرٹھ چھاؤنی کی تین رجمنٹوں نے بغاوت کر دی اور دہلی کی طرف مارچ شروع کر دیا۔ سپاہیوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور یہاں پر انگریزوں کا قتل عام کیا۔ سپاہیوں نے بہادر شاہ ظفر کو اپنی تحریک کا مرکز بنا کر انگریزوں کے خلاف کارروائیاں تیز کر دیں۔ یہ فوجی بغاوت بہت جلد ہندوستان کے

دیگر علاقوں بریلی، شاہ جہاں آباد، مراد آباد، لکھنؤ، بنارس، کانپور اور جھانسی تک پھیل گئی۔

اب یہ محض فوجی بغاوت نہ تھی بلکہ انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی تھی، جس میں بلاتفریق مذہب مسلمان اور ہندو شامل تھے۔ مرہٹوں کے پیشوا دھوند دپنتھ نانا صاحب اور لکشمی بائی المعروف جھانسی رانی وغیرہ مسلمانوں کے شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ ہندو اور مسلمان طویل سیاسی اور مذہبی جدوجہد میں ہمیشہ ایک دوسرے کے مخالف رہے لیکن بیرونی غلبہ کے خاتمے کے لئے انگریزوں کے خلاف متحد ہو چکے تھے۔ ان دونوں قوموں کا مرکز فقط مسلمان مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی ذات تھی۔

پہلے ہلے ہی میں انگریزوں سے دہلی چھن چکا تھا، جس کی وجہ سے انگریز تلملا رہے تھے۔ کانپور، شاہجہاں آباد اور لکھنؤ میں سخت مقابلے کا سامنا تھا۔ دہلی پر دوبارہ قبضے کے لئے انگریزوں نے اپنی روایتی مکاری کے ذریعے غداروں کی تلاش شروع کی۔ لال قلعے کے اندر انہیں بہت جلد مرزا الٰہی بخش، رجب علی اور حکیم احسن اللہ ایسے غدار مل گئے جو میر جعفر اور میر قاسم سے بھی اس غداری میں زیادہ طاق تھے۔ ایک بدقسمتی یہ بھی ہوئی کہ بادشاہ قلعہ سے نکلتے وقت وہ روزنامچہ قلعہ میں چھوڑ آیا جسے رجب علی تحریر کیا کرتا تھا۔ چنانچہ رجب علی پل پل کی خبریں انگریزوں کو پہنچانے میں لگ گیا۔ مرزا الٰہی بخش زینت محل کا بھائی تھا، ان سب نے مل کر زینت محل کے ذریعے بہادر شاہ ظفر پر سپاہیوں سے تعلق ختم کر کے انگریزوں کی پناہ گاہ میں چلے جانے کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ بادشاہ کو غلط اطلاعات پہنچائی گئیں۔ مغلیہ بادشاہت کے مشہور جنرل بخت خاں کو بھی، یہ وہ جنرل تھا جو لمبے عرصہ تک انگریزوں سے جنگ جاری رکھنا چاہتا تھا، بادشاہ سے دور کر دیا۔ اس طرح بادشاہ کو ہر طرف سے بے بس کر کے انگریز کی غلامی پر (پناہ گاہ) پر رضامند کر لیا۔

انگریزوں نے فوجی دباؤ بڑھانے کے لئے پنجاب کے غداروں کو آواز دی۔ پنجاب کے ٹوانے، دولتانے، ٹمن، دابزادے، گیلانی، مزاری، لغاری اور گردیزی سر کے بل چل کر حاضر ہو گئے اور اپنے ہم مذہب بادشاہ کو دنیاوی لالچ کے نتیجے میں اپنے رضا کار بھیج کر شکست سے دوچار کر دیا۔ بالآخر اندرونی اور بیرونی غداروں کی کوششوں سے دہلی 20 ستمبر 1857ء کو دوبارہ انگریزوں کے خونی چنگل میں چلا گیا۔

بادشاہ اپنے غدار مشیروں کے مشوروں کے مطابق ہمایوں کے مقبرے میں پہنچ چکا تھا۔ انگریزوں کی کوشش تھی کہ بادشاہ جلد از جلد گرفتار ہو جائے تاکہ جنگ ختم ہو سکے۔ مرزا الٰہی بخش کی نشان دہی پر جنرل ہڈسن مقبرہ ہمایوں پہنچا اور جان بخشی کے وعدہ پر اپنے شہزادوں اور اہل خاندان کے ہمراہ مقبرہ سے باہر آ گیا۔ عجیب دلدوز منظر تھا۔ اکبر اعظم اور عالمگیر کا جانشین خون خوار بھیڑیوں سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

انجام کار کینہ پرور ہڈسن نے مغل تاجدار کے سامنے اس کے دس شہزادوں کے بھیجے چھلنی کر دیے اور باقی اہل خانہ کو گرفتار کر کے قلعے میں قید کر دیا۔ ایک لمبے بحث مباحثے کے بعد یہ طے ہوا کہ بادشاہ پر مقدمہ چلایا جائے۔ اسی دوران بادشاہ بیمار پڑ گیا۔ بچنے کی امید کم تھی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس وقت بادشاہ کی عمر 85 سال تھی۔ 17 جنوری کو دیوانِ خاص میں جو ایک صدی تک تخت طاؤس کی بہار دیکھ چکا تھا مظلوم بہادر شاہ کا مقدمہ شروع ہوا۔ مقدمہ چالیس دن تک جاری رہا۔ اس میں اکیس پیشیاں ہوئیں۔ 9 مارچ 1858ء کو بہادر شاہ کے تحریری بیان کا ترجمہ انگریزی زبان میں فوجی

Marfat.com

کمشنر کے سامنے پڑھا گیا۔اسی روز ایڈووکیٹ جنرل نے مختلف شہادتوں اور وثیقوں کے متعلق طویل تقریر کی۔بعدازاں کمیشن نے فیصلہ صادر کر دیا کہ بہادر شاہ پر چار الزامات تھے، چاروں ثابت ہو گئے ہیں۔ازروئے قانون وہ سزائے موت کا مستحق ہے۔یہ فیصلہ پنجاب کے چیف کمشنر جان لارنس کے سامنے پیش ہوا۔جس نے ایک مفصل نوٹ لکھا اور جلاوطنی کی سزا تجویز کی اور رپورٹ منظوری کے لئے مرکزی حکومت کے پاس بھیج دی۔جہاں سے حکم ہوا کہ قیدی بادشاہ کو مع متعلقین کلکتہ روانہ کر دیا جائے۔

5 نومبر 1858ء کو شاہ دہلی سے روانہ ہوا۔غالباً سولہ مرد و زن تھے۔اس قافلہ بے کساں کے ساتھ 600 گورے حفاظت کے لئے مامور تھے۔سال کے اختتام سے پہلے بہادر شاہ رنگون پہنچ گئے تھے۔جہاز سے اترتے ہی گورے بادشاہ کو صدر بازار رنگون کے ایک دو منزلہ بنگلے میں لے گئے۔بنگلے کے گرد گوروں کا پہرہ رہتا تھا۔چھ سو روپے ماہوار خرچ کے لئے مقرر تھے۔بادشاہ کا زیادہ تر وقت تسبیح و استغفار کے ساتھ ساتھ پریشانی کے عالم میں چھت کی کڑیاں گننے اور حقہ پینے میں گزرتا۔7 نومبر 1862ء کو پیغام اجل آ پہنچا اور شاہ کو رنگون ہی میں دفن کر دیا گیا۔موت کے وقت زینت محل جواں بخت اور اس کی بیوی کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔کچی قبر میں مکان کے صحن میں دفنا دیا گیا۔چوبیس سال بعد زینت محل نے بھی وفات پائی اور شوہر کے پہلو میں دفن کر دی گئی۔شہزادہ جواں بخت والدہ کی وفات سے دو سال پہلے برما کے کسی دور افتادہ مقام پر فوت ہو گیا تھا۔یوں ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے تمام آثار پیوند خاک ہوئے۔رہے نام اللہ کا

Marfat.com

مغلیہ دورِ حکومت کے زوال کے اسباب و نتائج

بہادر شاہ ظفر کو فوت ہوئے 152 سال گزر چکے ہیں۔ انگریزوں کے ہاتھوں بے بسی کی موت، دہلی کی تباہی اور انگریزوں کی طرف سے ہندوستانی مسلمانوں کی قطار در قطار پھانسیاں اور آخر میں ہندوستان میں مسلمانوں کے نظامِ تعلیم، نظامِ معاشرت میں خلاف اسلامی تبدیلیاں، مسلمانوں کے مجاہدانہ کردار کی تباہی، مسلمانوں کو ان کے اصل نصب العین یعنی رزق حلال اور اس پر قناعت سے ہٹا کر اس شیر دل قوم کو اوباش بنا دیا۔ وہ رزقِ حلال کی تلاش کی بجائے صرف رزق کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور اس تلاش میں اخلاق و کردار کے سارے تقاضے بالائے طاق رکھ دیے۔ مسلمان قوم کا یہ معاشرتی اور تمدنی زوال، حکومتی زوال سے کہیں بڑا زوال ہے۔ چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں، کہ انگریز کی سیہ کاری کا یہ اثر ہے کہ نہ تمدن رہا نہ معاشرت رہی اور مسلمان اس کو تلاش کرنے سے بھی دست کش ہو گیا۔ یہ وہ حالات ہیں کہ جن سے امت مسلمہ بالعموم اور ہند و پاک میں بسنے والے مسلمان بالخصوص صد درجہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان حالات میں کوئی بھی دردمند مسلمان ہندوستان کے مسلم معاشرہ کے فراز کو پستی میں تبدیل ہوتے ہوئے آسانی سے برداشت نہیں کر سکتا۔ مغل حکمران کن رستوں سے گزر کر انتہائی ذلت آمیز گہرائی تک کیسے پہنچے۔ یہی ہمارے اس مقالے کا موضوع ہے۔

زوالِ حکومت

اورنگ زیب کی وفات 1707ء میں ہوئی اس کے بعد بہت جلد مغلیہ حکومت کا زوال پوری طرح نمایاں ہو گیا۔ اورنگ زیب نے 90 سال کی عمر پائی۔ جس میں 50 سال تک معاشرے اور حکومت میں جو تبدیلیاں آ چکی تھیں، انہیں پورے خلوص اور ہمت سے اچھائیوں میں تبدیل کرنے میں لگا رہا اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمد معظم شاہ بہادر شاہ تخت نشین ہوا تو وہ بھی بوڑھا ہو چکا تھا اور اسے پانچ سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہ ملا۔ اس کے زمانے میں پہلے راجپوتوں نے اور پھر سکھوں کے سرگروہ بندہ نے مغلوں کے علاقے کو لوٹا۔ راجپوتوں کی بغاوت تو اس نے خود رفع کر دی لیکن بندہ کا قلعہ فرخ سیر نے فتح کیا جو 1712ء سے 1719ء تک حکمران رہا۔ کئی لحاظ سے وہ قابل اور سمجھدار حکمران تھا۔ اس کے زمانے میں مسلمان امراء کے دو فریق بن چکے تھے۔ ایرانی اور تورانی (شیعہ اور سنی) ان کے اختلافات نے اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ان قبایلی اور فرقہ وارانہ اختلافات کے علاوہ حکومت کو ضعف اس لئے بھی پہنچا کہ فرخ سیر کو تخت "سید برادران" امیر الامرا سید حسین علی اور قطب الملک سید عبداللہ کی مدد سے ملا تھا۔ وہ بادشاہ کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں

رکھنا چاہتے تھے۔ سید عبداللہ وزیر سلطنت اور حسین علی دکن کا با اقتدار صوبے دار تھا۔ جب فرخ سیر نے سید برادران کا اقتدار کم کرنا چاہا تو حسین علی کی بے غیرتی اور نمک حرامی سے مرہٹوں کو دکن میں چوتھ اور سر دیش مکھی کی اجازت مل گئی۔ خاندان مغلیہ کے زوال کی پہلی منزل یہ تھی۔

اس کے بعد سید برادران نے بادشاہ گری کا سلسلہ شروع کیا اور 18 فروری 1719ء سے 14 اگست 1719ء تک تین بادشاہ بناسے۔ یہی وجہ تھی کہ تورانی امراء نے ان بھائیوں کے مظالم دیکھے تو انہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جو محمد شاہ رنگیلے کے دورِ حکومت کے اولین دنوں میں پورا ہوگیا۔ کئی دو روزے بادشاہوں کے بعد محمد شاہ تخت نشین ہو کر 1719ء سے 1748ء تک حکمران رہا۔ اس کے زمانے میں نظام الملک آصف جاہ نے امورِ سلطنت کی اصلاح کی کوشش کی لیکن جب رنگیلے بادشاہ نے یہ گوارا نہ کیا تو نظام الملک مایوس ہو کر 1724ء میں دکن چلا گیا۔ وہاں اس نے حکومت آصفیہ کی بنیاد ڈالی اور اسلامی حکومت کی تباہی و بربادی سے جو کچھ بچ سکتا تھا اسے محفوظ کرلیا۔ اس کے بعد حکومت دہلی کا وقار بتدریج کم ہوتا گیا۔ مرہٹوں کے علاوہ روہیلوں اور جاٹوں نے بھی بغاوتیں کیں۔ مزید ظلم یہ ہوا کہ 1739ء میں نادر شاہ آ گیا اس نے دل کھول کر دہلی کو لوٹا اور قتل عام کیا۔ دہلی کا خزانہ خالی اور فوج منتشر کر کے واپس چلا گیا۔ اس کے بعد شاہ دہلی میں اتنی سکت باقی نہ رہی کہ خود مختار صوبیداروں اور دوسرے دشمنوں کا مقابلہ کرسکے۔ چنانچہ بنگال میں علی وردی، دکن میں نظام الملک، اودھ میں برہان الملک سعادت خاں عملی طور پر خود مختار ہو گئے۔

محمد شاہ رنگیلے کی وفات 1748ء میں ہوئی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہوا جس کے زمانے میں ایرانی اور تورانی اختلافات پھر بڑھ گئے۔ ایرانیوں کا سرگروہ برہان الملک کا جانشین صفدر جنگ تھا اور تورانیوں کا سرگروہ نظام الملک کا پوتا شہاب الدین تھا۔ جس نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ گانٹھ کر طرح طرح کے مظالم شروع کر دیے۔ 1754ء میں احمد شاہ کو اندھا کیا اور اس کی جگہ عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھایا۔ پانچ سال بعد اسے بھی مروا دیا اور ایک اور شہزادے کو تخت نشین کیا۔ ایرانی اور افغان امراء نے احمد شاہ ابدالی سے شہاب الدین اور اس کے مرہٹے ساتھیوں کی شکایت کی۔ احمد شاہ لاہور پر پہلے ہی قابض ہو چکا تھا لیکن مرہٹوں نے اس کے گورنر کو لاہور سے نکال دیا۔ اب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس کے حامی ایرانیوں کے سرگروہ شجاع الدولہ ابن سعادت علی خاں اور افغانوں کے سرگروہ نجیب الدولہ تھے۔ مرہٹوں کے ساتھ سورج مل جاٹ، ابراہیم گاردی اور دوسرے لوگ تھے۔ 1761ء میں پانی پت کے میدان میں بڑا معرکہ ہوا۔ جس میں مرہٹوں کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرسکتا تھا لیکن وہ شاہ عالم کی بادشاہت تسلیم کروا کر واپس چلا گیا۔ پانی پت کی اس جنگ سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی احمد شاہ ابدالی کو مرہٹوں کے خلاف جنگ کرنے کی دعوت دی تھی۔

شاہ عالم حکومت چلانے اور سنبھالنے کے قابل نہ تھا۔ 1757ء میں پلاسی کا معرکہ ہوا تھا اور بنگال انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کے چند سال بعد آرہ کے مقام پر مشرقی صوبوں کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو مل گئی لیکن شمالی ہندوستان میں زیادہ اقتدار مرہٹوں کے پاس تھا۔ پانی پت کی شکست کے بعد وہ اس قابل نہ رہے کہ انگریزوں کا مقابلہ کرسکیں۔ لیکن

Marfat.com

اس قابل ضرور تھے کہ دہلی کے شاہ شطرنج کو اپنے قابو میں رکھیں۔ شروع میں ان کا اقتدار بہت مؤثر نہ تھا لیکن جب روہیلوں کی بغاوت ہوئی اور غلام قادر روہیلہ نے بادشاہ کو اندھا کر دیا اور تخت سے اتار دیا۔ اس کے بعد مرہٹوں نے غلام قادر روہیلے کو شکست سے دوچار کیا اور اسے قتل کر کے دوبارہ شاہ عالم کو تخت پر بٹھا دیا۔ شاہ عالم 1806ء تک بادشاہ رہا لیکن اس کی حالت مردہ بدست زندہ سے بہتر نہ تھی۔

1805ء میں لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا اور شاہ عالم کو تخت نشین رہنے دیا۔ اس کے بعد 1806ء سے 1837ء تک اکبر شاہ ثانی اور 1837ء سے 1857ء تک بہادر شاہ تخت دہلی پر مقیم رہے لیکن ان کی حیثیت بھی شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ دراصل مغلوں کی اسلامی حکومت 1788ء میں ختم ہو چکی تھی۔ جب غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کو اندھا کیا تھا اور وہ مرہٹوں کی مہربانی سے دوبارہ تخت نشین ہوا تھا۔

اس دوران مشرق کی طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت وسیع ہو رہی تھی۔ پنجاب میں احمد شاہ ابدالی کا پوتا شاہ زمان راجہ رنجیت سنگھ کو لاہور کی گدی دے گیا تھا اور وہ خود مختار حاکم بن گیا۔ 1820ء کے قریب اس نے کشمیر اور پشاور فتح کر لئے۔ چنانچہ 1849ء تک یہ علاقے سکھوں کے ہاتھ میں رہے۔ شمالی ہندوستان میں شاہان اودھ مقابلتاً زیادہ دیر تک محفوظ رہے۔ 1856ء میں جب تک یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت نہ آ گیا شجاع الدولہ کی اولاد یہاں حکمران رہی۔ سندھ کے میروں کا خاتمہ 1843ء میں ہو گیا تھا۔

جنوب میں سلطان حیدر علی نے میسور میں ایک نئی حکومت قائم کر لی تھی لیکن 1799ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی مرہٹوں اور نظام کی متحدہ افواج نے ٹیپو کو شکست دی اور اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ ان ہنگاموں میں فقط نظام دکن کا تاج و تخت سلامت رہا۔ 1948ء تک ریاست حیدر آباد، مغلیہ حکومت اور تہذیب کی آخری یادگار سمجھی جاتی تھی جس پر بعد میں انڈین یونین نے قبضہ کر لیا۔

زوال حکومت کے بیان کے ساتھ اس سانحہ کے اسباب کا ذکر بھی متوقع ہے لیکن یہاں ان کی تفصیل دینے کی ضرورت نہیں۔ بنیادی طور پر تو زوال حکومت اور زوال تمدن کا اصل باعث وہ علمی، ذہنی اور عسکری کوتاہیاں تھیں جنہیں ہم نے عہد اکبری کی تاریخ والے باب میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ ان امور میں مغلوں کی روز افزوں کمزوریاں تھیں جن کا قدرتی نتیجہ تھا کہ کسی نہ کسی وقت وہ ایک ایسی طاقت سے مغلوب ہو جائیں جو ان باتوں میں ان پر فوقیت رکھتی تھی۔ عہد اکبری کے بعد ایک اور مہلک خرابی رونما ہوئی یعنی درباری اور امراء کی فضول خرچیاں، نمود و نمائش اور عیش کوشیاں۔ بنیادی طور پر تو اس کی وجہ فتوحات سلطنت کی وجہ سے دولت و ثروت کی فراوانی تھی لیکن اکبر ایک شاہانہ نظام قائم کرنے اور قائم رکھنے کے ساتھ طبیعت کا سادہ اور کفائت شعار تھا۔ جہانگیر کا مزاج دوسرا تھا اور نوجہاں تو نور علیٰ نور تھی۔ اس کے علاوہ فرنگستان سے آنے والے سامان زیب و نمائش نے خود نمائی کے نئے دروازے کھول دیے۔ ان سب عوامل کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل امرا نے نہایت اونچا معیار زندگی قائم رکھنا شروع کیا۔ دولت و ثروت کی نمائش اور اخراجات کی فراوانی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر قدم مارنے لگے۔ انجام کار وہی ہوا جو ہونا تھا یعنی فضول خرچی، تعیش کوشی اور اسے نباہنے کے لئے رعایا اور زیردستوں پر سختی، رشوت ستانی اور

Marfat.com

اخلاقی انحطاط۔

اس سلسلے میں عالمگیر نے صورتِ حال کو سدھارنے کی کوشش کی لیکن جو مزاج کئی پشتوں سے بگڑے ہوئے تھے وہ راہ راست پر نہ آسکے۔ عالمگیر کی آنکھیں بند ہوتے ہی حالات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے۔ اس کی وفات کے پانچ سال بعد اس کا پوتا معزالدین جہاں اورنگ نشین ہوا۔ جس نے لال کنور جاریہ کے ساتھ اس طرح رنگ رلیاں منائیں اور اس کے اقارب کو اتنے بڑے عہدے دے دیے کہ بادشاہت و امارت کا وقار ختم ہو گیا۔ فرخ سیر کے زمانے میں حالات ذرا سنبھلے لیکن یہ سنبھلنا عارضی تھا۔ اس کی وفات کے ایک سال بعد محمد شاہ تخت نشین ہوا جو تاریخ میں محمد شاہ رنگیلا کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے جہاں دارشاہ کے برابر بدعنوانیاں نہیں کیں اور اس کے عہد حکومت کے بعض روشن پہلو بھی ہیں، مثلاً اردو شاعری کی نشوونما اور شاہ ولی اللہ کی تحریک۔ اسبابِ زوال کے متعلق آخری شاہانِ دہلی کے ایک ممتاز عہدہ دار کا تجزیہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ جسے اردو کی ایک قدیم کتاب میں حکیم مومن خاں مومن کے ایک شاگرد نے درج کیا ہے جو اٹھارویں صدی کے طور طریقوں کی ایک دلآویز تصویر پیش کرتا ہے۔ "نتائج المعانی" میں آغا محمود بیگ راحت لکھتے ہیں:

> "ایک روز محمد شاہ اکبر ثانی کے دربار میں ذکر زوالِ سلطنت آ گیا۔ بخشی محمود خاں نے عرض کیا چار آدمیوں نے مملکت کو تباہ کر دیا، اول حکیموں نے فرمانروایانِ بیدار مغز کو وہ مقویات کھلائے کہ تاب تحمل نہ ہو سکی، مزاج عشرت طلب ہو گیا۔ دوسرے کلاونتوں نے، ان کے گھر میں جو نو خیز ہوئی اس کو پیش کیا اور اس میں اپنا افتخار پیدا کیا۔ سلاطین کو رقص و سرود پر مائل رکھا، ڈوم ڈھاری مدار المہام ہوئے، انتظام فرمانروائی میں خلل واقع ہوا، دشمنوں نے سر اٹھایا، بدخواہوں نے پر پھیلائے اور جا بجا خودسر ہو گئے، شرفاء کو دربار میں مداخلت نہ ہوئی، ان کی بات کسی نے نہ سنی، وقت پر ان لوگوں نے طرح دی، غنیم کی بن آئی۔ تیسرے کثرتِ عیال نے، ادھر ازواج کی کثرت ہوئی، ادھر اولادوں کی ترقی ہوئی، نزاع خانگی سے خلش ہوئی۔ چوتھے مشائخ و پیرزادوں نے، جب کبھی حاضر ہوئے اور کچھ ذکر سلطنت آیا، اپنے تئیں عرش پر پہنچایا، مسائل تصوف بیان کرنے لگے، کنج عزلت کی خوبیاں بیان کرنے لگے، خونِ بندگانِ خدا سے ڈرانے لگے، جب شیخ جی یہ شیخی بگھار چکے، پھر اپنی کرامت جتانے لگے، ہم دعا کرتے ہیں، دعاؤں کا لشکر حضور کی فتح و کامرانی کے لئے کافی ہے، دشمن ادھر منہ بھی نہیں کرے گا، خود پامالِ سمِ سمندان لشکر، دعا سے دولت و اقبال ہو گا۔ فرماں روا ان کے دام میں آ گئے، پیر جی کی دعاؤں پر تکیہ کیا، چار بالش عشرت پر تکیہ نشین ہوئے، اراکین گوشہ نشین ہوئے، غنیم نے قابو پایا، اقلیم پر زور لایا، دعا کی فوج آتی رہی، حکومت جاتی رہی۔"

سلطان عبد الحمید ثانی

(1293ھ تا 1327ھ بمطابق 1876ء تا 1909ء)

عبدالحمید ثانی نے تخت حاصل کرنے سے پہلے ممتاز ترکی لیڈر مدحت پاشا اور اس کی پارٹی کے ساتھ تین شرائط طے کی تھیں۔(1) قانونِ اساسی کا اعلان۔(2) امورِ سلطنت میں صرف ذمہ دار وزیروں سے مشورہ کرنا۔(3) ضیا بے اور کمال بے کو کاتب خاص (پرائیویٹ سیکرٹری) اور سعد اللہ بے کو باسکاتب (چیف سیکرٹری) مقرر کرنا۔لیکن عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد عبدالحمید نے آخری دو شرطوں کی مطلق پابندی نہیں کی اور پہلی شرط صرف نام کے لئے پوری کی۔پہلی تقرریوں سے ہی اس کی آئندہ پالیسی کا اندازہ ہو گیا۔اس نے اپنے داماد محمود جلال الدین پاشا کو مشیر برائے سلطانی اور انگلستان سے تعلیم حاصل کرنے والے انگلیز سعید پاشا کو رئیس یاور یہ (فرسٹ ایڈی کانگ) کے عہدے پر فائز کر دیا۔یہ دونوں حضرات مدحت پاشا کی جماعت کے خلاف تھے۔ان عہدوں کا تعلق قصر سلطان سے تھا۔اس لئے ان کا تقرر تمام تر سلطان کی ذاتی رائے پر منحصر تھا۔مگر باشکاتب (چیف سیکرٹری) کا معاملہ بالکل دوسرا تھا۔یہ عہدہ دار ہمیشہ سے سلطان کا دستِ راست ہوتا آیا تھا اور اسی کے ذریعے سلطان اور وزراء کے درمیان تمام مراسلت ہوا کرتی تھی۔چونکہ وہ ہر وقت سلطان کی خدمت میں حاضر باش رہتا تھا،اس لئے اس کی اہمیت بھی غیر معمولی تھی۔اس کا عہدہ صدر اعظم کے برابر سمجھا جاتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ مدحت پاشا نے شروع ہی میں یہ طے کر لیا تھا کہ اس جگہ پر سعد اللہ کو مقرر کرے گا لیکن سلطان نے بجائے سعد اللہ کے سعید بے کو جو محمود پاشا کا آدمی تھا،چیف سیکرٹری مقرر کر دیا۔مدحت پاشا نے تمام وزراء کی طرف سے اس فیصلے پر نظر ثانی کے لئے باصرار درخواست کی لیکن سلطان نے اپنا حکم تبدیل نہ کیا۔

مدحت پاشا کی صدارت

دسمبر 1876ء میں سلطان نے مدحت پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا۔مدحت پاشا کی زیر صدارت پہلی مجلس وزارت محمود پاشا کے مکان پر منعقد ہوئی۔مخالف پارٹی کے ممبروں کی نیت ظاہر ہو گئی۔جب قانونِ اساسی اور اس کے اعلان کا مسئلہ سامنے آیا تو جودت پاشا وزیر عدل نے جو محمود پاشا کی پارٹی سے خفیہ ساز باز رکھتا تھا،یہ تجویز پیش کی کہ نئے سلطان کی تخت نشینی کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔مدحت پاشا کو اس پر سخت غصہ آیا۔مدحت پاشا نے جواب دیا کہ مراد کو معزول کرنے اور عبدالحمید کو تخت پر لانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ دستورِ اساسی کا اعلان جلد سے جلد کر دیا جائے۔مدحت پاشا نے محمود جودت اور اس

کی پارٹی کے ممبروں کو صاف الفاظ میں متنبہ کر دیا کہ اگر اس بنیادی مسئلے کو طے کرنے میں کچھ بھی پس و پیش کیا گیا تو وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائے گا۔ مصلحت دیکھ کر مخالفین اس وقت خاموش ہو گئے۔

ملک میں دستور کے اعلان کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ اسی اثناء میں اخبار "استقلال" میں چند مضامین شائع ہوئے۔ جن میں دستور کی اشاعت کے متعلق سلطان کے خلوص نیت میں شبہ کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ مضامین قصر سلطانی میں سخت ناگواری کی نظر سے دیکھے گئے اور خیال کیا گیا کہ ان کا لکھنے والا ضیا بے کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔ چنانچہ سلطان نے اس کو قسطنطنیہ سے ہٹانے کا عزم کر لیا اور اسے بطور سفیر برلن بھیجنے کا حکم صادر کیا۔ اس حکم سے یہ غرض بھی تھی کہ اہل قسطنطنیہ ضیا بے کو آئندہ پارلیمنٹ میں ممبر منتخب نہ کر سکیں۔ اس کے بعد سلطان نے "استقلال" کی اشاعت بھی بند کر دی۔

دستورِ اساسی کا اعلان

بالآخر 23 دسمبر 1876ء کو دستورِ اساسی کا اعلان کر دیا گیا۔ باب عالی کے سامنے کھلے میدان میں ایک وسیع شہ نشین بنا کر اسے پھولوں سے خوب آراستہ کیا گیا۔ وہاں تمام اعیان حکومت، علماء اور وزراء جدید دستور کا اعلان سننے کے لئے جمع ہوئے۔ جس کی نسبت یہ توقع قائم کی گئی تھی کہ سلطنتِ عثمانیہ کے ایک نئے دور کا افتتاح کرے گا۔ سڑک پر دو رویہ فوجوں کی قطار تھی۔ فوجی بینڈ کی آواز پر مجمع کی نگاہیں ادھر اٹھیں۔ سعید پاشا پوری یونیفارم میں آتا ہوا دکھائی دیا اس نے سلطان کا خط ہمایوں جو صدرِ اعظم کے نام تھا اور جس کے ساتھ دستورِ اساسی کا مسودہ بھی تھا، لا کر مدحت پاشا کو دیا۔ خط ہمایوں اور دستور کا مسودہ حاضرین کو پڑھ کر سنایا گیا۔ اس وقت دستور کی ہزاروں چھپی ہوئی نقلیں حاضرین میں تقسیم کی گئیں۔ اس کے بعد مدحت پاشا نے تقریر کی جس میں سلطان کا شکریہ ادا کیا اور اس دستور کی اہمیت حاضرین کو سمجھائی۔ جب اس نے تقریر ختم کی تو مفتی ادرنہ نے دعا مانگی اور سب نے آمین کہی اور ایک سو ایک توپوں کی سلامی کے ذریعے قسطنطنیہ کے تمام باشندوں کو اطلاع دی گئی کہ دستورِ اساسی کا اعلان ہو گیا ہے۔

اس دستور کی رو سے ایک پارلیمنٹ قائم کی گئی جو دو ایوانوں پر مشتمل تھی۔ دارالاعیان اور دارالمبعوثین۔ دارالاعیان کے ممبروں کا انتخاب نامزدگی کے ذریعہ اور دارالمبعوثین کے ممبروں کا کثرتِ رائے سے ہونا قرار پایا۔ پارلیمنٹ کے ماتحت ایک کابینہ وزارت بھی قائم کی گئی۔ سلطان کی رعایا کو بلا امتیاز مذہب و ملت برابر حقوق دیے گئے اور حکومت کے عہدے سب کے لئے یکساں طور پر کھول دیے گئے۔ دستور میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا گیا کہ سلطنت کے تمام باشندوں کے لئے ایک مشترک قانون نافذ کیا جائے اور ان سب کا سرکاری نام خواہ وہ کسی قوم یا فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں، عثمانی قرار دیا گیا۔ اس کے علاوہ فرمان میں جلسوں اور پریس کی آزادی عدل و انصاف کے قیام اور جبری تعلیم کا بھی وعدہ کیا گیا۔

دستورِ اساسی کے اعلان پر ملک کے ہر طبقہ نے مسرت کا اظہار کیا۔ علماء، شیخ الاسلام خیر اللہ آفندی کی قیادت میں عیسائی پادری اپنے بطریقوں کے ساتھ شاکر آفندی جو قسطنطنیہ کے کبار علماء میں سے تھے، طلبہ کی جماعت لے کر اور دارالسلطنت کے عام باشندے جھنڈے لئے ہوئے جن پر آزادی کا لفظ منقوش تھا، مدحت پاشا کے مکان پر مبارکباد دینے کے لئے آئے۔

Marfat.com

شام کے وقت تمام مسجدوں میں چراغاں کیا گیا،لوگ مشعلیں لئے ہوئے سڑکوں پر گشت کرتے تھے اور"سلطان زندہ باد"اور مدحت پاشازندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔سلطنت کے تمام صوبوں سے مبارک باد کے تار آئے۔جن میں مسرت کا اظہار کیا گیا تھا۔دوسرے روز صبح کو مدحت پاشا یونانی اور آرمینی بطریقوں اور یہود کے بڑے ربی کے پاس گئے اور ان کی مبارکباد کا شکریہ ادا کیا اور انہیں ترغیب دی کہ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے ایک علم کے نیچے متحد ہو کر کام کریں۔بطریقوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا۔مدحت پاشا نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں کوئی فرق نہیں کرتے کیونکہ دونوں ایک ہی ملک کے باشندے ہیں۔

مدحت پاشا ایک عرصے سے اس دستورِ اساسی کے اعلان کے لئے کوشاں تھے،وہ سمجھتے تھے کہ سلطنت تیزی سے بربادی کی طرف جارہی ہے۔رشوت ستانی اور دوسری بے عنوانیاں جس حد تک پہنچ چکی ہیں اس سے پہلے کبھی نہیں پہنچی تھیں۔ سرکاری محکمے رقم سے بالکل خالی ہیں لیکن کروڑوں روپے قصرِ سلطانی میں پہنچ رہے ہیں۔گورنروں نے اپنے عہدے قصرِ سلطانی سے خریدے تھے۔وہ بے روک ٹوک صوبوں کے حالات برباد کر رہے تھے۔جب تک پورا نظام نہ بدلا جائے کوئی چیز سلطنت کو بچا نہیں سکتی۔مدحت پاشا کے نزدیک اس کا واحد حل یہ تھا کہ سلطان پر قابو حاصل کیا جائے۔اس طرح کہ وزراء کو ذمہ دار بنا کر بالخصوص مالیات میں ایک قومی مجلس عمومی کا جواب دہ بنا دیا جائے۔دوسرے یہ کہ اس مجلس کو حقیقی طور پر قومی بنایا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ مختلف طبقوں اور مذہبوں کے تمام امتیازات مٹا دیے جائیں اور عیسائیوں کو بالکل مسلمانوں کے مساوی حقوق دے دیے جائیں۔تیسرے یہ کہ مرکزیت توڑ کر مقامی حکومت قائم کر دی جائے اور گورنروں کو صوبہ جاتی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے۔یہ خیالات ایسے تھے جو کسی بھی سلطنت کو راہِ راست پر لا سکتے تھے۔

عجیب ستم ظریفی ہے کہ انہی اصولوں پر عمل کر کے مغربی ممالک اپنی ریاستوں کو مناسب طریقے سے چلا رہے تھے لیکن قانونِ اساسی کے اعلان سے برطانیہ کو سب سے زیادہ تکلیف پہنچی۔برطانیہ دوسری عیسائی قوموں کی طرح ملت اسلامیہ کو ہزیمت پہنچانے میں کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔لہٰذا اس کی مخالفت اس کے خبثِ باطن کا پتہ دے رہی تھی۔دستورِ اساسی پر عمل ہونے کے بعد برطانیہ کیا کسی بھی دوسرے ملک کے لئے خود یا اپنے گماشتوں کے ذریعہ دولتِ عثمانیہ کے معاملات میں دخل اندازی کرنا اور اسے نقصان پہنچانا خاصا مشکل ہو جاتا۔

قسطنطنیہ کانفرنس (میمنے اور بھیڑیے کے کھیل کی تیاری)

1876ء میں عیسائی دنیا کے قریباً تمام بڑے ممالک جنہیں ہم سہولت کے لئے دولِ عظمیٰ کا ایک نام دیں گے، قسطنطنیہ میں ایک کانفرنس میں شریک ہوئے۔اس شمولیت کا مقصد یہ تھا کہ ترکی جسے"مردِ بیمار"کے نام سے پکارا جارہا تھا سے اپنی مرضی کی شرائط منوا کر زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جاسکے۔ 23دسمبر 1876ء کو ادھر یہ کانفرنس اختتام پذیر ہو رہی تھی۔اسی دن دولتِ عثمانیہ نے اپنے دستورِ اساسی کا اعلان کیا تھا۔کانفرنس جس کی کارروائی گزشتہ ایک ماہ سے جاری تھی لیکن ترک مندوب کو نہیں بلایا گیا تھا۔ 23دسمبر 1876ء ہی کو ترک مندوب کارروائی کے لئے مجلس میں شریک ہوا اس نے اعلان کیا کہ اب اس کانفرنس کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ دولت عثمانیہ میں اساسی دستور کا اعلان ہو چکا ہے۔

Marfat.com

دستور سلطنتِ عثمانیہ کے ہر طبقہ اور مذہب کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ اس پر ساری کانفرنس پر سناٹا چھا گیا۔ بالآخر روسی مندوب گستانیف نے مہر سکوت توڑی اور تجویز پیش کی کہ کانفرنس کو اپنا کام شروع کرنا چاہیے۔ 23 دسمبر کے باضابطہ اجلاس میں وہ لائحہ عمل جو دولتِ علیہ کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا، طے کر لیا گیا تھا۔ اس غیر معمولی کارروائی کا مقصد بابِ عالی کو یہ یقین دلانا تھا کہ کانفرنس جو فیصلہ کرے گی وہ دول یورپ کا متفقہ فیصلہ ہوگا اور بابِ عالی کو یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ دول عظمیٰ کی رقابتوں سے کچھ فائدہ اٹھا سکے گا۔ چونکہ تمام معاملات حقیقتاً پہلے ہی طے کر لئے گئے تھے۔ اس لئے کانفرنس کے مطالبے کو سب سے پہلے روسی سفیر گستانیف نے زبان دی اور بلغاریہ کے لئے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کیا۔ ترک نمائندے نے اس کی کھل کر مخالفت کی اور کہا کہ اس کانفرنس میں اس مسئلے پر بحث کا کوئی جواز نہیں۔ روسی مندوب نے اپنے تقاضے کو دوسری شکل میں دہرایا اور مطالبہ کیا کہ بلغاریہ کو ایک خاص رعایتی گورنمنٹ دے دی جائے اور ایک بین الاقوامی کمیشن اس کی نگرانی کے لئے مقرر کر دیا جائے۔ ترک مندوب نے اس پر بھی اعتراض کیا اور کانفرنس کو یاد دلایا کہ سرویا اور رومانیہ کو بلغاریہ والے مطلوبہ انتظامات کے ساتھ حکومتیں دی گئی تھیں۔ رومانیہ اور سرویہ میں شرائط کے برعکس مسلمان باشندوں کو تنگ کیا گیا اور وہ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے اس حقیقت کے باوجود کہ ان دونوں ریاستوں کی ہر قسم کی شکایت کو دور کر دیا گیا۔ جب وقت آیا یہ دونوں ریاستیں سلطنتِ عثمانیہ کے دشمنوں کی صف میں شامل ہو گئیں۔ لہٰذا یہ عمل بلغاریہ کے لئے دہرایا نہیں جا سکتا۔

روسی مندوب ہر حال میں دولتِ عثمانیہ کے علاقوں میں مداخلت اور دسترس چاہتا تھا۔ چنانچہ اس مندوب نے آخری تجویز یہ دی کہ مقامی حکومت کی مدد کے لئے ایک قنصل کمیشن مقرر کر دیا جائے اور بلغاریہ، ہرزیگووینا اور بوسنیا کے صوبوں کے والی پہلے پانچ سال تک دولِ عظمیٰ کی منظوری سے مقرر کئے جائیں۔ ترک مندوب اس تجویز سے اتفاق نہ کر سکے۔ انہوں نے کہا کہ قنصل کمیشن کا تقرر قوم کے حقوقِ خاص میں رخنہ اندازی کا باعث ہوگا۔ جسے منظور کرنا ہی ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ اس کے لئے ایک عملی دشواری یہ بھی ہے کہ ان صوبوں کے لئے مخصوص انتظامات کر دینے سے سلطنت کے دوسرے حصوں میں بے اطمینانی پیدا ہو جائے گی اور غالب امکان ہے کہ بعض میں شورش رونما ہو جائے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جب سلطان کے اعلان کردہ دستورِ اساسی میں سلطنت کے ہر حصہ اور طبقہ کے حقوق اور حقوق کی پاسداری کا یقین دلا دیا گیا ہے۔ ایسے کسی انتظام کی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس کے بعد جنرل اگناتیف نے بڑی سخت تقریر کی اور کانفرنس ختم ہو گئی۔ مندوبین نے اتنی مروت کا اظہار بھی نہ کیا کہ ترک مندوب کی جوابی اور احتجاجی تقریر سن کر کانفرنس برخاست کرتے۔

مجلس عالیہ کا فیصلہ

بلغاریہ، ہرزیگووینا اور بوسنیا کے صوبوں کے والیوں کی تقرری بذریعہ دولِ عظمیٰ والی تجویز دولِ عظمیٰ کے نمائندوں نے ایک الٹی میٹم کی شکل میں بابِ عالی میں بھیجی اور یہ دھمکی دی کہ اگر ایک ہفتہ کے اندر اس کا جواب قابلِ اطمینان نہ آیا تو ہم قسطنطنیہ سے روانہ ہو جائیں گے۔ مدحت پاشا صدرِ اعظم نے سلطان عبدالحمید کے حکم سے ایک کانفرنس بلائی جس میں سلطنت کی تمام قوموں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ ہر ایک نمائندے نے پرجوش تقریریں کیں اور طے پایا کہ الٹی میٹم کو

مسترد کر دیا جائے۔ الٹی میٹم کا مسترد ہونا تو یقیناً تعجب انگیز اور حیران کن تھا لیکن اس سے بھی زیادہ حیران کن یہ بات تھی کہ تمام نمائندوں نے بھرپور اتفاق اور یکجہتی کا اظہار کیا۔ عیسائی، یہودی، آرمینی اور مسلمان سلطنت علیہ کی حفاظت اور دفاع اور استقلال کے لئے ایک ہی صف میں کھڑے نظر آئے۔ چنانچہ باب عالی نے مجلس کے اس فیصلے کی اطلاع دولِ عظمیٰ کے نمائندوں کو دے دی اور وہ 20 جنوری 1877ء کو قسطنطنیہ سے روانہ ہو گئے اور کانفرنس مکمل طور پر برخاست ہو گئی۔

روس سے جنگ

روس ایک عرصہ سے دولتِ عثمانیہ کے ممالک محروسہ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے کے لئے تیاری کر رہا تھا۔ 16 اپریل 1877ء کو اس نے رومانیہ سے معاہدہ کیا کہ وہ اس کی آزادی اور خود مختاری کو تسلیم کرے گا لیکن سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کے لئے اسے روسی فوجوں کو اپنے علاقے سے گزارنے کی اجازت دینا ہو گی، جسے رومانیہ نے منظور کر لیا۔ چنانچہ 24 اپریل 1877ء کو روس نے دولت عثمانیہ کے خلاف باقاعدہ اعلانِ جنگ کر کے اپنی فوجوں کو عثمانی سرحدوں کو عبور کرنے کا حکم دے دیا۔ پانچ روز بعد مونٹی نیگرو کی حکومت نے بھی سلطنت عثمانیہ کے ساتھ معاہدہ صلح توڑ کر اعلان جنگ کر دیا۔ اگلے دو ماہ میں روس نے آسٹریا کو غیر جانبدار رکھنے کے لئے بوسنیا اور ہرزیگووینا کے علاقوں پر قبضہ کا لالچ دیا اور 8 جون 1877ء کو روس نے انگلستان کو بھی غیر جانبدار رکھنے کے لئے ایک تو یہ وعدہ کیا کہ روس قسطنطنیہ پر حملہ کر کے انگلستان کے مفادات کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ دوسرے انگلستان جب مصر اور سویز میں مداخلت کرے گا، روس چپ سادھ لے گا۔

بحراسود پر چونکہ ترکی بیڑا قابض تھا اس لئے روس کے حملے کے لئے رومانیہ سے گزرنا ضروری تھا۔ رومانیہ کے حکمران شہزادہ چارلس اور وزیراعظم نے ملکی پارلیمنٹ پر دباؤ ڈال کر اپنی افواج بھی روس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کروا لیا لیکن روسی جنرل گورچاکوف نے اس تعاون کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ باب عالی نے رومانیہ کا یہ طرزعمل دیکھ کر جو دولتِ علیہ کی باجگزار ریاست تھی، رومانیہ کے شہر کلفات پر گولہ باری کا حکم دیا۔ رومانیہ نے اس کے بعد اپنی آزادی اور خودمختاری کا اعلان کر کے سلطنت عثمانیہ کے خلاف باضابطہ اعلانِ جنگ کر دیا۔

اب رومانیہ میدانِ جنگ بن گیا اور روسی جنرل گورچاکوف رومانیہ اور بلقان کو طے کرتا ہوا روشکہ پر حملہ آور ہو کر اس پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد ادرنہ اور قسطنطنیہ پر حملے کے لئے روس کا رستہ قریباً صاف ہو گیا تھا۔ اس نازک موقعہ پر سلطان نے فرانسیسی نومسلم محمد علی کو جو کریٹ کا گورنر جنرل تھا، عثمانی فوج کا سپہ سالارِ اعظم بنا کر محاذ پر بھیج دیا۔ محمد علی اور اس کے ساتھی جرنیلوں نے روس کو ہر محاذ پر شکست و ہزیمت سے دوچار کر کے جنگ کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ یوں لگ رہا تھا اب سلطنت عثمانیہ نہیں بلکہ روس کی سلطنت موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو چکی ہے۔ روسی ہر محاذ پر ہزاروں لاشیں چھوڑ کر پسپا ہوتے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ پلونا کا چھوٹا سا شہر روسی فوج کے لئے لوہے کا چنا بن کر رہ گیا جسے وہ دریائے ڈینیوب پار کرنے کے بعد ایک تر نوالہ سمجھ رہے تھے۔ یہ شہر بلغاریہ کی سرحد میں واقع تھا۔

پلونا کے محاذ پر مسلسل ناکامیوں کے بعد گرینڈ ڈیوک نکولس روس کے ستر ہزار سورمالے کر پلونا کے محاذ پر حملہ آور ہوا لیکن

Marfat.com

ترکوں نے اس حملے کو اس طرح پسپا کیا کہ نکولس کو سولہ ہزار مقتول اور بے شمار زخمی میدانِ جنگ میں چھوڑنے پڑے۔ اس سے تہلکہ انگیز وہ خبر تھی جو ایشیا سے وصول ہوئی، جہاں مختار پاشا نے روسی حملہ آوروں کو جو سلیکاف کے زیرِ کمان تھے سرحد پار بھگا کر غازی کا لقب اختیار کر لیا تھا۔

پے در پے تین حملوں میں ہزیمت اٹھانے کے بعد روسیوں کو اندازہ ہو گیا کہ پلونا کو فتح کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ شہر کا سختی سے محاصرہ کر لیا جائے۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور روسیوں نے پانچ ماہ تک شہر پلونا کا محاصرہ جاری رکھا۔ اس دوران شہر میں مقیم عثمان پاشا کے بتیس ہزار قافلہ کش سپاہیوں کا سامانِ رسد ختم ہو گیا اور روسیوں کی ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے سامنے 10 دسمبر 1877 کو ہتھیار ڈال دینے پڑے لیکن ہتھیار ڈالنے تک عثمان پاشا کی فوج معرکہ آرائی سے نہیں گھبرائی، یہی ترک فوج کا شیوہ تھا۔

سقوطِ ادرنہ

پلونا کی شکست کے بعد ایشیا میں بھی ترکوں کو کئی شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ روس کی طرح کئی چھوٹے ممالک بھی اپنی لوٹ مار کا حصہ لے دوڑے۔ پلونا کی تسخیر کے بعد جنرل گورکو روسی فوج کے بڑے حصے کو لے کر صوفیا کی طرف بڑھا اور 5 جنوری کو اس پر قبضہ کر لیا۔ 29 جنوری کو گرانڈ ڈیوک نکولس روسی افواج کا سالارِ اعظم فاتحانہ شان سے ادرنہ میں داخل ہو گیا۔

سقوطِ ادرنہ کے بعد روس اور دولتِ عثمانیہ میں جنگ بند ہو گئی۔ ادرنہ کے مقام پر روس اور دولتِ عثمانیہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، جس کی رو سے روس نے تمام وہ یورپی ممالک جو کل تک دولتِ عثمانیہ کے ممالک محروسہ تھے، بزورِ شمشیر دولتِ عثمانیہ سے علیحدہ کر لئے اور انہیں اپنی مرضی سے اپنے اور دوسرے چھوٹے یورپی ممالک کے درمیان تقسیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ سلطنتِ عثمانیہ کی اس چیر پھاڑ کے علاوہ دولتِ عثمانیہ پر ایک کروڑ بیس لاکھ پونڈ تاوان جنگ بھی عائد کر دیا اور ساتھ ہی طے پایا کہ سواحل ڈینیوب کے سارے قلعے منہدم کر دیے جائیں گے۔

اس معاہدہ ادرنہ کو انگلستان، آسٹریا اور کئی دوسرے ممالک نے سخت ناپسند کیا۔ بالخصوص انگلستان کو شدت سے اس احساس نے آ گھیرا کہ اب جبکہ حکومت عثمانیہ کی فوجی طاقت ٹوٹ چکی ہے، ادرنہ کے بعد روس کے لئے قسطنطنیہ کو فتح کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ قسطنطنیہ کی فتح گویا علاقے سے انگلستان کے مفادات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ انگلستان نے اپنے جہازوں کو آبنائے باسفورس پہنچنے کا حکم دے دیا اور پارلیمنٹ سے 60 لاکھ پونڈ روس کے ساتھ جنگ کے لئے منظور بھی کرا لئے۔ قریب تھا کہ دونوں بڑی طاقتیں میدانِ کارزار گرم کر دیں، جرمنی کے چانسلر بسمارک نے ایک "ایماندار دلال" کا کردار کرنے کے لئے اپنی سربراہی میں برلن میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں فریقین کو معاملات کو از سرِ نو زیرِ غور لانے کے لئے کہا تھا۔ تاکہ دولتِ عثمانیہ کو توڑنے کے بعد یورپ کا امن بھی بحال رہ سکے۔

برلن کانفرنس

برلن کانفرنس کی کاروائی کی تفصیلات طویل ہیں۔ مختصراً بیان کیا جائے تو کہا جائے گا کہ دولِ عظمیٰ کے ممالک جنہیں

Marfat.com

خونخوار ڈاکوؤں کا جتھہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، نے دولتِ عثمانیہ سے چھینے ہوئے علاقہ کو ذرا نئے طریقے سے چیر پھاڑ کر آپس میں تقسیم کرلیا جائے۔ اس تقسیم میں ہر ایک ڈاکو کے حصہ کا خیال رکھا گیا۔ اس کانفرنس میں برطانیہ اور بابِ عالی کا خفیہ معاہدہ بھی زیرِ بحث آیا۔

یہ معاہدہ 4 جون کو حکومت برطانیہ اور بابِ عالی کے درمیان طے ہوا تھا۔ اس معاہدے کی رو سے برطانیہ نے آرمینیوں کے تحفظ کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور اصلاحات کے وعدہ کے معاوضہ میں جو سلطان نے کیا تھا، دولتِ عثمانیہ کے ایشیائی مقبوضات کو روس کے آئندہ حملوں سے محفوظ رکھنے کا عہد کیا۔ جزیرہ قبرص اس وقت تک برطانیہ کے حوالے کر دیا گیا جب تک روس گزشتہ جنگ کی ایشیائی فتوحات سے اپنا قبضہ نہ اٹھالے۔ یہ جزیرہ برطانیہ کو اس غرض سے دیا گیا تھا کہ وہ روس کے مقابلہ کے لئے وہاں سامانِ جنگ تیار رکھ سکے۔ سلطان کی فرماں روائی کا حق قائم رکھنے کے لئے سالانہ خراج کی ادائیگی ضروری قرار دی گئی۔ برطانیہ اور بابِ عالی کے درمیان یہ وہی معاہدہ ہے جو منظرِ عام پر آیا تو فرانس نے بڑا واویلا مچایا۔ جس پر برطانیہ اور فرانس کے درمیان طے ہوگیا کہ فرانس جب الجزائر اور تیونس پر حملہ کرے گا تو برطانیہ تعرض نہیں کرے گا۔

معاہدہ برلن نے یورپ میں سلطنتِ عثمانیہ کا قریباً خاتمہ کر دیا۔ عثمانی صوبوں کی بجائے یونان، رومانیہ، سرویا، مونٹی نیگرو اور بلغاریہ کی خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں جن کا تعلق بابِ عالی کے ساتھ صرف خراج کی حد تک رہ گیا۔ جو صوبے براہ راست بابِ عالی کے زیرِ حکومت رہ گئے ان میں بھی آزادی کی تحریک پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ 1878ء کے بعد سلطان عبدالحمید کے آخر عہدِ حکومت تک کسی بیرونی سلطنت سے جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ دولتِ علیہ کو مختلف صوبوں کے اندرونی ہنگاموں اور بغاوتوں کو فرو کرنے میں مسلسل مصروف رہنا پڑا۔ علاوہ بریں مذکورہ بالا خود مختار حکومتوں اور مملکتوں کی طرف سے کوئی نہ کوئی نزاع برابر جاری رہا اور دولِ عظمیٰ کے کسی نہ کسی رکن نے انہیں مدد پہنچا کر دولتِ عثمانیہ کی شکست و ریخت میں حتی الامکان کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

عہد نامہ برلن میں اس بات پر خصوصیت سے زور دیا گیا تھا کہ دولتِ علیہ کے حقوقِ فرمانروائی غیروں کی دست برد سے محفوظ رکھے جائیں گے۔ مداخلت کے لئے کسی حیلہ کا ہاتھ آجانا بہت آسان تھا۔ عیسائی رعایا کے حقوق کی حفاظت کے عذر کے ساتھ مغربی حکومتوں نے ان صوبوں کو آزاد کرانے میں ہر طرح کوشش کی، جن میں عیسائی آبادی مسلمانوں سے زیادہ تھی۔ دولتِ عثمانیہ کے جس صوبے نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ اسے یورپ کی کسی نہ کسی حکومت کی حمایت ضرور حاصل تھی۔ مشرقی رومیلیا نے جب بلغاریہ سے اتحاد کا مطالبہ پیش کیا تو انہی حکومتوں نے جن کی طرف سے برلن میں اس اتحاد کی شدید مخالفت کی تھی۔ سلطان پر دباؤ ڈال کر اس مطالبہ کو منظور کرایا اور پھر چند سالوں کے بعد وہی حکومتیں ایک دوسرے صوبے کی آزادی کی طرف چل پڑیں۔

ہم وسیع و عریض دولتِ عثمانیہ کی طرح پھیلی ہوئی تاریخی تفصیلات کو بالاختصار سامنے لائے ہیں تاکہ کم از کم مغربی دنیا کے سیاسی ڈاکوؤں کے جتھوں کی کارروائی کی تصویر پیش کی جاسکے۔ یہ تفصیل صرف یورپی ممالک محروسہ تک محدود تھی۔ اب ہم

Marfat.com

کچھ تفصیلات طرابلس، الجزائر، تیونس اور مصر کے متعلق بیان کریں گے کہ کس طرح مغربی مقامروں نے ان ممالک کو غلام بنا کران کی جغرافیائی اور نظریاتی حدود کو یہاں تک پامال کیا کہ قریباً سو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود مغربی طاقتوں کا پیدا کیا ہوا ہمہ جہتی اضطراب ان اسلامی مملکتوں کو کسی پل چین نہیں لینے دے رہا۔

دولِ عظمیٰ کے ممالک نے ایک نئی سوچ کو جنم دیا۔ پہلے صرف عیسائی اکثریت والے ممالک سے بغاوتیں کرواتے تھے اور قصر یلدیز (قصر سلطانی) پر دباؤ ڈال کر انہیں دولتِ عثمانیہ سے علیحدہ کر دیتے۔ اب انہوں نے محسوس کیا کہ مسلم اکثریت والے ممالک پر براہ راست قبضہ بھی کر لیا جائے تو حکومت علیہ میں اتنی سکت نہیں کہ وہ مزاحمت کر سکے۔ چنانچہ اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے الجزائر اور تونس کو اپنا غلام بنالیا اور برطانیہ نے مصر پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ ان استعماری ملکوں نے ان اسلامی ممالک پر قبضہ جمانے کے لئے مقامی آبادیوں کے ساتھ کیا کیا مظالم ڈھائے۔ کس طرح شہروں کو آبادیوں سمیت جلا دیا۔ یہ سب کچھ ان اسلامی ممالک کی تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

سلطنت عثمانیہ کا نشیب کی انتہا تک پہنچ جانا اور اس نشیب کو ہمیشہ کے لئے اپنا مسکن بنالینا جس شخص کی سربراہی میں یہ سب کچھ ہوا، اسی کا نام ہی عبدالحمید ثانی ہے۔ سلطنت کا بیرونی محاذ تو وہ برباد کر ہی چکا تھا۔ اندرونی محاذ پر بھی اپنی انا پرستی کی وجہ سے اس نے دولتِ عثمانیہ کا سب کچھ برباد کر کے رکھ دیا۔

سلطان عبدالحمید ثانی کا استبداد

سلطان عبدالحمید عوام کو ہر حال میں دبا کر رکھنے والا مطلق العنان بادشاہ تھا۔ 1876ء میں جب اسے تخت پر بٹھایا گیا تو اہم ترین شرط جسے اس نے مانا اور منظور کیا وہ دستورِ اساسی کا اعلان تھا۔ مدحت پاشا اور اس کی رفاہ پارٹی کی کوشش کے باوجود جس دستورِ اساس کا اعلان سلطان عبدالعزیز کے دور میں نہ ہو سکا مدحت پاشا کے نزدیک اس کا اعلان اور نفاذ کر دیا۔ یہ دستور جہاں حکومت اور معاشرے کو قاعدے قوائد کا پابند بناتا تھا۔ وہیں یہ بیرونی مداخلت کا راستہ روکنے کے ساتھ سلطان کی طاقت کو بھی مکمل طور پر دولتِ عثمانیہ کی خدمت کی راہ دکھاتا تھا۔

سلطان نے بظاہر مغربی طاقتوں اور مدحت پاشا کو مطمئن کرنے کے لئے دستورِ اساسی نافذ کر دیا تھا اور اس پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا تھا لیکن دولِ عظمیٰ کے ممالک کی کانفرنس جونہی قسطنطنیہ میں ختم ہوئی اور مندوبین اپنے اپنے ممالک کو کوچ کر گئے، سلطان نے عثمانی پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا اور دستور کے اصلی محرک مدحت پاشا کو جلاوطن کر دیا۔ مدحت پاشا تو جلاوطن ہو گئے لیکن ان کے پیدا کردہ خیالات کا تموج اور تحرک کسی طرح بھی غیر مؤثر نہ کیا جا سکا۔ چنانچہ الطاف خسروانہ کا یقین دلا کر انہیں واپس بلالیا گیا اور تھوڑے عرصہ کے لئے شام اور اس کے بعد سمرنا کی ولایت پر مامور کرنے کے بعد سلطان عبدالعزیز کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے عدالت کے حوالے کر دیا گیا۔ عدالت نے صرف نظر فریب انکواری کی اور مدحت پاشا کو موت کی سزا سنادی۔ جسے سلطان نے عمر قید میں تبدیل کر کے مدحت پاشا کو طائف کی جیل میں بھیج دیا۔ یہ بھی سلطان کی طرف سے ایک دھوکا تھا کیونکہ دس ماہ کے بعد اسی جیل میں اور قیدیوں کے ساتھ مدحت پاشا کو بھی پھانسی

دے دی گئی۔ اس طرح عوام کو آزادی دلانے والا ہیرو سب سے پہلے عبدالحمید کے استبداد کا نشانہ بن گیا۔ مدحت پاشا آخری صدرِ اعظم تھا جسے موت کی سزا دی گئی تھی۔

سلطان عبدالحمید کو اپنے خلاف سازشوں کا خوف ہمیشہ دامن گیر رہتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اس کی مسلم رعایا جاہل رہے اور آنکھ بند کر کے بادشاہ کی اطاعت میں مگن رہے۔ اس ظالمانہ خواہش کی تکمیل کے لئے اس نے مندرجہ ذیل اقدام کئے:

1- مغربی تعلیم اور چند مستثنیات کے ساتھ مغربی ممالک کے اسفار پر پابندی عائد کر دی۔ حتیٰ کہ اندرونِ ملک بھی نقل و حرکت کو شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

2- مدحت پاشا اور اس کے پیرووں کی تصنیفات پر پابندی لگا دی گئی۔ ان کتابوں کا ایک صفحہ بھی جس کے پاس مل جاتا اسے سخت سزا سے گزارا جاتا۔

3- آزادی، دستور، حب وطن اور اس قسم کے الفاظ لغت کی کتابوں سے نکال دیے گئے۔

4- سلطان عبدالحمید کے خیال میں ٹائپ رائٹر اور ٹیلی فون اس کے خلاف سازش میں استعمال کئے جا سکتے تھے، لہٰذا ان چیزوں کی درآمد ممنوع قرار دے دی گئی۔

5- پریس کی آزادی مفلوج ہی نہیں ختم کر دی گئی اور باہر سے جو چیزیں بھی چھپ کر ترکی میں آتیں، ان پر نہایت سخت نظر رکھی جاتی۔ اگر کسی شخص کے پاس ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) کی کوئی تصنیف پائی جاتی اسے گرفتار کر لیا جاتا۔ تھیٹر میں شیکسپیئر کا ڈرامہ "ہملٹ" دکھانے کی بالکل اجازت نہ تھی کیونکہ اس میں ایک بادشاہ کو قتل کئے جانے کا سین دکھایا گیا ہے۔

فوج کی تعلیم

یورپ کے اثر سے سلطان عبدالحمید فوج کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ وہ جانتا تھا کہ سلطنت کی بقا اس بات پر منحصر ہے کہ فوج کی تربیت اور تنظیم یورپ کے جدید اصولوں کے مطابق کی جائے۔ اس لئے مجبوراً اسے فوجی مدرسے قائم کرنے پڑے۔ جہاں یورپ کے ماہرین حرب ترک نوجوانوں کو تعلیم دیتے تھے۔ ہزاروں فوجی افسران ان مدرسوں سے تعلیم حاصل کر کے نکلے اور اپنے ساتھ یورپ کے فوجی اصولوں کے علاوہ سیاسی خیالات بھی لائے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے سلطان نے بہت سے فوجی افسروں کو جرمنی اور دوسرے مغربی ممالک میں بھی روانہ کیا۔ یہ افسر جب واپس آئے تو ایک بنیادی انقلاب کی ضرورت کا احساس لے کر آئے۔ عبدالحمید ان جدید تعلیم یافتہ افسروں سے مطمئن نہیں تھا بلکہ انہیں اپنے لئے خطرناک سمجھتا تھا۔ اس لئے انہیں قسطنطنیہ میں نہیں رکھنا چاہتا تھا، بلکہ سلطنت کے مختلف صوبوں اور دور دراز مقامات میں بھیج دیتا تھا تاکہ ان کے خیالات سے دارالسلطنت متاثر نہ ہونے پائے۔

جاسوسی کا نظام

خیالات اور سوچ کی آزادی کی روک تھام کے لئے عبدالحمید نے ایک زبردست محکمہ قائم کیا تھا۔ جس کی سرگرمیاں

ترکوں کا گلا گھونٹ رہی تھیں۔ کوئی گھر جاسوسوں کی دست برد سے محفوظ نہ تھا۔ ممنوع الاشاعت لٹریچر کی تلاش میں پولیس اکثر تعلیم یافتہ ترکوں کے مکانات میں بے تامل داخل ہو جایا کرتی تھی۔ خاص اجازت کے بغیر کوئی جلسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس میں اتنی سختی برتی جاتی تھی کہ تین چار دوستوں کا کسی قہوہ خانے میں بیٹھ کر بات کرنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ کوئی ترک اپنے گھر میں بھی اپنے احباب کی ضیافت نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک حکامِ بالا سے اجازت نہ حاصل کر لے اور اجازت کے بعد بھی اکثر کوئی پولیس کا سپاہی اس کے ہاں بھیج دیا جاتا تھا کہ مہمانوں کی گفتگو سنتا رہے اور اندازہ کرے کہ دعوت کسی سازش کے سلسلہ میں تو نہیں ہے۔ یہ ناخواندہ مہمان صحبت یاراں کا سارا لطف خاک میں ملا دیتا۔

جو لوگ اپنی خاندانی وجاہت، روشن خیالی، حب الوطنی یا شرافتِ نفس کی وجہ سے ممتاز تھے ان پر خاص طور پر نظر رکھی جاتی تھی۔ جاسوسی کی شدت نے ان کی زندگی دوبھر کر رکھی تھی۔ جاسوسی کا نظام اتنا وسیع تھا کہ اس پر اوسطاً بیس لاکھ پونڈ سالانہ خرچ ہوتا تھا۔ کوئی طبقہ، کوئی گھر، کوئی مقام، جاسوسوں کی زد سے باہر نہ تھا۔ غضب یہ تھا کہ خود وزراء ایک دوسرے کی جاسوسی کرتے تھے۔ ملازمین اپنے آقا کے جاسوس تھے۔ بعض اوقات اپنے اعزہ اور رشتہ دار جاسوسی کرتے تھے۔ خاندان، فوج، بحریہ کوئی بھی اس کے مہلک اثرات سے محفوظ نہ تھا۔ اجتماعی زندگی کا سارا اعتماد جاتا رہا تھا۔ کوئی کسی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ ہر شخص دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ تمام فضا خوف اور بے اعتمادی سے بھری ہوئی تھی۔ طرہ یہ تھا کہ خود ان جاسوسوں پر بھی جاسوس مقرر کیے گئے تھے۔

عبدالحمید کے جاسوس یورپ کے ہر پایہ تخت میں موجود تھے۔ جاسوسوں کی یہ زبردست فوج جو سلطنت کے چپہ چپہ پر پھیلی ہوئی تھی، اپنی رپورٹیں سلطان کے پاس بھیجتی رہتی تھی اور ان رپورٹوں کی بنیاد پر ہزاروں انسانوں کو قید، جلاوطنی اور قتل کی سزا ملتی تھی۔ جاسوس جن لوگوں کو نامزد کر دیتے تھے، انہیں اکثر بغیر اس کے کہ عدالت میں صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جائے، سزا دے دی جاتی تھی۔ ملک کے بعض بہترین افراد اپنے گھروں سے دفعتاً غائب ہو گئے اور پتہ نہ چلا کہ کہاں گئے۔ یہ لوگ قصر سلطانی میں بلا لیے جاتے تھے اور وہاں خاموشی کے ساتھ قتل کر کے آبنائے باسفورس میں ڈال دیے جاتے تھے باسفورس کی مچھلیاں قصر سلطانی کے ان الوانِ نعمت کی منتظر رہا کرتی تھیں۔ جلاوطنی اور قید کی سزا تو معمولی جرائم کے لیے مقرر تھی۔ مثلاً بابِ عالی کے طرزِ حکومت سے اختلاف کا اظہار یا کسی آزاد خیال غیر ملکی اخبار کا اپنے پاس رکھنا۔ لوگ بابِ عالی میں بلائے جاتے تھے اور انہیں اپنے دوستوں اور عزیزوں کے خلاف بیان دینے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ دستوری حکومت کے اعلان کے بعد قریباً ستر ہزار آدمی جو سلطنت کے دور دراز مقامات مثلاً طرابلس اور یمن اور غیر ممالک میں جلاوطن کر دیے گئے تھے، ترکی میں واپس آئے جو قتل کر دیے گئے تھے یا جو قید کی حالت میں مر گئے ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔

اس نظام کی زد تقریباً عام ترکوں اور خصوصاً تعلیم یافتہ ترکوں پر تھی۔ کیونکہ عبدالحمید کو ہمیشہ انہی کی طرف سے خطرہ تھا۔ عیسائی رعایا اور دوسرے مسلمان نسبتاً آزاد تھے۔ عیسائیوں کو ایک بڑی آزادی یہ بھی حاصل تھی کہ سابق معاہدوں کی بنا پر حکومت ان کے تعلیمی نظام میں مداخلت نہیں کر سکتی تھی۔ برخلاف اس کے ترکوں کے مدارس کی نگرانی نہایت سختی سے ہوتی تھی۔ عبدالحمید نے اپنی رعایا میں سے ترکوں کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو اپنا حامی بنانے کی کوشش کی۔ اس میں وہ

کامیاب رہا۔اس نے کرد،عرب اور البانی رئیسوں پر لطف و کرم کا مینہ برسا دیا اور انہیں اپنے مقربین میں داخل کر لیا۔ تنظیمات میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ترکی زبان میں تھا اور دوسرے مسلمانوں پر ان خیالات کا اثر نہیں ہوا تھا۔اس لئے ان پر اس دور استبداد میں اتنی سختیاں نہیں تھیں جتنی ترکوں پر کی گئیں اور ابھی ان میں اس بات کو سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں تھی کہ یہ مرحمت خسروانہ محض رشوت ہے جو انہیں اس لئے دی جاتی تھی کہ وہ ترقی نہ کر سکیں اور انہیں نئے خیالات کی ہوا نہ لگے۔

حکومت کے خلاف عام بیزاری

دولت عثمانیہ کی سادہ لوح رعایا سلطان کو بادشاہ ہی نہیں مذہبی پیشوا بھی مانتی تھی۔اس کا ہر حکم عوام سر آنکھوں پر لیتے اور بلا چون و چراں اس کی تعمیل اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔عوام میں ایسے فرمانبردار لوگ عموماً سلطنت کے غریب کسان تھے جو سارا سال محنت کر کے جو جمع پونجی اکٹھی کرتے ٹیکس اکٹھا کرنے والے عمال آتے اور ان کا سب کچھ لوٹ کر لے جاتے۔حکومت کی طرف سے ٹیکسوں کا ریٹ زیادہ نہ تھا لیکن حکومت کے کارندے اپنی تعدی اور جور سے اتنا کچھ وصول کر لیتے کہ کسانوں کو ہمیشہ بدحالی اور غربت ہی کا سامنا رہتا۔امراء عام حالات میں تھوڑی سی رشوت دے کر ٹیکس سے بچ نکلتے تھے۔ عام کسان اور رعایا یہ یقین کرنے پر مجبور تھے کہ جو کچھ ان سے وصول کیا جاتا ہے وہ ان پر خرچ نہیں کیا جاتا۔باب عالی نے کئی شعبے کھول رکھے تھے جن کا بظاہر مقصد عوام کی خدمت تھا۔ایک شعبہ نظارات نافعہ(پبلک ورکس) تھا۔جس کے سپرد سڑکوں اور نہروں کی تعمیر تھی لیکن یہ چیزیں بہت کم تعمیر ہوتی تھیں۔حالانکہ ان کے لئے ٹیکس ہر سال وصول کیا جاتا تھا۔ایک وزارت پولیس کی تھی لیکن جان و مال کے تحفظ کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔وزارت عدل بھی تھی لیکن عدل و انصاف نہ تھا اور وزارت حرب کے باوجود فوجیں بھوکوں مر رہی تھیں۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کسان اور مزدور سلطان کے نہایت عقیدت مند تھے اور انہی لوگوں کے بیٹے اور بھائی فوج کی اصل قوت تھے۔اگر حکومت کے وزراء ان طبقوں کا کچھ بھی خیال کرتے تو ان میں نہ ہی بیزاری نفوذ کرتی اور نہ وہ بغاوت کرتے فوج کے خاص دستے جو عموماً البانوی ہوتے تھے وہ بادشاہ کی خدمت اور حفاظت کے لئے قسطنطنیہ میں رہتے تھے اور وہ براہ راست سلطان کی نگرانی اور محافظت میں رہتے۔لہٰذا ان کی حالت فوج میں سب سے اچھی تھی۔باقی فوج سلطان کے مقربین کی نگرانی میں تھی۔یہ مقربین عام سپاہیوں کیا افسروں کا بھی ضروری خیال اور احساس نہیں کرتے تھے۔ عبدالحمید سے پہلے دستور تھا کہ فوجیوں کو چار سال کی نوکری کے بعد گھر بھیج دیا جاتا تھا اور معین وقفوں کے بعد انہیں تربیت کے لئے دوبارہ بلایا جاتا تھا۔سلطان کے وقت یہ طریقہ بدل دیا گیا اور فوجیوں کو لمبے عرصے تک فوج میں روک لیا جاتا۔اگر عرصے بعد گھر جانے کی اجازت ملتی تو انہیں دفعتاً بلا لیا جاتا اور تربیت کے بعد انہیں سلطنت کے دور دراز علاقوں میں بھیج دیا جاتا اور اس پر طرہ یہ کہ ان کی تنخواہیں ہمیشہ بقایا میں رہتیں۔محاذ جنگ پر بھی ہوتے تو رسد کا انتظام بڑا ہی ناقص تھا۔فوجیوں کی وردیاں پھٹ کر چیتھڑے ہو جاتیں،مقامی طور پر جو لباس انہیں ملتا پہن کر اپنے تن ڈھانپتے اور اسلحہ کی کمی کا معاملہ علیحدہ سنگین ہو چکا تھا۔

جنگ کا سارا بوجھ مسلمان رعایا پر تھا۔غیر مسلم اس سے مستثنیٰ تھے لیکن وہ طبقہ جو سارے جنگی محاذوں کی حفاظت کا ذمہ دار تھا

Marfat.com

ان کے افسروں کی حالت بھی ایسی تھی کہ وہ اپنی تنخواہ میں ایک باعزت زندگی گزارنے کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ جہاں افسروں کی یہ حالت تھی وہاں عام سپاہی محاذوں پر ڈٹے ہونے کے باوجود کئی دفعہ فاقوں کا شکار ہو جاتے تھے۔ یہ سارے عوامل مل کر بے چینی کی چنگاریوں کو ہوا دے کر بغاوت کے شعلوں میں تبدیل کر رہے تھے۔

سلطان کے دور میں پڑھے لکھے لوگوں کا آپس میں ملنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ سلطان کے جاسوس بھوکے کتوں کی طرح ان کے پیچھے لگے ہوتے تھے۔ چنانچہ پڑھے لکھے لوگ اپنی زندگی کی بے لطفی کو زائل کرنے کے لئے اپنے آپ کو فلسفہ، تاریخ، قانون اور دوسرے مضامین کی کتابوں میں منہمک رکھتے تھے۔ یہ کتابیں پوشیدہ طور پر ترکی میں لائی جاتی تھیں یا انہیں سلطان کے ہاتھوں بیرونی ممالک میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ترک اپنے ذرائع سے اپنے احباب تک پہنچاتے تھے۔ چنانچہ عوام کے بااثر طبقہ کی جلاوطنی بھی سلطان کے خلاف بیزاری کا زہر گھول رہی تھی۔ سلطان پڑھے لکھے لوگوں کو یا تو ان کے گھروں سے دور جلاوطن کر دیتا یا بیرونِ ملک بھیج دیتا تھا۔ مقامی طور پر جلاوطن لوگ سلطنت کے جس حصہ میں بھی جاتے اپنے خیالات کا پرچار کرتے اور ایک نئے دور کی نوید سناتے۔ بیرونِ وطن جلاوطن بھی اسی کوشش میں رہتے کہ وہ اپنے خیالات و احساسات ترکی میں اپنی دوستوں تک پہنچاتے رہیں۔ غرض یہ وہ حالات تھے جنہیں سلطان کے استبدادی طرزِ عمل نے جنم دیا اور پروان چڑھایا۔ حتیٰ کہ ایسے گروہ اور تنظیمیں معرضِ وجود میں آ گئی تھیں جن کا مقصد وحید سلطان کو معزول کر کے پورے نظام کو بدلنا تھا۔

انجمن اتحاد و ترقی اور اس کا طریق کار

مدحت پاشا کے قتل کے بعد دستوری حکومت کا از سرِ نو قائم کیا جانا امرِ محال معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ بہت سے محب وطن ترک جو یورپی ممالک میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے اس مقصد سے غافل نہ تھے۔ خصوصاً پیرس میں نوجوان ترکوں کی ایک سرگرم جماعت سلطنت عثمانیہ میں دستوری حکومت کی تحریک کو ترقی دینے کے لئے منظم کوشش کر رہی تھی۔ 1878ء سے لے کر جب کہ سلطان نے دستورِ اساسی کو معطل کر دیا تھا۔ 1891ء تک ترکوں کی کسی انجمن کا پتہ نہیں چلتا۔ اگرچہ ایسے اشخاص کی تعداد جو حکومت کے استبداد سے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے، روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ سب سے پہلے 1891ء میں جنیوا (Geneva) میں جو صدیوں سے کلیسا اور حکومت کے باغیوں کا مامن بنا ہوا تھا، ترک جلاوطنوں اور پناہ گزینوں کی ایک جماعت نے ایک انجمن کی بنیاد رکھی جو بعد میں "عثمانی انجمن اتحاد و ترقی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ ترکی حکومت اور سلطان پر دباؤ ڈال کر ملک میں اصلاحات جاری کرانے کی سعی کی جائے۔ شروع میں انجمن اپنے کو اتنا طاقتور نہیں محسوس کرتی تھی کہ اگر سلطان اپنی ضد پر قائم رہتا تو اسے تخت سے اتارنے کی تدبیریں اختیار کرتی۔ کچھ دنوں کے بعد انجمن کا صدر دفتر جنیوا سے پیرس منتقل کر دیا گیا اور اس کی شاخیں لندن اور دوسرے یورپی ممالک کے دارالحکومتوں میں قائم کر دی گئیں۔ سلطان نوجوان ترکوں کی ان سرگرمیوں سے بے خبر نہ تھا۔ عثمانی سفیر مقیم پیرس کو ہدایت کی گئی کہ وہ انجمن کے متعلق جو معلومات بھی فراہم کر سکیں ان سے براہ راست قصر یلدیز کو مطلع کریں۔ خود ترکی میں جاسوسی کا نظام اور بھی سخت کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے دشمنوں کی تعداد بڑھتی گئی اور ملک کے بہترین اشخاص

بھاگ بھاگ کر پیرس پہنچنے لگے اور نوجوان ترکوں کی جماعت میں شامل ہوتے گئے۔ انجمن ایک اخبار" مشورت" اور متعدد چھوٹے رسالے پیرس سے شائع کرتی تھی۔ جنیوا سے اس کا دوسرا اخبار" ہلال" نکلتا تھا۔ ان اخباروں اور رسالوں میں دور حمیدی کے مظالم کا ذکر ہوتا اور سلطان کو معزول کرنے کی تجویزیں پیش کی جاتی تھیں۔ جاسوسی نظام کی شدت کے باوجود یہ اخبارات اور رسالے خفیہ طور پر ترکی میں لائے جاتے اور کثرت سے لوگ ان کو پڑھتے۔ قسطنطنیہ میں انجمن کے ایجنٹ انقلابی اپیلیں رات کی تاریکی میں دیواروں پر چسپاں کر دیتے اور باغیانہ پوسٹر جن میں سلطان کی جان کی دھمکی ہوتی تھی۔ خود قصر یلدیز کی دیواروں پر چسپاں کر دیے جاتے۔

غیر اسلامی انجمنوں سے مفاہمت

نوجوان ترک اپنے ممتاز پیش رو مدحت پاشا کی طرح خوب سمجھتے تھے کہ سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ اس کی تمام قوموں اور مذہبی فرقوں کو یکساں حقوق دے دیے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے آرمینی، بلغاری اور دوسری غیر مسلم انقلابی انجمنوں سے جو پیرس میں تھیں۔ اتحاد عمل پیدا کرنے کی کوشش کی۔ 1907ء تک مقدونیہ بھی نوجوان ترکوں کی تحریک میں شامل ہو چکا تھا۔ اس وقت تک انقلابی ترکوں نے مقدونیہ میں اپنی خفیہ سوسائٹی بھی قائم کر لی تھی اور وہاں موجود ترکی فوج کے بڑے حصے کو اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔ بالآخر دسمبر 1907ء میں انقلابیوں کی ایک کانگرس احمد رضا بے کی زیر صدارت انجمن مرکزی کے دفتر پیرس میں منعقد ہوئی جس میں عثمانی انجمن اتحاد و ترقی، ارمینی، بلغاری، یہودی، عرب، البانی اور دوسری کمیٹیاں شریک ہوئیں اور تمام مندوبین نے مندرجہ ذیل امور کو قبول کرنے پر اتفاق کیا:

1- سلطان عبدالحمید کو معزول کر دیا جائے۔

2- سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کا تحفظ کیا جائے۔

3- قانون کی نگاہ میں تمام نسلوں اور مذہبوں کو کامل مساوات حاصل ہو۔

4- مدحت پاشا کے بنائے ہوئے دستور اساسی کی بنیاد پر دستوری حکومت قائم کر دی جائے۔

انقلابیوں کا مقدونیہ کو تحریک کا مرکز بنانا

مذکورہ کانگرس سے ایک سال قبل" انجمن اتحاد و ترقی" نے اپنا صدر دفتر مقدونیہ منتقل کر دیا تھا۔ مقدونیہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کے مختلف اسباب تھے۔ اول یہ کہ وہیں وہ قوتیں کام کر رہی تھیں جن سے سلطنت عثمانیہ کے جلد ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا اندیشہ تھا۔ سیاسی ڈاکوؤں کے خون آشام جتھے جن کو ترکی کے دشمنوں سے برابر امداد مل رہی تھی اس علاقہ کو بری طرح تباہ و برباد کر رہے تھے۔ اس کی وجہ سے مقدونیہ کے داخلی معاملات میں دول عظمیٰ کو مداخلت کا موقع ہاتھ آ گیا تھا اور یہ چیز ہر محب وطن ترک کے لئے نہایت شرمناک تھی۔ چنانچہ مقدونیہ کے ملکی انتظامات کی نگرانی کے لئے ایک بین الاقوامی مالیاتی کمیشن کا تقرر اور ایک بین الاقوامی پولیس کی تشکیل جس کی تربیت اور کمان یورپی افسروں کے ہاتھ

Marfat.com

میں تھی، دولِ عظمیٰ نے سلطان پر دباؤ ڈال کر منظور کرائی تھی۔ نوجوان ترک اس مداخلت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کی وجہ سے حمیدی نظامِ حکومت کے خلاف ان کی بیزاری اور بھی شدید ہوگئی تھی۔ اس مداخلت کا ایک پہلو ترکوں کو خاص طور پر ناگوار تھا اور وہ مرزنگ پروگرام تھا۔ جس کی رو سے دولِ عظمیٰ نے آسٹریا اور روس کو جو دولتِ علیہ کے شدید دشمن تھے۔ مقدونیہ میں اپنا اصلاحی پروگرام جاری رکھنے کا اختیار دے دیا تھا۔ اس پروگرام کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقدونیہ کی حالت روز بروز بدتر ہوتی گئی اور یہ عام طور پر محسوس کیا جانے لگا کہ جب تک نظامِ حکومت میں بنیادی اصلاح نہیں کی جائے گی غیر ملکوں کی گرفت اور بھی سخت ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ سلطنت عثمانیہ ایک روز اپنی آزادی بالکل کھو بیٹھے گی۔ چنانچہ پورے مقدونیہ میں موجودہ حالات کے خلاف جو شدید بیزاری پھیلی ہوئی تھی اس نے نوجوان ترکوں کی خفیہ سرگرمیوں کے لئے زمین تیار کر دی تھی۔

اس سلسلہ میں پہلا کام فوج کو اپنا ہم خیال بنانا تھا۔ مقدونیہ کی فوجیں سلطنت کے دوسرے حصوں کی بہ نسبت بغاوت کے لئے زیادہ آمادہ تھیں۔ ان فوجوں کو نہ اچھا کپڑا ملتا تھا۔ نہ اچھا کھانا تنخواہیں بھی شاذ و نادر ہی ملتی تھیں۔ سالہا سال یہ فوجیں عیسائی باغیوں کے جتھوں سے بے قاعدہ لڑائیوں میں مصروف تھیں۔ جو ایک قسم کا پولیس کا کام تھا اور فوجی راہیوں کو مرغوب خاطر نہیں تھا۔ ان کے بے اطمینانی اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ وہ دیکھتی تھیں کہ ان ہی کے بھائی جو بین الاقوامی پولیس میں تھے، ان کی حالت کتنی بہتر تھی۔ عمدہ کھانا اور عمدہ کپڑا بھی ملتا تھا اور ان کی تنخواہیں بھی باقاعدہ برابر ملتی تھیں۔ ان کو دیکھ کر مقدونیہ کی فوج کے افسروں اور سپاہیوں دونوں کو اپنی زبوں حالی کا احساس اور بھی زیادہ ہوتا تھا اور وہ خوب سمجھتے تھے کہ اس صورتِ حال کا ذمہ دار قصر یلدیز ہے۔

نظامِ جاسوسی کی شدت بھی سلطنت کے اور حصوں کی بہ نسبت مقدونیہ میں زیادہ تھی۔ جس سے وہاں کے نوجوان فوجی جن کی تعلیم و تربیت یورپی اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی تھی، سخت بیزار تھے۔ انہیں لامحالہ نوجوان ترکوں کی تحریک سے ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ ان کی بیزاری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ قسطنطنیہ سے قصر یلدیز کے متوسلین جن میں مطلق فوجی قابلیت نہیں ہوتی تھی، مقدونیہ میں بھیجے جاتے تھے اور انہیں ان افسروں کے اوپر کمان دی جاتی تھی جو مدارس حربیہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ سلطنت کی جنگوں میں نمایاں حصہ لیا تھا اور جو سالوں سے مقدونیہ کے پہاڑوں میں باغی جتھوں سے لڑتے آئے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ ترقی کا مدار حسن خدمت پر نہیں بلکہ قصر سلطانی کی سفارش گردیوں پر ہے۔

ان حالات میں نوجوان ترکوں کو اپنی تحریک کے پھیلانے میں بڑی مدد ملی۔ انجمن کی غیر معمولی سرگرمیوں کے باعث تھوڑے ہی عرصہ میں انقلابی خیالات مقدونیہ کی پوری فوج میں پھیل گئے۔ انجمن کے ارکان درویشوں اور سوداگروں کے بھیس میں فوج کے دستوں میں جاتے اور بڑی ہوشیاری سے تحریک آزادی کی تبلیغ کرتے۔ سپاہیوں اور افسروں کو حکومت کی طرف سے جو شکایات تھیں ان کی وجہ سے یہ خفیہ کوششیں کامیاب ہوتی گئیں۔ اس کے بعد دوسری فوجوں میں بھی کام شروع کیا گیا۔ چونکہ دارالحکومت کی فوج سب سے زیادہ طاقتور اور وفادار تھی اس لئے انجمن نے مقدونیہ میں اپنی کامیابی کے بعد سب سے زیادہ کوشش اسی فوج کی ہمدردی حاصل کرنے میں کی۔ دسمبر 1907ء تک مقدونیہ کی قریباً پوری فوج

Marfat.com

نے دستوری حکومت کی حمایت کا اعلان کر دیا اور حلف بھی لے لیا۔ ادرنہ اور قسطنطنیہ کی فوجوں نے بھی اس تحریک سے ہمدردی ظاہر کر دی تھی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ناظم بے کی کوششوں سے اناطولیہ کی فوج کا بڑا حصہ بھی نوجوان ترکوں کا طرف دار ہو گیا تھا۔

مقدونیہ میں "انجمن اتحاد و ترقی" نے اپنی خفیہ سوسائٹی کا صدر دفتر سالونیکا میں قائم کیا۔ یہ شہر سوسائٹیوں کے لئے خاص طور پر موزوں تھا۔ اس میں بہت سی نسلوں اور قوموں کے لوگ آباد تھے جو مختلف زبانیں بولتے تھے۔ اس کی گھنی آبادی میں بھیس بدل کر جاسوسوں کی نظر سے بچنا آسان تھا۔ برخلاف اس کے جاسوسوں کے لئے سازشوں اور خفیہ سوسائٹیوں کا پتہ چلانا بہ نسبت اور شہروں کے یہاں زیادہ مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ترکوں کی خفیہ سوسائٹی سے پہلے بھی وہاں اس قسم کی کئی سوسائٹیاں قائم تھیں۔ چنانچہ بلغاری داخلی انجمن کا صدر دفتر وہاں 1895ء سے موجود تھا۔

انجمن کی احتیاطی تدابیر

قصر یلدیز "انجمن اتحاد و ترقی" کی سرگرمیوں سے باخبر تھا اور سلطان کے جاسوس اس کے ممبروں کا سراغ لگانے کے لئے پوری طرح کوشاں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ممبروں کا داخلہ بڑی چھان بین اور انتہائی احتیاط کے ساتھ ہوتا تھا۔ جن لوگوں نے انجمن کے قواعد و ضوابط مرتب کئے تھے انہوں نے اطالوی خفیہ سوسائٹیوں کا طریقہ اختیار کیا تھا جن میں ایک ممبر کا تعارف سوسائٹی کے صرف دو ممبروں سے کرایا جاتا تھا۔ کیونکہ اگر کبھی غدار بھی ثابت ہو تو اس تعداد سے زیادہ کا نام نہ بتا سکے۔ اس کے علاوہ بھی ممبر کے خلوص کا امتحان لینے کے لئے کئی اور سخت مراحل سے گزارا جاتا تھا۔ ممبر سے حلف بھی لیا جاتا تھا۔ حلف دینے کا طریقہ یہ تھا کہ قرآن مجید پر ایک ریوالور اور ایک تلوار رکھ کر ممبر کو متنبہ کر دیا جاتا تھا کہ اس نے اپنا جسم و جان انجمن کے حوالے کر دیا ہے اور انجمن حکم دے تو اسے اپنے حقیقی بھائی کو بھی قتل کر دینا پڑے گا اور اس کے بعد ممبر یہ حلف لیتا میں خدا اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کی قسم کھاتا ہوں کہ جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی رہے گا میں قومیت، آزادی اور صداقت کے لئے جنگ کرتا رہوں گا۔ حلف لینے کے بعد ممبر اپنی رکنیت کا ٹیکس ادا کرتا جس کی مقدار اس کی آمدنی کا دو فیصد حصہ تھی۔ وہ ایک بندوق رکھنے کا عہد کرتا نیز اس بات کا عہد کرتا کہ جس وقت اسے انجمن کے مقصد کے لئے لڑنے کی خاطر طلب کیا جائے گا، وہ فوراً اپنے بال بچوں کاروبار اور دوستوں کو چھوڑ کر تیار ہو جائے گا۔ ممبروں سے جو ٹیکس وصول کیا جاتا وہ اور دوسرے عطیے اور رقوم جو انجمن کو حاصل ہوتیں، اسلحہ اور سامانِ جنگ میں صرف کی جاتیں۔ اس کے بعد جو رقم بچتی وہ ان لوگوں کے اہل و عیال کی مدد کے لئے وقف کر دی جاتی جو دورانِ انقلاب میں مارے گئے۔ قصر یلدیز کے استبداد سے چھٹکارا حاصل کرنے والے لاکھوں میں تھے لیکن انجمن ہر قدم پھونک پھونک کر رکھ رہی تھی۔ چنانچہ انجمن کی ممبرشپ مقدونیہ میں پندرہ ہزار اور پورے ترکی میں اسی ہزار تک محدود تھی۔

کسی بھی خفیہ تحریک کے لئے اپنے ممبروں میں پیغام رسانی کا مرحلہ بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ انجمن کی خوش قسمتی تھی کہ پورے ملک ترکی میں عورتوں کو بڑی عزت دی جاتی تھی۔ پولیس کا کوئی سپاہی یا جاسوس بہت ہی مخصوص حالات کے بغیر کسی گھر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ انجمن نے معاشرے کے اس ماحول کا فائدہ اٹھایا اور پیغام کا کام اپنی بیگمات سے لیا۔ وہ آپس میں

Marfat.com

ملتی رہتی تھیں اور پیغام رسانی کا سلسلہ جاری وساری رہتا۔

سالونیکا کمیٹی

سالونیکا میں صدر دفتر منتقل ہونے کے بعد انجمن کی شاخیں مقدونیہ اور البانیہ کے قریباً ہر گاؤں میں قائم کر دی گئیں۔ انقلاب کے برپا ہونے سے پیشتر اس کی شاخیں ایشیائی ترکی کے تمام اہم شہروں میں قائم ہو چکی تھیں۔ سالونیکا کمیٹی کے سب ممبر اعلیٰ اور متوسط طبقہ کے لوگ تھے، فوج کے نوجوان افسر تھے جنہوں نے مدرسۂ حربیہ میں تعلیم پائی تھی اور یورپ کے اعلیٰ ترین فوجی نظام کے تربیت یافتہ تھے، وکلاء تھے، ڈاکٹر تھے اور چند علماء تھے۔ اونچے درجوں کے افسروں اور ملازمت دیوانی کے اعلیٰ عہدہ داروں میں کوئی بھی اس کمیٹی کا ممبر نہیں تھا۔ تمام اشخاص جن میں سے اکثر متوسط عمر سے کم کے تھے جو خفیہ کمیٹی کے ممبر بنے تھے اپنی شدید اور بے لوث وطن دوستی کے لئے ممتاز تھے۔ یہ ایسے لوگ تھے کہ جس غیر ملکی شخص کو بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا وہ ان کا احترام اور تعریف و توصیف کرنے پر مجبور ہوا۔ یہ انقلاب نیچے سے شروع نہیں ہوا تھا یعنی ذلیل شہری مخلوق یا جاہل کسانوں سے، بلکہ اوپر سے آیا تھا جو ترکی معاشرے کا بہترین حصہ تھا۔

تحقیقاتی کمیشن

دسمبر 1907ء کی پیرس کانگرس برخاست ہونے کے بعد جب نوجوان ترک پارٹی کے اخبارات ''مشورت'' اور ''ہلال'' نے ''انجمن اتحاد وترقی'' کی کامیابی کا ذکر کیا جو اسے اپنی تحریک پھیلانے میں حاصل ہوئی تھی تو سلطان نے معاملہ کی اہمیت کا اندازہ کر کے انسدادی تدبیریں فوراً اختیار کیں چنانچہ مارچ 1908ء میں خفیہ پولیس نے مقدونیہ اور ادرنہ کے فوجی دستوں کے بعض افسروں پر چھاپے مارے اور تفتیش کے لئے ایک خاص کمیشن قسطنطنیہ سے سالونیکا بھیجا گیا۔ اس کمیشن کی رپورٹ جب سلطان کے پاس پہنچی تو اسے زیادہ خطرہ ہوا اور فوراً ہی اس نے ایک دوسرا کمیشن سالونیکا بھیجا۔ ان کمیشنوں کی رپورٹ پر بہت سے فوجی افسر گرفتار کر لئے گئے۔

فوجی افسروں کی گرفتاری کے بعد قصر یلدیز کے خلاف انقلاب اپنے رستے پر چل نکلا۔ انقلاب، دستور اساسی کا نفاذ، پارلیمنٹ کا افتتاح پھر جوابی انقلاب اور اس کے بعد عبدالحمید ثانی کی معزولی اور جلاوطنی۔ واقعات کی یہ ترتیب کس طرح معرض وجود میں آئی۔ یہ ساری داستان بڑی ولولہ انگیز اور عبرت آموز بھی ہے۔ اسے ہم تفصیل سے بیان کریں گے تاکہ قاری کہیں بھی تشنگی محسوس نہ کرے۔

انقلاب میں عجلت

انجمن اتحاد وترقی ابھی انقلاب کے اعلان کے لئے پوری طرح تیار نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ انقلاب 31 جولائی 1909ء کو شروع کیا جائے جو سلطان عبدالحمید کی تخت نشینی کی سالگرہ کا دن تھا لیکن ایک طرف تو قصر یلدیز کی سرگرمیاں روز بروز زیادہ شدید ہوتی جا رہی تھیں اور دوسری طرف مقدونیہ کی بڑھتی ہوئی طوائف الملوکی کے باعث بیرونی طاقتوں خصوصاً برطانیہ اور روس کی مداخلت کا خطرہ ہر لحظہ ترقی کر رہا تھا۔ ریوال میں شاہ ایڈورڈ ہفتم اور زار روس کی ملاقات کے بعد سالونیکا

Marfat.com

کمیٹی کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ برطانیہ اور روس مل کر مقدونیہ میں اصلاحات کی ایک سکیم جاری کرنا چاہتے ہیں جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ وہاں کے تمام جتھے خواہ کسی نسل و قوم کے ہوں توڑ دیے جائیں۔ برطانیہ اور روس کا تعاون کمیٹی کی نظر میں سلطنت عثمانیہ کی شکست و ریخت کا مقدمہ تھا۔ علاوہ بریں وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ مقدونیا میں اجنبی تسلط قائم ہو جانے سے ان کی تحریک کو جاری رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ انہی دنوں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ منیر پاشا ترکی سفیر متعینہ پیرس کے دوبارہ ایتھنز جانے کی غرض یہ تھی کہ بلغاریہ کے خلاف یونان سے اتحاد کر کے مقدونیا کے بعض حصے یونان کے حوالے کر دیے جائیں۔ اس افواہ سے نوجوان ترکوں میں سخت برہمی پھیلی۔

اعلانِ انقلاب

مندرجہ بالا وجوہ سے کمیٹی نے اعلانِ انقلاب میں تاخیر اپنے مقصد کے لئے خطرناک سمجھی۔ چنانچہ کمیٹی کی ہدایت کے بموجب 5 جولائی 1908ء کو میجر نیازی بے نے دو سو آدمیوں کے ساتھ رسنا کی پہاڑیوں پر سلطان عبدالحمید کے استبداد کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور حیرت انگیز سرعت کے ساتھ انقلاب کے شعلے ہر طرف پھیلنے لگے۔ جس وقت اس کی اطلاع قسطنطنیہ پہنچی۔ سلطان نے فوراً شمسی پاشا کے نام جو مناستر کے فوجی دستہ کا کمانڈر تھا، حکم بھیجا کہ اس فتنہ کو جلد سے جلد فرو کر دیا جائے۔ شمسی پاشا باغیوں کے مقابلے میں روانہ ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ 7 جولائی کو مقدونیا کی فوج کے ایک افسر نے جو انجمن اتحاد و ترقی کا ممبر تھا، اس پر گولی چلا دی اور شمسی پاشا اپنی گاڑی کے اندر ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ 8 جولائی کو ناظم بے نے سالونیکا کے اڑتالیس افسروں کو جن کے متعلق معلوم تھا کہ تحریک انقلاب کے حامی ہیں، گرفتار کر لیا۔ دو ہی روز میں انجمن کے ایک رکن نے اس کا جواب یوں دیا کہ حقی بے کو جو ناظم بے کا دستِ راست تھا گولی مار کر ختم کر دیا۔ 11 جولائی کو خود ناظم بے پر بھی قاتلانہ حملہ کیا گیا لیکن وہ صرف زخمی ہو کر بچ گیا۔

انقلاب کی رفتار جس قدر تیز ہوتی جاتی تھی اسی قدر اسے فرو کرنے میں حکومت کی طرف سے سختی بھی بڑھتی جاتی تھی۔ یہ دیکھ کر "سالونیکا کمیٹی" نے اپنے خفیہ اجلاسوں میں قصر یلدیز کے ان آلہ کاروں کے قتل کے احکام صادر کرنا شروع کر دیے جو تحریکِ انقلاب کے لئے نہایت خطرناک نظر آتے تھے۔ ان میں وہ تمام لوگ شامل تھے جو جاسوسی کی خدمت انجام دیتے تھے۔ مقدونیہ کی فوج کے بعض سینئر افسر بھی تھے جن کا قتل کمیٹی کو ضروری معلوم ہوا۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں لوگ بڑی بڑی تنخواہ پر بھی جاسوسی کا کام کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ ہر جاسوس اپنے کو بندوق کا نشانہ سمجھتا تھا۔ یہ قتل علی الاعلان دن کی روشنی میں سڑکوں پر ہوتے تھے اور ان کی ذمہ داری فوجی افسروں پر تھی۔ جبکہ کوئی شخص بھی ان قاتلوں سے مزاحم نہیں ہوتا تھا۔ سلطان کے نہایت قابل اعتماد افسر جب اس بغاوت کو کچلنے کے لئے بھیجے جاتے تو وہ اپنے سپاہیوں سے باغیوں پر گولیاں چلوانے سے قاصر رہتے اور بعض اوقات خود بھی قتل کر دیے جاتے۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار بادشاہ کا نام اطاعت شعار عثمانی سپاہیوں کے دلوں میں احترام و اطاعت کا جذبہ پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہوا۔

Marfat.com

الطافِ خسروانہ کا فریب

مقدونیا میں حکومت کا اقتدار اس حد تک زائل ہو چکا تھا کہ باب عالی کے کمشنروں کے لئے ان افراد کی گرفتاری دشوار ہو گئی جو بغاوت کے جرم میں نامزد کئے گئے تھے۔ چنانچہ اب فریب سے کام لینے کی کوشش کی گئی۔ انور بے اور دوسرے نوجوان افسروں کو جو مقدونیہ کے اندرونی علاقوں میں تحریک انقلاب کو پھیلا رہے تھے خوشامدانہ خطوط لکھ کر قصر یلدیز آنے کی دعوت دی گئی اور ان سے نہ صرف معافی بلکہ انعام و کرام اور عہدے کی ترقی کا وعدہ کیا گیا۔ انور بے اس وقت ولایات مقدونیہ کے انسپکٹر جنرل کے سٹاف کے ایک افسر تھے۔ سلطان ان کی اہم حیثیت سے واقف تھا۔ اس لئے انہیں خاص طور پر الطافِ خسروانہ کا لالچ دیا گیا اور سلطان کی طرف سے یہ دعوت پیش کی گئی کہ اگر وہ باغیوں کا ساتھ چھوڑ کر فوراً قسطنطنیہ روانہ ہو جائیں تو بلا تاخیر جنرل کے عہدہ پر مامور کر دیے جائیں گے۔ انور بے عبدالحمید کی چالوں سے خوب واقف تھے وہ جانتے تھے کہ موجودہ صورت حال میں قسطنطنیہ جانے کے معنی یہ ہیں کہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ بہت سے محبان وطن ترقی اور انعام و کرام کے وعدوں پر قصر یلدیز میں بلائے گئے تھے۔ پھر دنیا کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں اور کیوں کر غائب ہو گئے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ مدحت پاشا کے وقت سے الطافِ خسروانہ کا یہ طریقہ دستوری حکومت کے حامیوں کو ہلاک کرنے کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بجائے قسطنطنیہ کے پہاڑوں کی راہ لی اور وہاں لوگوں کو علانیہ بغاوت کے لئے اُبھارنا شروع کر دیا۔

انجمن اتحاد و ترقی اب کھل کر میدان میں آ گئی تھی۔ اس کی کوششوں سے مقدونیہ اور ادرنہ کی فوجوں کا بڑا حصہ بغاوت میں شریک ہو چکا تھا۔ یہ دیکھ کر باب عالی نے طے کیا کہ اناطولیہ کی قابل اعتماد فوج کے اڑتالیس دستے مقدونیہ کی بغاوت فرو کرنے کے لئے روانہ کئے جائیں۔ چنانچہ ستائیس دستے سمندر کی راہ سے سالونیکا بھیجے گئے جہاں وہ 16 جولائی کو اترے۔ ڈاکٹر ناظم بے اور ان کے ساتھیوں کی خفیہ سرگرمیوں سے یہ دستے ایشیائے کوچک سے روانہ ہونے سے قبل ہی انقلابی خیالات سے بڑی حد تک متاثر ہو چکے تھے۔ سمرنا میں آنے کے بعد انجمن کے ایجنٹوں نے فوراً ہی ان میں پہنچ کر اپنا کام شروع کر دیا۔ کچھ دستے مناستر روانہ کر دیے گئے جبکہ بعض دستوں نے سالونیکا پہنچ کر مناستر جانے سے انکار کر دیا۔ ان کے ساتھ وہ افسر جو سالونیکا کی خفیہ کمیٹی کے کارکن تھے شربت بیچنے والوں اور ملاؤں کے لباس میں مناستر پہنچ گئے اور وہاں اپنی کوششوں سے تحریک انقلاب کے حامیوں کی تعداد روز بروز بڑھانے لگے۔ چنانچہ یہ بات جلد واضح ہو گئی کہ اناطولیہ کی فوج کے اکثر افسر اور سپاہی مقدونیا کے فوجی دستوں سے ہمدردی رکھتے ہیں اور ان پر گولی چلانے کے لئے ہرگز آمادہ نہ ہوں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ اناطولیہ کے دستوں نے مناستر پہنچنے کے چند ہی دنوں بعد ''انجمن اتحاد و ترقی'' کا حلف بھی لے لیا۔

جولائی کے تیسرے ہفتے میں حالت یہ تھی کہ مقدونیا کی فرمانروائی اب بھی برائے نام قائم تھی لیکن حکومت کا اقتدار کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ خاص فوجی مرکز میں فوج کی کمان مارشل عثمان فیضی پاشا کے ہاتھ میں تھی جو شمسی پاشا کے قتل کے بعد اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے لیکن وہ اپنے سپاہیوں کا رنگ دیکھ کر کوئی فیصلہ کن قدم بڑھانے میں تامل سے کام لے رہے تھے۔ مقدونیہ اور ادرنہ کے فوجی دستے نیز وہ دستے جو اناطولیہ سے لائے گئے تھے یا تو انجمن کے طرفدار تھے یا

Marfat.com

حکومت کی وفاداری میں متزلزل ۔اس کی توقع نہ تھی کہ سپاہیوں کا بڑا حصہ قصر یلدیز کا اقتدار قائم رکھنے کے لیے اپنے ساتھیوں پر گولی چلائے گا۔ بلغاری کسان جن کو انجمن نے اسلحہ دے رکھا تھا، عام بغاوت میں حصہ لینے کے لئے صرف حکم کے منتظر تھے اور دس ہزار البانی جنگجو استبداد کے حامیوں پر حملہ آور ہونے کے لئے تیار تھے۔

مناستر پر قبضہ

سلطان نے دیکھا کہ سختی سے کام نہیں چلتا تو اب نرمی کا اظہار شروع کیا۔ چنانچہ ایک بڑی رقم قرض لے کر سالونیکا بھیجی گئی تا کہ فوج کی تنخواہ جو مدت سے ادا نہیں کی گئی تھی فوراً دے دی جائے اور مقدونیہ کے وہ اڑتالیس فوجی افسر جو 8 جولائی کو گرفتار کئے گئے تھے رہا کر دیے گئے لیکن یہ تدبیر بھی بے اثر ثابت ہوئی۔ 22 جولائی کو نیازی بے نے ایک ہزار آدمیوں کی جمعیت سے مناستر پر رات کی تاریکی میں قبضہ کر لیا اور عثمان پاشا کو گرفتار کر کے ''اوکریدا'' میں نظر بند کر دیا گیا۔اس کے بعد سالونیکا کمیٹی نے عثمان پاشا کی طرف سے مندرجہ ذیل تار سلطان کی خدمت میں روانہ کیا۔

> ''میں فوج کے ہاتھ میں ہوں۔جس نے قسم کھائی ہے کہ اگر دستور فوراً عطا نہ کیا گیا تو وہ قسطنطنیہ پر حملہ کر دے گی اور میں ادب کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ میرا مقصد فوج کی قیادت کرنے کا ہے۔''

اسی روز ایک لاکھ البانیوں نے ''فیروز و ویچ'' کے مقام پر جلسہ کر کے نوجوان ترکوں کی تحریک آزادی میں شریک ہونے کا باقاعدہ اعلان کر دیا اور ''اسکوب'' سے براہ راست سلطان کے پاس یہ اطلاع بھیجی گئی کہ البانیوں نے دستوری حکومت کی حمایت کا حلف لے لیا ہے۔

قصر یلدیز کی سراسیمگی

ان خبروں کے پے در پے پہنچنے سے قصر یلدیز میں سراسیمگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ 22 جولائی کو سلطان نے فرید پاشا کو معزول کر کے کوچک سعید پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا۔اسی روز رات کو مجلس وزرا کا اجلاس ہوا،جس میں مقدونیہ کی بغاوت پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی لیکن وزراء سلطان کے مزاج سے واقف تھے۔اس وجہ سے اپنے اصل خیالات کے اظہار سے گریز کرتے رہے۔آخر دربار کا پرانا عرب نجومی ابوالہدیٰ جو بہت ضعیف اور بیمار تھا، پالکی میں لایا گیا۔اس نے وہی کہا جسے وزراء زبان پر لاتے ہوئے ڈر رہے تھے۔یعنی تخت کو محفوظ رکھنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ بلا تاخیر دستوری حکومت کا اعلان کر دیا جائے۔سلطان دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوا تمام باتیں سن رہا تھا لیکن اب بھی خاموش تھا۔ 23 جولائی علی الصبح مجلس برخاست ہو گئی مگر اس وقت تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

دستوری حکومت کا اعلان

اسی روز انجمن اتحاد و ترقی نے حلمی پاشا کو جو ولایات مقدونیہ کے انسپکٹر جنرل تھے، یہ الٹی میٹم دیا کہ اگر چوبیس گھنٹے میں دستوری حکومت کا اعلان نہ کیا گیا تو وہ قتل کر دیے جائیں گے۔ساتھ ہی انجمن کی طرف سے بذریعہ تار سلطان کو اطلاع دے دی گئی کہ اگر چوبیس گھنٹے کے اندر دستوری حکومت کا اعلان نہ کیا گیا تو انقلابی فوجیں قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہو جائیں گی۔ ان

اطلاعات کے پہنچنے پر معاملہ کی پوری اہمیت سلطان کے سامنے آ گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب یہ شورش دبنے والی نہیں اور اگر انجمن کا مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ جس کا نتیجہ خود اس کے حق میں بہت برا ہوگا۔ چنانچہ 23 جولائی کو رات کے وقت جب مجلس وزراء کا اجلاس پھر سے منعقد ہوا، اس میں دستوری حکومت کے اعلان پر سب نے اتفاق کیا تو سعید پاشا یہ عرضداشت لے کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ سلطان کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا اور مجلس وزراء کی عرضداشت پیش کرتے وقت اپنی جان کیلئے ڈر رہا تھا لیکن سلطان ان واقعات کے متعلق قائل ہو چکا تھا۔ اس نے بلا تامل اس درخواست پر اپنی منظوری تحریر کر دی۔

24 جولائی کو "انجمن اتحاد و ترقی" کو بذریعہ تار اطلاع دی گئی کہ سلطان نے دستوری حکومت کا قیام منظور فرما لیا ہے۔ تھوڑی دیر میں پوری سلطنت میں یہ خبر پھیل گئی اور ہر طرف خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ خصوصاً مقدونیہ میں مسرت کا ایک سمندر لہریں مارتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ انور بے نے اعلان کیا کہ استبدادی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور آج سے ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ اب نہ کوئی بلغاری ہے نہ یونانی نہ رومانی نہ یہودی نہ ترک۔ اس نیلگوں آسمان کے نیچے ہم سب برابر ہیں اور صرف عثمانی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔

دستوری حکومت کا اعلان ترکوں کے لئے خاص طور پر باعث مسرت تھا۔ سلطان عبدالحمید کے استبداد کی سختیاں زیادہ تر انہیں جھیلنی پڑی تھیں۔ عیسائی اور دوسری مسلمان قومیں نسبتاً آزاد تھیں۔ ترکوں پر ہر وقت ایک خوف طاری رہتا تھا۔ جس نے ان کی زندگی تلخ کر دی تھی۔ ایک مغربی وقائع نگار لکھتا ہے کہ بڑے سے بڑا ترک بھی جاسوسی کی زد سے محفوظ نہ تھا اور نہ چھوٹے سے چھوٹا سخت گیری سے۔ تعلیم یافتہ طبقوں میں مشکل سے کوئی گھر ایسا تھا جہاں کسی فردِ خاندان کو مشتبہ موت کا ماتم یا اس کی ناگہانی جلاوطنی کی یاد تازہ نہ رہی ہو۔ اب یہ تمام باتیں رخصت ہو گئیں۔ لوگ آزادی سے سانس لینے لگے۔ تیس برس کے بعد پہلی مرتبہ کھل کر باتیں کر سکتے تھے، پڑھ سکتے تھے، اپنے دوستوں سے ملاقاتیں کر سکتے تھے، ادھر ادھر سفر کر سکتے تھے۔ ایک نوجوان ترک نے مجھ سے بیان کیا کہ اب تک میں زندہ ہی نہ تھا۔

دوسری طرف نوجوان ترکوں کا رویہ بھی بڑا قابل ستائش تھا۔ تیس سال کے استبدادی دور سے آزاد ہونے کے بعد انہوں نے زندگی کے ہر پہلو پر توازن، صبر، حوصلہ مندی اور برداشت کا مظاہرہ کیا۔ آزادی کے جوش میں نہ کسی کو قتل کیا نہ رسوا کیا گیا اور نہ ہی کوئی اور مسئلہ کھڑا کیا گیا۔ ترکی پریس نے بھی بڑے شاندار کردار کا مظاہرہ کیا، نہ تو انقلاب مخالفین کی پگڑیاں اچھالی گئیں اور نہ ہی کسی طبقے کو اتنا سر پر چڑھایا گیا کہ وہ معاشرے میں کسی قسم کا اضطراب اور برہمی پیدا کر سکے۔

خط ہمایوں یکم اگست 1908ء

دستوری حکومت کے اعلان کے ایک ہفتہ بعد یکم اگست کو سلطان عبدالحمید نے ایک فرمان شائع کیا جس میں دستورِ اساسی کے خدوخال بیان کئے تھے۔ یہ فرمان پندرہ شقوں پر مشتمل تھا، جن کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ نوجوان ترکوں نے خط ہمایوں کی شق نمبر 10 پر یہ اعتراض کیا کہ شیخ الاسلام، وزیر جنگ اور وزیر بحریہ کا انتخاب سلطان نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ حالانکہ 1876ء کے دستور اساسی کے مطابق ان کا تقرر بھی صدر اعظم کے حقوق میں شامل تھا۔ چنانچہ

Marfat.com

اس بنا پر شیخ الاسلام جمال الدین آفندی نے 2 اگست کو اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ صدرِ اعظم سعید پاشا سے ملا اور اسے اس دفعہ پر زیرِ بحث کی خرابی کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے بتایا کہ جنگ و بحریہ کے محکمے جن کے افسرانِ اعلیٰ کا تقرر سلطان نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اصلاح کے سب سے زیادہ محتاج ہیں۔ اس الزام کے بعد سعید پاشا صدارت سے علیحدہ ہو گیا اور 3 اگست کو استعفیٰ دے دیا۔ ساتھ ہی وزارت کے دوسرے ارکان بھی مستعفی ہو گئے۔ 6 اگست کو سلطان نے کامل پاشا کو جو ایک معمر اور آزمودہ کار مدبر تھا اور اس سے پہلے کئی بار صدرِ اعظم رہ چکا تھا، سعید پاشا کی جگہ مقرر کر کے ایک نئی وزارت قائم کرنے کا حکم دیا اور دوسرے وزیروں کی طرح وزیرِ جنگ اور وزیرِ بحریہ کا انتخاب بھی صدرِ اعظم کو دے دیا۔ کامل پاشا نے اپنی کابینہ میں ایک یونانی اور ایک ارمنی وزیر کو بھی شامل کیا۔

نئی وزارت

نئی وزارت نے حکومت کے مختلف شعبوں میں اصلاحات کا کام شروع کر دیا اور اب ہر طرف ایک نئی روح محسوس کی جانے لگی۔ ان اصلاحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں حکومت کا اعتماد رعایا کے دلوں میں قائم ہو گیا۔ "انجمن اتحاد و ترقی" کے ارکان بہت کم ایسے تھے جن کو نظم و نسق، فنِ سفارت یا مالیات کا تجربہ تھا اور وہ اپنی اس کمی سے واقف تھے۔ چنانچہ اس حقیقت کے پیشِ نظر انہوں نے حکومت کے سابق اعلیٰ عہدہ داروں کو اپنی جگہ برقرار رکھا اور ان کی لیاقت اور تجربہ سے فائدہ اٹھایا۔ البتہ ان عہدہ داروں کو جو رشوت ستانی میں مشہور تھے، برطرف کر دیا گیا۔ جو لوگ برقرار رکھے گئے ان کی بھی سخت نگرانی کی جاتی تھی اور اگر دستورِ اساسی کے خلاف کچھ بھی کرتے تو فوراً علیحدہ کر دیئے جاتے تھے۔ چونکہ یہ عہدے دار حقیقتاً سلطنت کے خیر خواہ تھے، اس لئے انجمن کو ان سے کام لینے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اس درمیان میں انجمن اپنے ارکان کی ایک جماعت کو انتظامی امور کی تعلیم دے کر حکومت کے مختلف محکموں کے لئے تیار کر رہی تھی۔ نوجوان ترکوں نے اپنی لیاقت کا سکہ بیرونی حکومتوں پر بھی بٹھا دیا۔ انہوں نے دولِ عظمیٰ کو لکھا کہ مقدونیہ میں ان کی نگرانی کی اب مطلق ضرورت نہیں۔ چنانچہ یورپی افسر واپس بلا لئے گئے اور بین الاقوامی کمیشن برخاست کر دیا گیا۔

دستورِ اساسی کے اعلان اور پارلیمنٹ کے افتتاح کے درمیان چار مہینوں میں "انجمن اتحاد و ترقی" سلطنت کی حقیقی فرماں روا تھی۔ یہ جو احکام چاہتی سلطان سے صادر کراتی۔ فوجوں کی نقل و حرکت تمام تر اس کے ہاتھ میں تھی۔ وزرا اور صوبوں کے گورنر دوسرے اعلیٰ عہدیدار اسی کے حکم سے مقرر یا معزول ہوتے تھے۔ ہم عصر برطانوی مورخ لکھتے ہیں کہ انجمن کے ان ناتجربہ کار نوجوانوں نے ایک جدید نظام کو بروئے کار لانے اور اپنے ملک کی ان کثیر التعداد خطرات سے حفاظت کرنے میں جن سے نئی حاصل کی ہوئی آزادی بربادی کی زد میں تھی۔ ایسی دانشمندی، موقع شناسی، میانہ روی، فراست اور پیش بینی دکھائی کہ غیر ملکی اشخاص اس کا مشاہدہ کر کے حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے امن و امان کو مضبوطی کے ساتھ قائم رکھا اور اس چیز میں خود قوم کے شاندار ضبطِ نفس اور حبِ وطن سے انہیں بڑی مدد ملی۔ اگرچہ وہ خود ان کے علاوہ ہزاروں آدمی استبداد اور اس کے کاسہ لیسوں کے مظالم اور غارت گری کا شکار رہ چکے تھے، پھر بھی ان کی طرف سے انتقام کا کوئی جذبہ ظاہر نہیں ہوا۔ صرف ان لوگوں کو سزائیں دیں جن کے جرائم بہت سخت تھے۔ انہی لوگوں کو برطرف کیا جنہوں نے اپنے افعال سے ظاہر کر

Marfat.com

دیا تھا کہ وہ دستورِ اساسی کے لئے خطرہ کا باعث ہیں۔ باقی سب کو صاف دلی سے معاف کر دیا۔ بیرونی طاقتوں نے ترکی کے تعلقات موقع شناسی اور مدبرانہ سیاست دانی کے ساتھ قائم کئے گئے ان سے غلطیاں غیر معمولی طور پر کم ہوئیں۔

انجمن اتحاد و ترقی پر یورپ کا پہلا وار

لیکن نوجوان ترکوں کی صلح جوئی ان طاقتوں کی حرص و آز کو کم نہ کر سکی جو دولتِ علیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہر موقع پر تیار رہتی تھیں۔ دستورِ اساسی کے اعلان کے بعد سلطنت کی تمام رعایا کو دستوری آزادی حاصل ہو گئی تھی مگر اس کے دو صوبے بوسنیا اور ہرزیگووینا جو تیس برس سے آسٹریا کی نگرانی میں تھے، استبداد کی زنجیروں سے اب بھی رہا نہ ہوئے۔ حکومتِ آسٹریا ان کو دستوری آزادی دینے پر راضی نہ ہوئی۔ چنانچہ جب ترکی پریس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ دستور کا نفاذ بوسنیا اور ہرزیگووینا میں بھی کر دیا جائے جو آسٹریا کی نگرانی کے باوجود سلطنتِ عثمانیہ کی فرماں روائی میں داخل ہیں تو آسٹریا کو سخت تشویش ہوئی اور اس نے یہ دیکھ کر کہ ترکی اس وقت مقابلہ کی قوت نہیں رکھتا اور ''انجمن اتحاد و ترقی'' ایک طاقتور سلطنت سے الجھ کر اپنے اقتدار کو خطرہ میں ڈالنا پسند نہ کرے گی۔ 7 اکتوبر 1908ء کو دفعتہً ان صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس وقت کے وقائع نگار مسٹر نائٹ نے لکھا کہ یہ وہی پرانا قصہ تھا۔ یعنی ایک رجعت پسند عیسائی حکومت اس خوف سے کہ اصلاح شدہ ترکی ایک طاقتور ترکی نہ بن جائے۔ فریب کے ذریعہ اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔ آسٹریا کے اس عمل نے رجعت پسندوں کو قدیم نظامِ حکومت کے قائم کرنے کا آخری موقع بہم پہنچایا اور انہوں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ بوسنیا اور ہرزیگووینا کے الحاق سے دو ہی روز قبل رومیلیا کے والی نے جو بلغاریہ کا فرماں تھا، زار بلغاریہ کا قدیم لقب اختیار کر لیا تھا۔ پھر 12 اکتوبر کو کریٹ نے بھی مملکتِ یونان سے اپنے الحاق کا اعلان کر دیا۔

انجمن کا سیاسی پروگرام

اس درمیان میں مجلس ملی (پارلیمنٹ) کے انتخاب کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سلطنت کے ہر حصہ میں دستوری حکومت کے استقبال کے لیے انتہائی جوش و خروش کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ انجمن نے 23 ستمبر کو اپنا سیاسی پروگرام شائع کیا۔ جس کی پابندی انجمن کے اُمیدواروں پر جو منتخب ہو کر آئیں، عائد کی گئی تھی۔ اس پروگرام کی دفعات حسب ذیل تھیں۔

1- کابینہ کو مجلس نائبین (Chamber of Depties) کو جواب دہ ہونا چاہیے۔

2- ترکی زبان بدستور سلطنت کی سرکاری زبان رہے گی۔

3- تمام قوموں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔

4- غیر مسلم بھی فوجی خدمت کے ذمہ دار ہوں گے۔

5- فوجی حکومت کی معیاد میں تخفیف کر دی جائے گی۔

6- جن کسانوں کے پاس زمینیں نہیں ہیں، انہیں زمین حاصل کرنے میں مدد دی جائے گی مگر اس طرح کہ موجودہ زمینداروں کو نقصان نہ پہنچے۔

Marfat.com

7- تعلیم بلا معاوضہ اور جبری ہوگی۔

پارلیمنٹ کا افتتاح

10 دسمبر 1908ء کو سلطان عبدالحمید نے پارلیمنٹ کا افتتاح کیا اور اپنی تقریر میں دستور کے تحفظ کا وعدہ کیا۔ مجلس نائبین میں عیسائی اور دوسری محکوم قوموں کے نمائندے کافی تعداد میں منتخب ہو کر آئے تھے۔ ممبروں نے مجلس کی کارروائیوں اور اپنی تقریروں میں جس قابلیت کا ثبوت دیا، وہ انگلستان کے مدبروں کے لیے خلافِ توقع ثابت ہوئی۔ سلطنتِ عثمانیہ کے باشندے ان کے خیال میں آئینی حکومت کے اہل نہیں تھے۔ ترکی پارلیمنٹ نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا۔

جوابی انقلاب

نوجوان ترکوں نے دستوری حکومت کو کامیاب بنانے کی انتہائی کوشش کی مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد رجعت پسندوں کی سازشیں رنگ لانے لگیں۔ انجمن نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ جاسوسوں کی زبردست فوج کو جن پر بیس لاکھ پونڈ سالانہ خرچ ہوتے تھے، یکم قلم برخاست کر دیا، جس سے ہزاروں آدمی دفعتاً بے روزگار ہو گئے۔ یہ لوگ ذاتی طور پر انجمن کی مخالفت میں کوشاں تھے۔ علاوہ بریں نئی وزارت نے مختلف شعبوں کی اصلاح کے سلسلے میں سینکڑوں آدمیوں کو جو محض قصر یلدیز کے زیر اثر مقرر کر دیے گئے تھے اور درحقیقت بے ضرورت اور بے کار تھے، نکال دیا۔ انہوں نے بھی انجمن کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔ ان کو رجعت پسند ملاؤں کی تائید بھی حاصل تھی۔

"جمعیۃ محمدیہ" کے نام سے ایک نئی انجمن چند دنوں سے قائم کر لی گئی تھی جس کا اثر مسلمانوں میں روز بروز زیادہ پھیلتا جاتا تھا۔ یہ "جمعیۃ" اپنے کو دستوری حکومت کا حامی ظاہر کرتی تھی لیکن عام امور میں وہ صرف شریعتِ اسلامی کا نفاذ چاہتی تھی اور اصولِ شریعت کے خلاف کسی قانون کو گوارا نہیں کرتی تھی۔ "انجمن اتحاد و ترقی" کی اس بنا پر مخالف تھی کہ اس کے نزدیک انجمن کے ممبر جن میں فوج کے نوجوان افسر بھی شامل تھے اور احکامِ قرآنی کے پابند نہ تھے اور اپنے غیر مذہبی طریقوں سے عوام کے لیے ایک بری مثال قائم کر رہے تھے۔ ایک طاقتور جماعت "لبرل یونین" کی تھی جس میں مسلمان، عیسائی اور دوسرے فرقوں کے لوگ شامل تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر فرقہ کو حکومت خود اختیاری کے حقوق دے دیے جائیں تاکہ وہ جس طرح چاہے اپنے معاملات کا انتظام کرے۔ نوجوان ترک جن کا اصل نصب العین اتحاد تھا، "لبرل یونین" کے نظریہ کو ملک کے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ "انجمن اتحاد و ترقی" کے مخالفوں میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جن کو حقیقتاً مذہب سے سروکار نہ تھا، نہ ملکی فلاح و بہبود سے بلکہ وہ دستوری حکومت کے اس وجہ سے دشمن تھے کہ اس میں ان کو رشوت ستانی اور مفت خوری کے وہ مواقع حاصل نہ تھے جن سے وہ دورِ استبداد میں پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ نئی وزارت نے ایک غلطی یہ کی کہ نہ صرف ان سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا جو سلطان کے حکم سے قید کیے گئے تھے بلکہ دوسرے شدید جرائم کے مجرموں کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ یہ جرائم پیشہ گروہ رجعت پسندوں کے لیے ایک اچھا آلۂ کار ثابت ہوا۔

غرض مخالف عناصر تیزی کے ساتھ جمع ہو رہے تھے۔ انجمن کو فوج پر پورا اعتماد تھا مگر وہ بھی رجعت پسندوں کی خفیہ

Marfat.com

کوششوں سے قدیم نظامِ حکومت کی حامی بن چکی تھی۔ انجمن کو اس کا علم اس وقت ہوا جب 13 اپریل 1909ء کو قسطنطنیہ کے فوجی دستوں میں دفعتاً بغاوت برپا ہوگئی۔ باغیوں میں کوئی لیڈر ایسا نہ تھا جو خاص شہرت یا اثر رکھتا ہو۔ سلطان عبدالحمید نے بظاہر اس شورش میں کوئی حصہ نہ لیا تاہم ابتدا میں باغی کامیاب رہے۔ وزیروں پارلیمنٹ کے ممبروں اور "انجمن اتحاد و ترقی" کے دوسرے ممبروں کو اپنی جان بچانے کے لیے قسطنطنیہ سے بھاگنا پڑا۔ فوج نے پارلیمنٹ ہاؤس پر قبضہ کر لیا اور اپنے متعدد افسروں کو جو انجمن کے ممبر تھے، قتل کر دیا۔ وزیر عدالت بھی قتل ہو گئے۔ وزیر بحریہ پر گولی چلی مگر وہ زخمی ہو کر بچ گئے۔ اس کے علاوہ نوجوان ترکوں کی ایک بڑی تعداد ماری گئی۔ انجمن کے دشمنوں نے اس بغاوت کو گہرا مذہبی رنگ دے دیا تھا۔ مشہور ترکی مصنفہ خالدہ ادیب خانم لکھتی ہیں کہ یہ بڑی خونریز اور ناپاک شورش تھی۔ بہت سے نوجوان محض اس لیے قتل کر دیے گئے کہ وہ کالر لگاتے تھے۔ کالر لگانا مذہب کی شدید مخالفت سمجھا جاتا تھا۔

بغاوت کا استیصال

بغاوت کی خبر جب سالونیکا پہنچی تو "انجمن اتحاد و ترقی" نے فوراً محمود شوکت پاشا کو جو افواجِ مقدونیہ کے سپہ سالار تھے، قسطنطنیہ کی طرف بھیجا۔ سان اسٹیفانو کے مقام پر محمود شوکت کی ان وزیروں اور پارلیمنٹ کے ممبروں سے ملاقات ہوئی جو قسطنطنیہ سے بھاگ کر آئے تھے۔ وہیں پارلیمنٹ کا اجلاس کیا گیا اور ممبروں نے متفقہ طور پر محمود شوکت پاشا کی یہ تجویزیں منظور کیں کہ فوجی قانون جاری کر دیا جائے۔ باغیوں کو سزائیں دی جائیں اور قسطنطنیہ کا فوجی دستہ توڑ دیا جائے۔ 25 اپریل کو محمود شوکت پاشا اپنی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ میں داخل ہوئے۔ پانچ گھنٹے کی سخت لڑائی کے بعد جس میں توپیں بھی چلیں، باغی فوج مغلوب ہوگئی۔ بغاوت کے بانیوں کو سخت سزائیں ملیں۔ ان کے چالیس بڑے لیڈروں کو منظرِ عام پر پھانسی دے دی گئی۔

سلطان کی معزولی

27 اپریل کو مجلسِ ملی کا اجلاس منعقد ہوا اور سب سے پہلے اس کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ سلطان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ رائے عامہ کا فیصلہ یہ تھا کہ اس بغاوت میں درپردہ سلطان کی حمایت شامل تھی گو بظاہر اس نے باغیوں کی کسی طرح کی مدد نہیں کی تھی۔ شیخ الاسلام سے استفسار کیا گیا۔ اس نے معزولی کا فتویٰ دیا۔ اس فتوے کے بعد مجلسِ ملی نے بالاتفاق سلطان کی معزولی کی تجویز منظور کر لی اور اپنے فیصلے کی اطلاع دینے کے لیے ایک وفد قصر یلدیز کو روانہ کیا۔ جوابی انقلاب کی ناکامی کے بعد سلطان "انجمن اتحاد و ترقی" کے رحم و کرم پر تھا۔ اس نے مجلسِ ملی کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور خاموشی کے ساتھ تخت سے علیحدہ ہوگیا۔ دوسرے روز وہ سالونیکا روانہ کر دیا گیا اور وہاں 1918ء میں اپنی وفات تک نظربند رہا۔ مجلسِ ملی نے اس کے بھائی شہزادہ محمد رشاد کو جو تیس سالوں سے نظربندی کی زندگی گذار رہا تھا محمد خامس کے نام سے تخت پر بٹھا دیا۔

سلطان عبدالحمید ثانی کے روشن کارنامے

سلطان عبدالحمید ثانی بھی عام انسانوں کی طرح تھا۔ اس نے دولتِ عثمانیہ پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے ساری

Marfat.com

حدود پار کر دی تھیں ۔اس کے باوجود اس سے اچھے کام بھی سرزد ہو گئے ۔سلطان نے عربوں کو بہت سی مراعات دیں ۔ان کو حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔فوجوں میں بھرتی کیا گیا۔عراق ،شام اور حجاز کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی ۔عرب صوبوں میں مدرسے قائم کیے گئے ۔دمشق اور مدینہ کے درمیان نو سو میل لمبی حجاز ریلوے تعمیر کی گئی ۔یہ کوئی معمولی بات نہ تھی ۔بغداد ریلوے کی تعمیر کا کام بھی شروع ہوا۔حجاز ریلوے کی تعمیر کتنا مشکل کام تھا۔اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جنگ عظیم اول میں جب عربوں پر قومیت کا بھوت سوار ہوا تو انہوں نے حجاز ریلوے کی پٹڑی اکھاڑ دی تو یہ ریلوے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے بعد بھی عربوں سے تعمیر نہ ہو سکی ۔

صیہونی تحریک کا بانی (1860ء تا 1904ء) آسٹریا کا باشندہ تھا اور اس کا نام ہرزل تھا ۔اس نے سلطان عبدالحمید سے ملاقات کی اور سلطان کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی ۔اس وقت عثمانی خلافت شدید قسم کی مالی مشکلات میں مبتلا تھی ۔ہرزل نے سلطان کو یقین دلایا کہ اگر عثمانی حکومت یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دے دے تو یہودی عثمانی خلافت کو مالی امداد فراہم کر دیں گے ۔اس یہودی رہنما نے سلطان کو اپنا ہم نوا بنانے کی چھ سال تک کوشش کی لیکن سلطان نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ڈاکٹر ہرزل کو فلسطین میں ایک یہودی ریاست قائم کرنے کی کوشش کو ترک کر دینا چاہیے ۔یہودیوں کو فلسطین اس وقت مل سکتا ہے جب عثمانی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے ۔

Marfat.com

اختتامیہ

سابقہ صفحات میں ہم نے ملت اسلامیہ کے منفی کرداروں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے قدرے تفصیل سے کام لیا ہے۔ ان کرداروں کے ہاتھوں امتِ مسلمہ کا زوال شروع ہوا اور یہ زوال وقت کے ساتھ مختلف صورتیں اختیار کرتا گیا۔ پہلے درجے پہ یہ ہوا کہ بنوامیہ اور بنوعباس کے خلیفے، اندلس اور دولتِ ترکیہ کے سلاطین اور ہندوستان کے بادشاہ سب مسلمان تھے لیکن چند استثنائی صورتوں کے علاوہ حکومت کے معاملات شریعت اسلامی کے مطالبات کے برعکس اپنی مرضی اور ذاتی ضرورت کے مطابق چلاتے رہے اور ملت اسلامیہ کو جوہرِ اسلام یعنی خلافت راشدہ کے نظام سے کوسوں دور لے گئے لیکن مسلمان کسی دوسری قوم کے غلام ہونے سے بچے رہے اور ان کا نظامِ علم و عرفان بھی بڑی حد تک علیٰ حالہٖ قائم رہا اور علمائے حق اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان حکومتوں کو راہ راست پر رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ دوسری طرف یہ حکومتیں فوج اور خزانے کے بل بوتے پر دنیا کے نقشے پر خم ٹھونک کر کھڑی رہیں۔

زوال کا دوسرا مرحلہ اس وقت آیا جب وقت کے ساتھ ساتھ ان حکومتوں کی اخلاقی بنیادیں بیٹھ گئیں اور مسلمان قوم غیر قوموں کے زیرنگیں ہو گئی۔ غیروں نے ملت اسلامیہ کے علم و عرفان کے مراکز تباہ کر دیے لیکن باہمت علماء اور صوفیا نے عوام میں راہ نجات یعنی اسلام کی قندیل کی روشنی کو مدہم نہ ہونے دیا بلکہ ایسا بھی ہوا کہ مسلمان محکوم ہو گئے لیکن اسلام نے مسلمانوں کو محکوم بنانے والے لشکروں کو فتح کر لیا۔

زوال کا تیسرا مرحلہ اس وقت رونما ہوا جب مسلمان غیر قوموں کے محکوم ہو جانے کے بعد عمومی طور پر اپنے علم و عرفان سے بھی محروم ہو گئے اور رادبار و انحطاط کی وجہ سے اسلامی کیا عام انسانی معیارات سے بھی دست کش ہو گئے اور ملت اسلامیہ نے حالات کے ساتھ صلح کرتے ہوئے بدیشی حکمرانوں کے سامنے گردنیں ڈال دیں۔ زوال کی یہ انتہائی صورت ہے جس میں اب ملت اسلامیہ گرفتار ہی نہیں، اپنی بزدلی کی وجہ سے باطل اور ہمہ جہتی بیرونی غلبہ کے خلاف جدوجہد کے فقدان کی وجہ سے بے دست و پا ہو چکی ہے۔ ہم اس بات کا تعین نہیں کر سکتے کہ ملت اسلامیہ کے کس علاقے میں کس زمانے میں زوال کی شدت میں زیادتی اور تیزی تھی یا ہے، عروج کی طرح زوال بھی تاریخ کا دھارا ہے جس نے ملکوں اور قوموں کی کمزوریوں کے حساب سے اپنے رخ اور تندی و تیزی کا فیصلہ کیا ہے۔

ملت اسلامیہ جب زوال سے ہمکنار ہو رہی تھی اس وقت حالت کیسی بھی خراب و خستہ سہی، حکومت مسلمانوں کی تھی اور

Marfat.com

اپنی تھی۔ اپنے فسق وفجور کے باوجود بادشاہ حرمات وشعائر اللہ کی توہین کی جرأت نہیں کر سکتے تھے چونکہ علما حق کا گروہ ہر دور میں موجود رہا۔ اس لیے وہ موقع ومحل کے مناسب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ پوری جرأت اور بے باکی سے ادا کرتے رہے۔ اس طرح کسی نہ کسی حد تک صورت حال کی اصلاح ہو جاتی تھی۔ خلیفہ ذاتی طور پر کیسا ہی ظالم وجابر ہوتا علما حق کے سامنے اسے بھی جھکنا پڑتا۔ یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ خاص خاص مواقع پر علما کے اثر نے حکومتوں میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔

سلیمان بن عبدالملک نے بڑی کوشش کی کہ اس کا کوئی بیٹا ولی عہد بنا دیا جائے۔ وہ قد اور عمر کے چھوٹے تھے. سلیمان انہیں بڑے بڑے کپڑے پہنا کر دیکھتا کہ بڑے نظر آئیں اور ولی عہد کے معیار پر پورے اتر سکیں۔ مشہور تابعی رجا بن حیوۃ نے سلمان کو اس مخمصے سے نکالا اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا نام پیش کر دیا، جسے سلیمان نے فوراً تسلیم کر کے اپنا جانشین مقرر کر دیا اور اپنی زندگی میں ان کے لیے بیعت لے لی۔ رجاء بن حیوۃ کے اس جرأت مندانہ مشورے نے ایک مرتبہ پھر سے ملوکیت خلافتِ راشدہ کا دلنواز منظر پیش کرنے لگی۔

حجاج بن یوسف کی شعلہ مزاجی سے ہر کوئی خائف رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے سامنے امام حسینؓ کا ذکر آیا تو بولا ''وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذریت میں داخل نہیں تھے، اس مجلس میں مشہور تابعی عالم یحییٰ بن یعمر بھی موجود تھے، انہوں نے فرمایا تو جھوٹ بولتا ہے۔ حجاج نے کہا: اس کو یا تو قرآن سے ثابت کرو ورنہ گردن اڑا دوں گا۔ اب حضرت یحییٰ بن یعمر نے آیت ''**ومن ذریتہ داؤد وسلیمان**'' پڑھی اور فرمایا کہ جب اس آیت کے بموجب حضرت عیسیٰ ماں کے رشتے سے حضرت آدم کی ذریت میں داخل ہیں تو امام حسینؓ ماں کے توسط سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذریت میں کیوں داخل نہیں۔ حجاج پر یحییٰ بن یعمر کی حق گوئی کا ایسا اثر ہوا کہ بولا: سچ کہتے ہو۔ میں اس آیت کو پڑھتا تھا مگر کبھی ذہن ادھر منتقل نہیں ہوا۔ بخدا یہ استنباط تو بہت ہی عجیب وغریب ہے۔

دوسرا واقعہ بھی سنیے۔ حجاج نے یحییٰ بن یعمر سے دریافت کیا کہ میں لحن یعنی اعراب میں غلطی نہیں کرتا۔ یحییٰ نے اس کا نہایت بلیغ جواب دیا: فرمایا: "**ترفع ما یخفض وتخفض ما یرفع**" حجاج کے سوال کے مطابق اس جملہ کا ایک مطلب تو یہ تھا کہ تم کسرہ کی جگہ رفع اور رفع کی جگہ کسرہ پڑھ دیتے ہو مگر اس کا دوسرا مطلب یہ بھی نکلتا تھا کہ تُو بے انصاف اور ظالم ہے جو پستی کے مستحق کو بلندی دیتا ہے اور سربلندی کے حق دار کو ذلیل وخوار کرتا ہے۔ تاریخوں میں آتا ہے کہ حجاج اس حق گوئی پر اس درجہ مسرور ہوا کہ یحییٰ بن یعمر کو خراسان کا قاضی مقرر کر دیا۔

امام اوزاعی شام کے امام تھے۔ ایک مرتبہ عباسی خلیفہ سفاح کے چچا عبداللہ بن علی نے ان سے دریافت کیا ''ہم نے بنو امیہ کی جو خون ریزی کی ہے، اس کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟'' امام نے پہلے تو ٹالنا چاہا مگر جب اصرار ہوا تو انہوں نے صاف صاف فرمایا ''بخدا ان لوگوں کا خون تم پر حرام تھا، عبداللہ بن علی انتہا درجہ کا تند مزاج اور درشت خو تھا، اس جواب کو سن کر غصہ کے مارے لال پیلا ہو گیا۔ بولا: تم نے ایسا کیونکر کہا۔ امام عالی مقام نے جواب دیا: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد حق بنیاد ہے کسی مسلمان کا خون اس وقت تک جائز نہیں جب تک تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت نہ پیش

آئے۔ یا تو شادی شدہ ہو کر زنا کرے، یا قاتل ہو اور یا مرتد ہو جائے"۔ جب عبداللہ بن علی نے پوچھا: کیا ہماری حکومت دینی نہیں ہے؟ امام نے سوال کیا یہ کیونکر؟ عبداللہ نے کہا: "کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علیؓ کے لیے وصیت نہیں کی تھی"۔ امام نے فرمایا: "اگر وصیت کی ہوتی تو حضرت علیؓ کسی کو اپنی طرف سے حکم نہ بناتے۔ اس گفتگو کے بعد امام کو صرف توقع ہی نہیں یقین تھا کہ ان کی گردن اڑا دی جائے گی لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ عبداللہ بن علی نے اگرچہ اس وقت بگڑ کر امام کو دربار سے نکلوا دیا مگر بعد میں ایک بڑی رقم کی تھیلی بطورِ نذرانہ ارسال کی جسے امام نے اسی وقت مستحقین میں تقسیم کر دیا۔

ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید اور شہزادے، امام مالک کے حلقہ درس میں گئے۔ خلیفہ نے کہا کہ حدیث کی قراءت میں کروں گا۔ آپ سُنئے مگر شرط یہ ہے عام سامعین کو اپنے حلقہ سے باہر کرنا ہوگا۔ امام مالک نے فرمایا: اگر خواص کی خاطر عوام کو محروم کر دیا جائے گا تو پھر خواص کو بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ جواب دے کر اپنے شاگرد کو حکم دیا کہ حدیث کی قراءت شروع کر دیں۔ انہوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور خلیفہ کو خاموش ہو جانا پڑا۔

علماءِ حق اپنے اسی دلیرانہ طرزِ عمل سے استبدادی نظامِ حکومت کے مفاسد کو وسیع ہونے سے روکنے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ عباسی خلیفہ ہادی نے وفات سے پہلے چاہا کہ اپنے بیٹے کو اپنا قائم مقام بنا کر اپنے بھائی ہارون رشید کو خلافت سے محروم کر دے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک مجلس طلب کی، جس میں ہرثمہ بن اعین بھی تشریف رکھتے تھے۔ جب اصل معاملہ پیش ہوا تو سب حاضرین نے خلیفہ کا رجحانِ طبع دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی مگر ہرثمہ بن اعین نے کہا "اے خلیفہ تیرے باپ نے تجھے اور ہارون کو رشید دونوں کو ولی عہد بنایا تھا۔ پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تو جو اپنے بیٹے کے لیے بیعت لے رہا ہے وہ زیادہ قوی ثابت ہوگی بہ نسبت اس بیعت کے جو تیرے باپ نے ہارون کے لیے لی تھی۔ جو شخص پہلی بیعت توڑ سکتا ہے دوسری بیعت کو بھی توڑ سکتا ہے حالانکہ معاملہ بیٹے کا تھا۔ خلیفہ ہادی ہرثمہ کی حق گوئی سے بددل نہیں ہوا اور اس نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا "تم سب کا بُرا ہو تم نے مجھے دھوکہ میں رکھا۔ صرف میرے آقا ہرثمہ ہیں جنہوں نے میری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا، ہرثمہ کی یہ جراٴت بیاں اُمت کو بہت بڑے فتنے سے بچانے میں کامیاب ہوگئی"۔

مامون رشید نے ایک دفعہ فرمان لکھوایا کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ پر لعنت بھیجی جائے۔ قاضی یحییٰ بن اثم کی بروقت مداخلت سے مامون کو یہ فرمان واپس لینا پڑا۔ اسی طرح مامون پر شیعیت کا غلبہ ہوا تو اس نے نکاح متعہ کے جواز کا حکم دے دیا۔ قاضی صاحب کو اس کی خبر ہوئی تو مامون کو سمجھایا کہ قرآنی نص کے مطابق نکاحِ متعہ اور زنا دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مامون نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور فوراً متعہ کی حرمت کا اعلان کر دیا۔

یہ صورتِ حال صرف بنوامیہ اور بنوعباس کے ساتھ مخصوص نہ تھی جہاں بھی مسلمان حکمران ہوئے علماءِ حق انہیں راہِ حق پر قائم رکھنے کے لیے ہمیشہ پوری جراٴت اور مستعدی سے ان کی بے اعتدالیوں کا پردہ چاک کر کے ملتِ اسلامیہ کو فتنوں سے بچاتے رہے۔ مصر کا مشہور فرمانروا رکن الدین بیبرس بڑے جاہ وجلال کا بادشاہ تھا۔ ایک مرتبہ اس نے جہاد کے لیے مسلمانوں سے مقررہ رقم کے علاوہ کچھ مزید رقم جمع کرنی چاہی، صحیح مسلم کے شارح علامہ نودی نے اس کی مخالفت کی اور سلطان

Marfat.com

سے کہا : مجھ کو معلوم ہے تو امیر بند قدار کا زرخرید غلام تھا اور ایک جبہ کا بھی مالک نہیں تھا، اب اللہ نے تجھ کو سلطنت دے دی ہے اور تو نے ہزاروں غلام خرید ڈالے ہیں. جن کے تمام سامان طلائی ہیں نیز تیرے محل میں سو کنیزیں ہیں جو زر و جواہر سے لدی ہوئی ہیں ۔جب تک مجھ کو معلوم نہ ہو جائے کہ سب قیمتی چیزیں تُو نے جہاد کے اخراجات کے لیے اپنے غلاموں اور باندیوں سے لے لی ہیں. اس وقت تک میں غریب مسلمانوں کے مال سے لینے کا فتویٰ تیرے حق میں نہیں لکھ سکتا۔ بیبرس علامہ کی اس حق گوئی سے ناراض ہو گیا اور ان کو شہر بدر کر دیا۔ بعد میں اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے حکم منسوخ کر کے علامہ کو پھر دمشق میں آنے کی اجازت دے دی مگر اقلیم علم کے سلطان کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ جب تک بیبرس موجود ہے. میں نہیں آؤں گا۔ اس واقعہ کے ایک ماہ بعد ہی بیبرس کی وفات ہو گئی۔

عباسی خلیفہ مصر مکتفی باللہ کے عہد میں ذمی رعایا نے ایک درخواست دی کہ ذمی ہونے کی حیثیت سے ہم پر جو پابندیاں لگی ہوئی ہیں، وہ اٹھالی جائیں اور اس کے عوض ہم سات لاکھ دینار سالانہ ادا کرتے رہیں گے۔ وزیر اور خلیفہ دونوں کا رجحان تھا کہ اس درخواست کو قبول کر لیں لیکن علامہ ابن تیمیہ نے اس میں مداخلت کر کے فرمایا : شریعت اسلام کے احکام کسی قیمت پر فروخت نہیں ہو سکتے۔ خلیفہ کو مجبوراً امام کے فتوے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا اور خلیفہ نے ذمیوں کی درخواست مسترد کر دی۔

آل عثمان کے مشہور فرمانروا سلیم اول نے ایک مرتبہ اپنی سلطنت کے مفتی اعظم سے دریافت کیا، ملکوں کو فتح کرنا بہتر ہے یا قوموں کو مسلمان بنانا۔ شیخ نے کہا : قوموں کو مسلمان بنانا۔ سلطان نے یہ سن کر اعلان کرا دیا کہ میری مملکت میں جو شخص مسلمان نہیں قتل کر دیا جائے گا۔ اب مفتی اعظم کو اس اعلان کی خبر ہوئی تو فوراً سلطان کی خدمت میں پہنچے اور بتایا کہ آپ کا یہ حکم قرآن کے خلاف ہے۔ غیر مسلموں سے جزیہ لے کر مذہب کے معاملہ میں ان کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ مفتی اعظم شیخ جمال کی اس تصریح کے بعد سلطان نے اپنا حکم واپس لے لیا اور مسلمان ایک عظیم گناہ سے بچ گئے۔

علامہ عز الدین بن عبد السلام ساتویں صدی ہجری کے نامور علما میں سے ہیں، ان کو تحقیق سے جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ مما لیک بحریہ سلطان مصر کے زرخرید غلام ہیں اور آزاد کردہ نہیں ہیں تو علامہ نے اعلان کر دیا کہ ان غلاموں کے تمام تصرفات خود مختارانہ ناجائز ہیں ۔ اپنے ان غلاموں کو حکم دیا کہ میں تم کو فروخت کروں گا، علامہ کے احباب نے بہت کہا کہ آپ کا یہ اقدام خطرہ سے خالی نہیں مگر وہ نہ مانے۔ آخر کار مصر کا نائب السلطنت جو غلام تھا، چند مددگاروں کی جماعت ہمراہ لے کر قتل کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ مکان پر پہنچ کر آواز دی۔ علامہ باہر تشریف لائے تو ان کی صورت دیکھتے ہی نائب السلطنت کانپ اٹھا، رو کر بولا : مولانا آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا : میں تم لوگوں کو فروخت کروں گا کیونکہ تم بیت المال کی ملکیت ہو چنانچہ ایسا ہی کیا۔

غرض تاریخ کے صفحات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ علماء حق اور صوفیا کرام نے مسلمان حکمرانوں کو بے راہ ہونے سے بچانے کے لیے پوری جزرسی، جرأت اور جاں نثاری سے اپنا کام جاری رکھا۔ اگر حکمران بھی علماء اور صوفیا کی طرح اپنے فرائض کو مکمل طور پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں سرانجام دیتے تو بنی امیہ اور بنو عباس کے

Marfat.com

حکمران، اندلس کے سلاطین اور ہندوستان کے بادشاہ اوران سب ممالک کے عوام اس انجام سے دوچار نہ ہوتے جو تاریخ اقوام عالم کا حصہ ہے۔حکمران تعیش پسندی، عافیت کوشی، زراندوزی اور بیت المال کو شیر مادر سمجھتے رہے۔زمانے کی روش دیکھ کر کسی حد تک صاحبانِ علم وعرفان بھی مصلحت اندیش ہوتے گئے۔جس طرح حکمرانوں نے شجاعت و بسالت سے رخ پھیر لیا، اسی طرح ان کے عوام بھی اس جوہر سے خالی ہو گئے چنانچہ اندلس سے لے کر مصر تک دہلی سے لے کر بغداد تک دنیائے اسلام چنگیزیوں اور عیسائیوں کے قبضے میں چلی گئی۔علاؤ الدین خوارزم شاہ اور اس کا بیٹا جلال الدین خوارزم شاہ چنگیزیوں سے جان بچانے کے لیے جائے پناہ تلاش کر رہے تھے۔آخری خلیفہ معتصم باللہ کو بھینسے کی کھال میں سیا جا رہا تھا اور مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر ہمایوں کے مقبرہ سے باہر نکلتے ہوئے ایک کافر سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا اور اندلس کا فرمانروا ابشارات کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنی والدہ کے سامنے اپنے حال پر آنسو بہا رہا تھا۔یہ سب کچھ مسلمان حکمرانوں کی بداعمالیوں کا نتیجہ تھا۔اس انجام کی آمد کو ئی بھی نہ روک سکا، وہ اس لیے کہ نام نہاد سلاطین وخلفا کے جگر تک بزدلی اور دنائیت اتر چکی تھی۔یہ نتیجہ تھا اس پہاڑ سے بڑی غلطی کا کہ انہوں نے اسلامی روح اور عمل سب کچھ پس پشت ڈال دیا تھا۔دوسرا دورِ زوال جہاں ملت اسلامیہ کی محکومی کی اطلاع دے رہا تھا، وہیں اس دور میں ایسے افراد منصہ شہود پر آئے جنہوں نے اپنے علم وعرفان اور تخت وتاج کی طاقت سے اس دورِ زوال کو بڑی حد تک بے اثر کر دیا۔

سلطان شمس الدین التمش کی سلطنت کی وسعت اور اس کی ملکی وسیاسی مصروفیات کا حال تاریخ ہندوستان کا ہر طالب علم جانتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اس کی انتظامی مشغولیت شاہانہ ضروریات ومطالبات جنگوں اور اناری کی کثرت اس کی مذہبی پابندی اور معمولات میں مطلق حارج نہ تھی۔حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے وصیت فرمائی تھی میری نماز جنازہ وہ شخص پڑھائے جس کی کبھی عصر کی سنتیں اور تکبیرِ اولی فوت نہ ہوئی ہو۔جب اس وصیت کا اعلان کیا گیا تو سلطان آگے بڑھا اور اس نے نماز پڑھائی۔

سلاطین گجرات بالخصوص دین ودنیا کی جامعیت کا بہترین نمونہ تھے۔اس امر کی بہترین شہادت کے لیے ہم محمود شاہ اول (917ھ) اور اس کے بیٹے مظفر شاہ حلیم (932ھ) کے حالات پیش کرتے ہیں۔

محمود شاہ کے بعد اس کا بیٹا مظفر شاہ حلیم تاج وتخت کا مالک ہوا۔اپنے وقت کے بہترین علماء سے قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کی اور قرآن حفظ کرنے کے کیا کہنے، یہ سعادت بھی اسے ایام جوانی میں حاصل ہوئی۔ہمیشہ باوضو رہتا تھا۔نماز جماعت کے ساتھ پڑھتا، روزے عمر بھر نہیں چھوڑے۔شراب کو کبھی منہ سے نہیں لگایا، کبھی کسی پر بے جا سختی نہیں کی، بدزبانی سے اپنے منہ کو کبھی گندہ نہیں کیا، تمام عمر نصوص حدیث پر عمل رہا۔غرض تقویٰ اور عزیمت کی دولت بھی خداداد پائی تھی۔

اس پیکر تقدس میں سپہ گری اور ملک داری کی صفات بھی درجہ کمال تک پہنچی ہوئی تھیں۔مالوہ کی فتوحات اس کے اخلاق فاضلہ کی مظہر ہیں جس وقت محمود شاہ دوم مالوہ کی غفلت اور سوء تدبیر سے اس کے وزیر مندلی رائے نے زمام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور محمود شاہ کو بے دخل کر دیا، شعائر اسلام کو مٹا کر کفر کی رسوم کو ترجیح دینی شروع کر دی۔مظفر شاہ حلیم کی رگ حمیت کو جنبش ہوئی، وہ اپنی افواج کے ساتھ مالوہ کی طرف چل پڑا اور منزلیں مارتا ہوا مانڈو پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔

Marfat.com

مندلی رائے میں مقابلے کی ہمت نہ تھی۔اس نے تحفہ تحائف کا لالچ دے کر رانا سانگا کو اپنی مدد کے لیے بلایا۔وہ ابھی سارنگ پور تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ مظفر شاہ حلیم نے رانا سانگا کے پہنچنے سے پہلے قلعہ فتح کر لیا اور مندلی رائے کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

تسخیر قلعہ کے بعد جس وقت مظفر شاہ اندر داخل ہوا اور ہم رکاب امرا نے شاہانِ مالوہ کے تجمل اور خزائن و دفائن کو ملاحظہ کیا اور اس ملک کی شادابی اور سرسبزی کی اطلاع پائی تو انہوں نے جسارت کر کے مظفر شاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس جنگ میں تقریباً دو ہزار سوار درجہ شہادت کو پہنچے ہیں، یہ مناسب نہیں کہ اس قدر نقصان اٹھانے کے بعد پھر ملک اسی بادشاہ کے حوالے کر دیا جائے جس کی سوءِ تدبیر سے مندی رائے نے اس پر قابو پالیا تھا۔بادشاہ نے یہ بات سُنتے ہی سیر موقوف کی اور قلعہ سے باہر نکل کر محمود شاہ کو ہدایت فرمائی کہ اس کے ہم رکاب لوگوں میں سے کسی کو قلعہ کے اندر نہ جانے دیا جائے۔محمود شاہ نے قلعہ میں بادشاہ کے چند روزہ قیام کے لیے بڑی التجائیں کیں مگر مظفر شاہ حلیم نے اسے قبول نہ فرمایا اور بعد کو خود ظاہر کیا کہ میں نے جہاد محض خداوند برحق کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے کیا تھا، مجھ کو امرا کی گذارشات سے اندیشہ ہوا کہ یہاں کوئی خطرہ ہے، فاسد خیال میرے دل میں پیدا ہوا اور میرا اخلاصِ نیت برباد ہو جائے میں نے محمود پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ محمود کا مجھ پر احسان ہے کہ اس کی وجہ سے مجھ کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔

انتقال کے قریب علماء اور ارکان دولت کی ایک مجلس میں بادشاہ نے تحدیث نعمت کے طور پر بیان کیا کہ خدا کے فضل و کرم سے قرآن پاک کے حفظ کے ساتھ ہر آیت کے متعلق ضروری مسائل و احکام، اسباب نزول اور اصولِ تجوید کا علم رکھتا ہوں۔میں نے علامہ جلال الدین بن عمر استاد محترم سے حدیث کی سند لی تھی، وہ مع متن صحیح و سند راویوں کے حال کے مجھے حفظ ہیں، فقہ میں مجھے بفضل تعالیٰ وہ درک حاصل ہے (حدیث کے مطابق جس کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کا فقیہہ بنا دیا ہے) کا مصداق بننے کی امید رکھتا ہوں اور اب چند مہینوں سے حضرت صوفیا و مشائخ کے طریق پر تزکیہ نفس میں مشغول ہوں اور ان سے برکات کی امید رکھتا ہوں۔تفسیر "معالم التنزیل" ایک بار ختم کر چکا ہوں، دوبارہ پھر شروع کی ہے۔نصف تک پہنچ گیا ہوں، باقی اُمید ہے انشاءاللہ جنت میں ختم کروں گا"۔

جمعہ کی نماز کے قریب احتضار کی کیفیت شروع ہوئی، لوگوں کو حکم دیا کہ نماز پڑھنے جائیں اور ظہر کی نماز پڑھی اور کہا کہ ظہر کی نماز میں نے تمہارے یہاں پڑھی ہے۔عصر کی نماز انشاءاللہ جنت میں پڑھوں گا۔انتقال کے وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ دُعا زبان پر تھی جو اس درویش بادشاہ کے حسب حال تھی۔

> "پروردگار تُو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا۔اے آسمان و زمین کے بنانے والے تُو ہی میرا کارساز ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ایسا کیجیو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں"۔

اب ہم شیر شاہ سوری (752ھ) کے معمولات و مشغولات کے متعلق کچھ عرض کرتے ہیں۔شیر شاہ کو صرف پانچ سال حکومت کرنے کا موقع ملا۔اسے پانچ سال میں ایک صدی کا کام کرنا تھا، اس نے رعایا کی خدمت کے لیے انتظامی اور سیاسی

Marfat.com

مشغولیت کی انتہا کر دی۔ ایک لمحہ بھی کسی ایسے کام میں صرف کرنے کا روادار نہیں تھا جو اس کی دنیا یا آخرت کو سنوارنے والا نہ ہو۔ مورخین لکھتے ہیں کہ شیر شاہ تہائی رات رہتی کہ بیدار ہو جاتا، غسل کرتا اور نوافل پڑھتا۔ نماز فجر سے پہلے اوراد و وظائف ختم کر لیتا۔ پھر مختلف صیغوں کے حسابات دیکھتا اور دن کے اہم کاموں کے متعلق حکام و اہل کاران سلطنت کو ہدایت دیتا اور روزانہ کا نظام عمل بتلاتا تاکہ دن کو سوالات سے اس کو پریشان نہ کریں۔ اس سب سے فارغ ہو کر نماز فجر کے لیے وضو کرتا اور جماعت کے ساتھ نماز فجر پڑھتا، پھر اذکار و اوراد میں مشغول ہو جاتا۔ اتنے میں حکام سلام کے لیے حاضر ہوتے۔ بادشاہ نماز اشراق سے فارغ ہو کر لوگوں کی ضروریات معلوم کرتا اور گھوڑے، علاقے، جاگیریں اور مال جس کی جیسی ضرورت ہوتی دیتا، پھر اہل مقدمہ اور دادخواہوں کی طرف متوجہ ہوتا اور دادرسی اور حاجت براری کرتا، پھر افواج شاہی اور اسلحہ کا معائنہ کرتا اور فوج کے لیے امیدواروں کی قابلیت کا اندازہ کر کے ان کے تقرر کا حکم دیتا، پھر ملک کی روزانہ آمدنی اور مالیہ کا معائنہ کرتا۔ پھر ارکان سلطنت امرا اور سلطنتوں کے سفرا اور وفود حاضر ہوتے۔ ان سے گفتگو کرتا، پھر حکام اور اہل کاروں کی عرضیاں گزرتیں۔ ان کی سماعت کرتا اور حکم لکھواتا۔ پھر دوپہر کا کھانا تناول کرتا۔ علماء اور مشائخ بھی دسترخوان پر ہوتے۔ پھر ظہر کی نماز تک دو گھنٹے اپنے ذاتی کام انجام دیتا اور قیلولہ کرتا۔ پھر ظہر کی نماز جماعت سے پڑھتا۔ اس کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ اس سے فارغ ہو کر پھر امور سلطنت میں مشغول ہو جاتا۔ سفر و حضر میں اس نظام الاوقات میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بڑا آدمی وہ ہے جو اپنا پورا وقت ضروری کاموں میں صرف کرے۔

بادشاہ اورنگ زیب کے تفصیلی حالات پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ دنیا دار بادشاہ جو کابل و قندھار سے لے کر دکن تک حکومت کرتا تھا اور اس پوری وسیع سلطنت کی بذات خود نگرانی کرتا تھا۔ اپنی عالی ہمتی اور عزم کی قوت سے اتنا وقت نکال لیتا کہ تمام مہمات ملکی کے ساتھ اول وقت جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ادا کرتا تھا۔ سنن و نوافل کی پابندی کرتا تھا۔ سخت گرمی میں رمضان کے پورے روزے رکھتا تھا اور رات کو تراویح پڑھتا تھا۔ رمضان کے عشرہ اخیر میں مسجد میں اعتکاف کرتا تھا۔ ہر ہفتہ جمعہ سمیت تین روزے رکھتا تھا۔ ہمیشہ باوضو رہتا تھا۔ اذکار و اوراد کا پابند تھا۔ روزانہ صبح قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا اور تمام ملکی و سیاسی مشاغل ارتکاز طبیعت اور دلجمعی کے ساتھ سرانجام دیتا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد اطہار کی صحبت میں پوری یکسوئی سے شامل ہوتا اور استفادہ باطنی سے سرفراز ہوتا۔ روزانہ کی مصروفیات کے ساتھ وہ اتنا وقت نکال لیتا تھا کہ فتاویٰ عالمگیری کا جو اس کے حکم سے علماء ترتیب دے رہے تھے روز کا روز سنتا تھا اور مشورے دیتا تھا۔

عالمگیر کی تخت نشینی سے لے کر 90 سال کی عمر میں وفات تک پورا زمانہ پر آشوب تھا۔ اتنی وسیع سلطنت کو سنبھالنا بغاوتوں کو فرو کیے رکھنا اور پورے پچاس سال اس کار عظیم میں جتے رہنا پورے ملک کے عوام کو جو اکبر کے دور سے بگڑنے شروع ہوئے تھے اور شاہ جہاں تک آگے ہی آگے بڑھتے گئے تھے، منکرات میں مگن رہنا ان کا پسندیدہ مشغلہ بن چکا تھا انہیں ترغیب و ترہیب سے راہ راست پر لانا۔ یہ عالمگیر کی عزیمت تھی کہ اس زمانہ میں جب اس کو سر اٹھانے کی مہلت نہ تھی اس نے قرآن مجید حفظ کرنے کے لیے وقت نکال لیا اور اپنی کتاب "اربعین" کی جس میں اس نے چالیس حدیثیں جمع کی تھیں۔

Marfat.com

شرح لکھی ۔ عالمگیر کا شعر ہے

غم عالم فراواں است و من یک غنچہ دارم
چناں در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیاباں را

لیکن اس نے اس شیشۂ ساعت میں جس طرح اس ریگ بیاباں کو بند کیا وہ اس کی مندرجہ بالا خصوصیات سے ظاہر ہے۔

ہندوستان سے نکل کر اب ہم مصر اور شام کا رخ کرتے ہیں۔ دولتِ عباسیہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ خلیفہ ناصر بذاتِ خود چنگیز خاں کو خوارزم شاہ پر حملہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ صلیبی آل عباس کی قلمرو میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ بیت المقدس پر وہ قابض ہو چکے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کا کوئی پرسانِ حالت نہیں۔ یکا یک اللہ کی رحمت جوش میں آتی ہے اور فضا میں دو شہابِ ثاقب نمودار ہوتے ہیں۔ دنیائے عیسائیت پر گرتے ہیں اور ان کے خرمن طاقت کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام نورالدین زندگی اور دوسرے کا نام صلاح الدین تھا۔ دونوں مجاہدین فی سبیل اللہ نے یکے بعد دیگرے عیسائیوں پر یلغار کی۔ ان کی متحدہ قوت کو پارہ پارہ کر دیا اور پورے عالم اسلام میں ان کو شکست خوردہ اور بے اثر کر کے رکھ دیا۔ صلاح الدین کے ہاتھوں بیت المقدس دوبارہ مسلمانوں کے تسلط میں آ گیا اور قبلہ اول میں وہ ممبر نصب کیا گیا جسے نورالدین نے چند سال پہلے اس نیت سے بنوایا تھا کہ اسے قبلہ اول میں نصب کیا جائے گا۔

یہ دونوں صاحبان رتبہ اور عزیمت اپنی مثال آپ تھے۔ نورالدین نے پوری جزرسی اور ہمت سے جہاں مسلمانوں کی فتح کارستہ بنایا۔ وہیں بیت المال کو اس کے اصل مصارف کی طرف لوٹا دیا۔ بیت المال کے مداخل اور مخارج کے معاملے میں اتنی احتیاط سے کام لیا کہ خلافت راشدہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ انصاف کا بول بالا کیا اور وہ جرأت اور بے باکی جو صدیوں پہلے مسلمانوں سے روٹھ چکی تھی، نورالدین کی انصاف پسندی اور انصاف پروری کی برکت سے دوبارہ لوٹ آئی۔ اب مسلمان عیسائیوں کے خلاف معرکوں میں شریک ہونا اپنا فرضِ منصبی اور دل کی آواز سمجھنے لگے اور گردنیں جھکا کر زندہ رہنے والے مسلمانوں نے زندہ قوموں کی طرح سر اُٹھا کر خود اعتمادی اور جوانمردی سے زندہ رہنا سیکھ لیا تھا۔

نورالدین کے بعد ان کے تربیت یافتہ سلطان صلاح الدین (ابن ایوب) نے صلیبی دنیا کے مقابلے میں عالم اسلام کی قیادت سنبھالی، بالآخر مختلف معرکوں کے بعد اس نے حطین (فلسطین) کے میدان میں 14 ربیع الاول 583ھ 4 جولائی 1187ء کو صلیبیوں کو ایسی شکست دی جس سے ان کی کمر ٹوٹ گئی اور ان کی قسمت پر مہر لگ گئی۔ مشہور انگریز مورخ لین پول اس کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے۔

> ''ایک ایک مسلمان تیس تیس عیسائیوں کو جنہیں خود اس نے گرفتار کیا تھا، خیمے کی رسی میں باندھے لے جاتا دیکھا گیا، ٹوٹی ہوئی صلیبیوں اور کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں میں مردوں کے ڈھیر اس طرح لگے ہوئے تھے جیسے پتھر پر پتھر پڑے ہوں اور کٹے ہوئے سرزمین پر اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے خربوزوں کے کھیت میں خربوزے پڑے نظر آتے ہیں۔ مدتوں جنگ کا یہ میدان

جس میں یہ خونی لڑائی ہوئی تھی اور جہاں بیان کیا جاتا ہے کہ تیس ہزار آدمی مارے گئے، مشہور رہا۔"

حطین کی فتح کے بعد سلطان صلاح الدین نے 27 رجب 583ھ 1187ء کو بیت المقدس دوبارہ حاصل کیا اور اس آرزو کی تکمیل کی جو 90 برس سے مسلمانوں کے دلوں کو بے چین کیے ہوئے تھی۔ سلطان کے معتمد اور رفیق خاص قاضی ابن شداد لکھتے ہیں:

"ہر طرف دعا و تہلیل و تکبیر کا شور بلند تھا۔ بیت المقدس میں 90 برس کے بعد جمعہ کی نماز ہوئی۔ قبۂ صخرہ پر جو صلیب نصب تھی، اتاری گئی۔ ایک عجیب منظر تھا اور اسلام کی فتح مندی اور اللہ کی مدد کھلی آنکھوں سے نظر آ رہی تھی۔"

سلطان صلاح الدین نے اس موقع پر جس عالی ظرفی اور دریا دلی اور اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا، اس کا ذکر کرتے ہوئے لین پول لکھتا ہے:

"اگر صلاح الدین کے کاموں میں صرف یہی کام دنیا کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح یروشلم کو بازیاب کیا صرف یہی کارنامہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ انسان اور جلالت و شہامت میں یکتا اور بے مثل تھا۔"

بیت المقدس کی فتح اور حطین کی ذلت آمیز شکست سے یورپ میں غیظ و غضب کی آگ پھر بھڑک اٹھی اور سارا یورپ شام کے چھوٹے سے ملک پر ابل پڑا۔ پوری عیسائی دنیا کے مقابلہ میں تنہا صلاح الدین تھا اور اس کے اعزہ اور چند حلیف جو پورے عالم اسلام کی طرف سے مدافعت کر رہے تھے۔ آخر پانچ برس کی مسلسل خونریزیوں اور خون آشام جنگوں کے بعد 1193ء میں رملہ پر دونوں حریفوں میں جو تھک کر چور ہو چکے تھے، صلح ہوئی۔ بیت المقدس اور مسلمانوں کے مفتوحہ شہر اور قلعے بدستور ان کے قبضہ میں رہے۔ ساحل پر عکہ کی مختصری ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی اور سارا ملک صلاح الدین کے زیر نگیں رہا۔ صلاح الدین نے جو خدمت اپنے ذمہ لی تھی اور صحیح الفاظ میں جو کام اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کیا تھا اس کے ہاتھوں مکمل ہوا۔

جنگ مقدس خاتمہ کو پہنچی۔ پانچ برس کی مسلسل لڑائیاں ختم ہوئیں۔ 1187ء میں حطین پر مسلمانوں کی فتح سے پہلے دریائے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک انچ زمین نہ تھی۔ 1192ء ستمبر میں جب رملہ پر صلح ہوئی تو صور سے لے کر یافا تک ساحل پر بجز زمین کی ایک پتلی سی پٹی کے سارا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ اس صلح پر صلاح الدین کو شرمندہ ہونے کی مطلق ضرورت نہ تھی۔

سلطان صلاح الدین اعلیٰ تنظیمی قابلیت اور قائدانہ خصوصیات کا مالک تھا۔ وہ نہ صرف سپہ سالار اور فاتح تھا بلکہ محبوب قائد اور ہر دلعزیز سپاہی بھی تھا۔ اس نے صدیوں کے بعد منتشر و پراگندہ اسلامی ریاستوں اور طاقتوں اور متفرق باہم مخالف مسلمان قوموں اور قبائل کو جہاد کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا۔ عرصۂ دراز کے بعد اس کی قیادت میں عالم اسلام نے ایک منظم اور پرخلوص جنگ کی، جس کا مقصد اسلام کی حفاظت اور جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ لین پول نے صحیح لکھا ہے کہ:

Marfat.com

"تیسری جنگ صلیب میں تمام مسیحی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کرنے آئی مگر صلاح الدین کی قوت کو ٹس سے مس نہ کرسکی۔ صلاح الدین کی سپاہ مہینوں کی سخت جانفشانی اور برسوں کی مخدوش اور خطرناک خدمت کے بعد تھک کر چور ہوچکی تھیں، مگر کسی کی زبان پر حرفِ شکایت نہ تھا۔ کبھی طلبی پر حاضر ہونے اور ایک نیک کام میں اپنی جانیں قربان کرنے سے کسی نے انکار نہیں کیا۔"

لین پول آگے چل کر لکھتا ہے:

"کرد، ترکمان، عرب، مصری سب مسلمان سلطان کے خادم تھے اور طلبی پر خادموں ہی کی طرح سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ باوجود اس کے کہ ان کی نسل وقوم جدا تھی اور باوجود قومی چشمکوں اور قبائلی غرور وتفاخر کے سلطان نے ان کو ایسا شیر وشکر کر رکھا تھا کہ تمام لشکر تن واحد نظر آتا تھا۔"

27 صفر 589ھ کو اسلام کا یہ وفادار فرزند دنیا سے رخصت ہوا۔ صلاح الدین کی مجاہدانہ کوششوں اور اس کی بروقت اور بیدار مغز قیادت نے عالم اسلام کو صلیبیوں کی غلامی کے خطرہ سے عرصہ تک کے لئے محفوظ کردیا۔ عالم اسلام کا مطلع صاف ہوگیا لیکن صلیبیوں نے ان جنگوں سے فائدہ اٹھایا، اپنی اور عالم اسلام کی کمزوریوں کا مطالعہ کیا اور تجربہ کرنے کے بعد وہ نئے صلیبی حملہ (جس کی نوبت انیسویں صدی میں آئی) تیاری میں مصروف ہوگئے۔ لیکن عالم اسلام پر پھر غفلت طاری ہوگئی اور باہمی اختلافات اور خانہ جنگیوں نے سر اٹھایا۔

صلاح الدین کے بعد عالم اسلام کو پھر ایسا مخلص قائد اور رہنما نصیب نہیں ہوا جو اسلام کی بے غرض خدمت کے لئے بیتاب ہو اور جس کا مقصد جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کچھ نہ ہو اور جس پر عالم اسلام کو اس درجہ اعتماد اور اس کی ذات سے تعلق ہو جیسے صلاح الدین کے ساتھ تھا۔ عالم اسلام ایک بار پھر خود غرضیوں، خانہ جنگیوں اور سازشوں کا شکار ہوگیا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک انحطاط اور تنزل چھا گیا۔

عالم اسلام کے اہم مراکز مصر اور شام کے بعد ہم اپنے قاری کو یورپ لئے چلتے ہیں۔ آٹھویں صدی ہجری میں عثمانی ترک منظر عام پر آئے۔ انہوں نے دنیا کو عام طور پر اور مسلمانوں کی نگاہوں کو خصوصیت کے ساتھ اپنی طرف اس وقت متوجہ کیا جب سلطان محمد فاتح نے 853ھ مطابق 1453ء میں اپنی چوبیس سال کی عمر میں بازنطینی سلطنت کے دارالسلطنت قسطنطنیہ کو فتح کرلیا۔ اس واقعے سے مسلمانوں میں ایک نئی امنگ اور نیا جوش پیدا ہوگیا۔

ترک جن کی قیادت آلِ عثمان کر رہے تھے، اس کے اہل تھے کہ ان پر اسلامی اقوام کی قیادت کے بارہ میں مسلمانوں کی طاقت کو از سرِ نو واپس لانے میں اور دنیا میں ان کے کھوئے ہوئے مرتبہ ومقام کو حاصل کرنے میں اعتماد کیا جائے۔ ان کا قسطنطنیہ کو فتح کرلینا جس کو مسلمان آٹھ سو برس تک بار بار کی کوششوں کے باوجود فتح نہیں کرسکے تھے، ان کی قابلیت و قوت اور فنونِ جنگ میں مرتبہ اجتہاد کو پہنچ جانے کی دلیل تھی اور یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جنگی طاقت اور سامانِ جنگ میں اپنی تمام معاصر قوموں سے فائق ہیں اور ان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے مقصد کے لئے علم وعمل کی طاقت اور اجتہاد سے کام

لے سکیں اور قائد قوم کے لئے یہ تمام صفات بمنزلہ شرائط کے ہیں۔

فرانسیسی مورخ (Baron Carra) اپنی کتاب ''مفکرین اسلام'' میں محمد فاتح کے تذکرے میں لکھتا ہے:

''یہ فتح محمد فاتح کو محض بخت و اتفاق سے حاصل نہیں ہوئی تھی اور نہ اس کا سبب محض بازنطینی سلطنت کی کمزوری تھی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ سلطان بہت پہلے سے اس کے لئے ضروری انتظام کر رہا تھا اور اس کے زمانہ میں علم کی جتنی طاقت تھی اس سے کام لے رہا تھا۔ توپیں اس وقت نئی نئی ایجاد ہوئی تھیں، اس نے کوشش کی کہ جتنی زبردست اور بڑی توپ اس زمانہ میں بن سکتی تھی بنائی جائے۔ اس نے اس کے لئے ہنگری کے انجینئر کی خدمات حاصل کیں جس نے اس کے لئے ایک ایسی توپ بنائی جو تین سو کلو کے وزنی گولے کو پھینکتی تھی اور اس کی مار ایک میل سے زیادہ تھی۔ کہتے ہیں کہ اس توپ کو کھینچنے کے لئے 700 آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی اور اس کو بھرنے کے لئے دو گھنٹے درکار تھے۔ جب محمد فاتح قسطنطنیہ فتح کرنے چلا تو اس کی قیادت میں تین لاکھ سپاہی تھے اور زبردست توپ خانہ، اس کا بحری بیڑہ جو قسطنطنیہ کا سمندر کی طرف سے محاصرہ کئے ہوئے تھا ایک سو بیس جنگی کشتیوں پر مشتمل تھا۔ اس نے اپنی عقل و اجتہاد سے یہ تجویز کیا کہ جنگی بیڑے کا ایک حصہ خشکی سے خلیج تک پہنچایا جائے اس نے لکڑی کے تختوں پر چربی مل کر ستر جہاز قاسم پاشا کی سمت سے سمندر میں اتار دیے۔ محمد فاتح سے یورپ اس قدر مرعوب تھا اور خوف زدہ تھا کہ اس کے انتقال پر پاپائے اعظم نے جشنِ مسرت منانے کا حکم دیا اور فرمان صادر کیا کہ تین روز تک مسلسل شکرانہ کی نمازیں پڑھی جائیں۔''

مسلمان ترکی قوم میں درحقیقت کچھ ایسی خصوصیات تھیں جن سے وہ مسلمانوں کی قیادت کی مستحق تھی۔ وہ ایک بلند حوصلہ، پرجوش اور زندہ قوم تھی۔ جس میں جہاد کی روح تھی اور جو بدویت کی زندگی اور سادگی سے قریب العہد ہونے کی وجہ سے ان اخلاقی اور اجتماعی امراض سے محفوظ تھی جن میں اسلامی قومیں مشرق میں مبتلا ہو کر کمزور ہو چکی تھیں۔

اس کے پاس ایسی جنگی طاقت تھی جس سے وہ اسلام کے مادی اور روحانی تسلط کو پھیلا سکے اور حریف قوموں کی دست درازیوں کو روک سکے۔ اور دنیا کی قیادت کے منصب پر قائم ہو سکے۔ ایک وقت میں عثمانی سلاطین تین براعظموں یورپ، ایشیا اور افریقہ میں حکومت کرتے تھے۔ اسلامی مشرق ایران سے مراکش تک ان کے زیر فرمان تھا۔ ایشیائے کوچک کو وہ زیر کر چکے تھے اور یورپ میں آگے بڑھتے ہوئے وہ ویانا کی دیواروں تک پہنچ چکے تھے۔ بحیرہ متوسط کے وہ تنہا مالک تھے جس پر کسی دوسری قوم کا کوئی اثر نہ تھا۔ اطلس کے معتمد نے ایک مرتبہ قسطنطنیہ سے قیصر کو لکھا کہ سلطان بحر اسود کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ جس میں کسی غیر کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ ترکوں کے بحری بیڑے کا مقابلہ سارا یورپ مل کر بھی نہیں کر سکتا۔

945ھ میں پاپائے اعظم وینس، اسپین، پرتگال اور مالٹا کی متحدہ بحری قوت نے اس بیڑے کو شکست دینی چاہی لیکن خود شکست سے دوچار ہوئے۔ سلیمانِ اعظم کے زمانہ میں ترکوں کو بحری و بری، سیاسی اور روحانی اقتدار حاصل تھا۔ اس کے

Marfat.com

زمانے میں عثمانی حکومت کے حدود شمال میں دریائے صاوہ (Sava) جنوب میں نیل کے دہانہ اور بحر ہند تک مشرق میں قفقاز کے سلسلہ کوہ اور مغرب میں کوہ اطلس تک پہنچ گئے تھے اور چار لاکھ مربع میل کا رقبہ اس کے زیر حکومت تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ کا بحری بیڑہ تین ہزار فوجی جہازوں پر مشتمل تھا۔ روم کے علاوہ قدیم دنیا کا ہر مشہور شہر حکومتِ عثمانیہ کے زیر فرمان تھا۔ سارا یورپ ان سے ہیبت زدہ تھا اور اس کے بڑے بڑے بادشاہ عثمانی سلاطین کی حفاظت اور پناہ میں داخل ہوتے تھے۔ ان کے احترام میں کلیساؤں کے گھنٹے بند ہو جاتے تھے۔ بین الاقوامی قیادت کے لئے ان کو بہترین جغرافیائی مرکز حاصل تھا۔ اور جزیرہ نمائے بلقان سے بیک وقت ایشیا اور یورپ کی نگرانی کر سکتے تھے۔ ان کا دارالسلطنت بحیرہ اسود اور بحیرہ ابیض کے درمیان واقع ایشیا اور یورپ کی خشکیوں کا نقطۂ اتصال تھا۔ اس لئے ایک ایسی حکومت کا پایہ تخت تھا جو بیک وقت تینوں براعظموں یورپ، ایشیا اور افریقہ کی نگرانی کرتی تھی۔ نپولین نے ایک موقع پر کہا تھا کہ اگر کبھی ساری دنیا کی ایک متحدہ حکومت قائم ہوئی تو قسطنطنیہ ہی میں یہ صلاحیت ہے کہ اس کا دارالسلطنت بنے۔

وہ یورپ میں تھے۔ یورپ کو مستقبل قریب میں بڑی اہمیت اور حیثیت حاصل ہونے والی تھی۔ زندگی کی طاقتیں اور ترقی کے محرکات و عناصر اس کے سینہ میں ابل رہے تھے۔ اگر اللہ توفیق دیتا تو ترکوں کے لئے یہ ممکن تھا کہ علم و عقل کے میدان میں پیشوا بن کر اس سے پہلے کہ یورپ دنیا کی عنان قیادت ہاتھ میں لے کر اس کو ہلاکت و تباہی کی طرف لے جائے۔ وہ اس کو حق و ہدایت کی منزل کی طرف جس کا نشان ان کو اسلام کی طفیل مل چکا تھا، لے چلیں۔

لیکن ترکوں کی بدقسمتی سے زیادہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ عین ترقی و عروج کے زمانہ میں ترکوں میں تنزل و انحطاط شروع ہو گیا اور قوموں کے پرانے امراض ان میں پیدا ہو گئے۔ آپس میں حسد و بغض کا نشو و نما ہوا۔ بادشاہ جابر ہو گئے اور ظلم و استبداد اپنا شیوہ بنا لیا۔ حکمرانوں کی تربیت کا نظام بگڑ گیا، اخلاق میں انحطاط شروع ہو گیا، حکام اور سپہ سالار قوم و سلطنت سے خیانت اور غداری کرنے لگے۔ قوم میں راحت طلبی اور عافیت کوشی پیدا ہو گئی۔ غرض زوال پذیر قوموں کی وہ تمام صفات پیدا ہو گئیں جن کی تفصیل ترکوں کی تاریخ کی کتابوں میں ملے گی۔

سابقہ صفحات میں ہم نے قدرے تفصیل سے ان عوامل و محرکات کا ذکر کیا جن کی وجہ سے ملت اسلامیہ فراز سے نشیب کی طرف چل پڑی۔ زوال کے دوسرے مرحلے میں ہم نے ان غیر معمولی فہم و ادراک رکھنے والی شخصیات۔ بالخصوص حکمران ہماری قید تحریر میں آئے لیکن زوال کا جو پتھر بلندی سی لڑھکنا شروع ہوا ان حکمرانوں کی بھرپور کارکردگی اور جدوجہد کے باوجود اسے روکا نہ جا سکا۔ ان نیک نہاد شخصیات نے زوال کے آگے بند باندھنے کی مقدور بھر کوشش کی لیکن ہر مرتبہ زوال اور پستی اپنے لئے نیا راستہ بنا لیتے رہے تا آنکہ اندھیرا بڑھتا رہا اور امت مسلمہ کا سفر نشیب کی طرف اور تیز ہوتا گیا، حتیٰ کہ تیسرا مرحلہ آ گیا۔ اس مرحلہ کو اقبالؒ کی زبان میں ہم یوں بیان کرتے ہیں:

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی ۔۔۔ یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی
نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے ۔۔۔ وہی آب و گل ایران وہی تبریز ہے ساقی

اسلام دین دعوت ہے، یہ دین اپنی دعوت کے اثر سے دنیا کی تسخیر و تعمیر اس انداز سے کرتا ہے کہ دعوت کی راہ میں

آنے والے افراد خود بخود اس کی فتوحات کی جہتوں اور وسعتوں کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ خلافتِ راشدہ اور عمر بن عبدالعزیز کے بعد کسی اسلامی حکومت نے اس اہم ترین فریضہ کی طرف توجہ نہیں دی۔ پوری دنیا کی وسعتیں ہمارے حکمرانوں کے سامنے تھیں لیکن ان کی سرگرمیاں اور جدوجہد اپنی ذات سے باہر نہ نکل سکیں۔ بادشاہوں نے ملکوں کے ملک اپنی قلمرو کا حصہ بنائے لیکن ان ملکوں کے باشندوں کو امت رسول ﷺ کا حصہ نہ بنایا۔ ممالک محروسہ سے خراج وصول کیا، نئے نئے ٹیکس لگا کر خزانوں کو لبالب بھرا، اس عمل زراندوزی کے نتیجے میں نئے مسلمان کہاں سے آتے اور اپنے بھائیوں کے دست و بازو بنتے بلکہ جن موجود مسلمانوں کے بل بوتے پر انہیں تاجِ حکمرانی ملا ان کی زندگی بھی اپنے جبر و استبداد سے اجیرن کئے رکھی۔

یہ حکمران زمانے کے سمندر سے گوہر فرد انکالنے کے بجائے اپنی ذات اور خاندان کے لئے دولت کے انبار لگاتے رہے۔ اشرفیوں سے حوض بھرتے رہے، دولت کی ہوس میں فوجوں کی تنخواہیں کم کرتے رہے۔ تا آنکہ بغداد کے فوجی بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے اور حوضوں میں بھری ہوئی دولت بھوک اور افلاس سے ستائے ہوئے عوام پر تو خرچ نہ ہو سکی۔ ہلاکو خاں اور نادر شاہ جیسے لٹیروں کی خدمت میں ضرور پیش کر دی گئی۔ دنیائے اسلام میں عوام بھوک اور افلاس کی وجہ سے مردار خوری تک اترتے رہے لیکن حکمرانوں کی زراندوزی کی خواہش پر کوئی قدغن نہ لگی۔ ان حالات میں اللہ کے کوڑے کا برسنا یقینی ہو گیا تھا۔

زمانہ تحقیق و تفتیش میں آگے بڑھتا رہا۔ ہمارے حکمران تعیشات کے نئے نئے زاویے اور رستے تلاش کرتے رہے۔ زن پرستی اور مئے ناب میں ڈوبنے والے ایسے حکمران منصہ شہود پر آئے کہ جن کا نام امت مسلمہ کے بادشاہوں میں شامل کرتے ہوئے قلم بھی پانی پانی ہو جاتا ہے۔

یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم تینوں شمشیریں توڑ دی گئیں۔ حکمرانوں کو نہ ہی اللہ کی ذات پر یقین رہا۔ نہ اس بات کا یارا رہا کہ عمل پیہم کا اثر انسان کو کون سی بلندیوں سے سرفراز کرتا ہے اور انہیں اس بات کا ہوش نہ رہا کہ انسانوں سے محبت کس طرح پورے عالم کو فتح کر لیتی ہے۔ انہیں صرف یہ آرزو اور خواہش کھائے جا رہی تھی کہ امت مسلمہ کے وسائل کو اپنی ذات، تعیشات، حرم اور اپنے خاندان کے لئے کس طرح زیادہ سے زیادہ جمع اور استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس سب کچھ میں بیت المال کے ساتھ بددیانتی کا احساس کوسوں دور دفن کر دیا گیا تھا۔

صلیبی جنگوں میں شکست سے لے کر ہندوستان میں داخلے کے وقت تک یورپ کی قومیں اس تلاش میں لگی رہیں کہ ملت اسلامیہ کے کون سے پہلو کمزور ہیں جن پر آسانی سے حملہ آور ہوا جا سکتا ہے۔ مسلمان بادشاہ اسلامی مزاج کے برعکس بڑی عمارتیں اور تاج محل بنانے میں مصروف تھے اور یورپی اقوام ایک طرف اعلیٰ تعلیمی ادارے بنانے میں جت گئے دوسری طرف انہوں نے اپنے اجتہاد سے نئے جنگی ہتھیار ایجاد کر کے مسلمان حکمرانوں کو مبہوت کر دیا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یورپی اقوام اس جدید اسلحہ کی مدد سے ملت اسلامیہ پر ٹوٹ پڑنے کے لئے ہمیشہ مستعد رہتی تھیں اور اب تک بھی مستعد ہیں۔

جانِ سخن یہ ہے کہ دین و دنیا کی ساری وسعتیں اور جہتیں اور توانائیاں ہم سے روٹھ کر بہت دور چلی گئیں اور ہمیں دنیا میں ذلت، شکست اور نکونامی کا لباس پہنا دیا گیا۔

یہ داستان بڑی طویل اور دلخراش ہے اور ملت اسلامیہ کے ہر فرد بشر کو ازبر ہے لیکن مایوسی کے ایسے خول میں بند ہیں جس میں روشنی کی ہلکی سی کرن بھی داخل نہیں ہو رہی۔ دیارِ مغرب کے رہنے والوں نے ہمارے دل و دماغ کی تمام روشنیاں ختم کر کے ہمیں گھٹاٹوپ اندھیروں میں دھکیل دیا ہے اور بدقسمتی کی انتہا ہے کہ ہم ان اندھیروں کو بھی روشنی کہتے ہیں اور اس اندھیر نما روشنی سے نکلنے کی کوئی تدبیر اور تجویز ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ ہر مسلمان مجموعی طور پر اس اندھیر نما روشنی کے ایسے اسیر ہیں کہ زبانِ حال سے ہم بار بار اعلان کر رہے ہیں کہ رہائی ملی تو مر جائیں گے۔

''ارمغانِ حجاز'' علامہ اقبالؒ کی آخری کتاب ہے۔ اس کتاب میں علامہ کا مطالعۂ فطرت، مشاہدہ اور بصیرت پورے عروج پر ہے۔ وہ پوری انسانیت اور بالخصوص امتِ مسلمہ کو اہل مغرب کی طرف سے مسلط کردہ نمرودی عذاب سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ ان کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے متعلقہ بند نذرِ قارئین کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار 1936ء میں لکھے گئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب نمرودی اور ابلیسی نظام کی گرفت دنیائے انسانیت پر مکمل ہو چکی تھی۔ شیاطین عالم نے جمع ہو کر ان خطرات کو پیش کیا جو ابلیسی نظام کے لئے سخت تشویش اور پریشانی کا باعث ہیں اور جن کی طرف جلد متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ ایک مشیر نے جمہوریت کا نام لیا اور اس کو ''جہانِ نو کا تازہ فتنہ'' بتایا، دوسرے نے اشتراکیت سے سخت خطرہ ظاہر کیا اور ابلیس کو مخاطب کر کے کہا

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج — کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے — جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

صدرِ مجلس ابلیس نے اپنے مشیروں کو ان فتنوں سے فکرمند نہ ہونے سے اطمینان دلایا۔ اپنی گہری اور اندرونی واقفیت کی بنا پر ان کی اصل حقیقت بیان کی جو ان کی ظاہر بیں نگاہ سے پوشیدہ رہ گئی تھی اور ان فتنوں کا توڑ بتایا جن کا اس نے پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ آخر میں اس نے اپنے نقطہ نظر سے اصل خطرے کا ذکر کیا جس کے لئے اگرچہ اس نے انتظامات سوچ لئے ہیں مگر مستقبل کی خطرناکی سے اس کے جسم پر لرزہ طاری اور راتوں کی نیند حرام ہے۔ وہ کہتا ہے:

ہے خطرہ مجھ کو اگر کوئی تو اس امت سے ہے — جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ — کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پر روشن باطنِ ایام ہے — مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے
جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

Marfat.com

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نہ فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

ابلیس اپنے مشیروں کو مشورہ دیتا ہے:

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

پاکستان 1947ء میں معرضِ وجود میں آیا۔ اس سے کئی سال پہلے علامہ اقبالؒ نے مولانا مودودیؒ کو لاہور میں مستقل قیام کی دعوت دی تاکہ مل کر ملتِ اسلامیہ کی خدمت کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اسے علمی اندھیرے سے نکالا جائے۔ علامہ اقبالؒ تو 1939ء میں خلد مکانی ہو گئے۔ پاکستان بن گیا لیکن آج تک مطلوبہ بنیادوں پر تعمیرِ پاکستان نہ ہو سکی۔ کوئی لاکھ اختلاف کرے، یہ حقیقت ہے کہ مولانا مودودیؒ نے پوری زندگی اس کام میں لگا دی کہ انسانوں کے سامنے اسلامی نظام کے خدوخال واضح کئے جائیں اور اسلامی نظام کو کم از کم پاکستان کی حد تک نافذ کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے تاکہ پاکستان میں نفاذِ اسلام دنیائے انسانیت کے لئے رول ماڈل بن سکے۔

پاکستان بننے کے بعد مولانا نے ریڈیو پاکستان کو ایک انٹرویو دیا تھا جو ان کے مشہور رسالے ترجمان القرآن میں چھپا تھا۔ ہمارے پیشِ نظر نومبر 2003ء کا شمارہ ہے جس میں ''اسلامی نظام کا قیام کس طرح'' کے عنوان سے دوبارہ چھپا تھا۔ ہم من و عن نقل کرتے ہیں۔

> ''سب سے پہلی بات جو سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ جس چیز کا نام اسلامی نظام ہے وہ کسی بے ایمان اور بدکردار حکومت کے ہاتھوں سے نہیں چل سکتا۔ کوئی خدا سے بے خوف بیوروکریسی اس کو نہیں چلا سکتی۔ کسی ایسی آبادی میں ٹھیک طور پر نہیں چل سکتا جس کی اخلاقی حالت بالعموم خراب ہو اور خراب کی جاتی رہی ہو۔ اگر کوئی اسلامی حکومت قائم ہو تو یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ چھوٹتے ہی مثالی نظام کی طرف پلٹ جائے گی۔ آغازِ کار میں کچھ ہو سکتا ہے تو وہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو ملک کے تمام ذرائع و وسائل ملک کے تمام ذرائع ابلاغ

Marfat.com

ملک کے سارے نظام تعلیم اور حکومت کی پوری انتظامی پالیسی کو اس غرض سے استعمال کریں کہ مسلمانوں میں اسلام کا علم وسیع پیمانے پر پھیل جائے اور ان کی عام اخلاقی حالت کو درست کیا جائے۔ جس قدر اسلام کا علم پھیلے گا اور عام اخلاقی حالت درست ہوتی جائے گی، اتنی ہی زمین اسلامی نظام کے لئے تیار ہوتی چلی جائے گی۔"

یہی چیز تھی جس کی ہم توقع رکھتے تھے کہ انگریزی حکومت کے خاتمے کے بعد جب پاکستان کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے گی تو وہ اس طریقہ کار کو اختیار کرے گی۔ ذرائع ابلاغ کی پوری طاقت عام مسلمانوں میں ایمان اور صحیح اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لئے استعمال کرے گی۔ نظام تعلیم کو ایک اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرے کا رکن اور شہری تیار کرنے کے قابل بنایا جائے گا۔ الحاد پیدا کرنے والی تعلیم کو بدلا جائے گا اور اس کی جگہ خدا پرستی کی تعلیم کو رائج کیا جائے گا۔ عام لوگوں کے اندر حلال و حرام کی تمیز پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مگر یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ان میں سے کوئی توقع بھی پوری نہیں ہوئی۔ اگر اس وقت حکومت اپنے تمام ذرائع و وسائل کو اس کام کے لئے استعمال کرتی تو آج حالت بالکل مختلف ہوتی۔

اب ہمیں گویا نئے سرے سے کام کرنا ہے۔ بے شک اسلامی قوانین نافذ کرنے کی کوشش کیجئے، قوانین اسلامی کو مدون بھی کیجئے تاکہ ہماری عدالتیں ان کے مطابق فیصلے کر سکیں مگر بس یہی ایک کام ایسا نہیں جس سے اسلامی نظام قائم ہو جائے۔

ذرائع ابلاغ کی اصلاح

سب سے زیادہ زور جس بات پر صرف کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہماری تمام ابتدائی اور ثانوی مدرسوں اور ہمارے تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامی تعلیم دی جائے۔ ذرائع ابلاغ کو فحاشی اور بے حیائی، بداخلاقی اور جرائم پھیلانے کے بجائے مسلمانوں کو ایمان اور اسلامی عقائد سمجھانے اور ذہن نشین کرنے پر صرف کیا جائے۔ عام لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ اسلامی اخلاق کیا ہیں اور کافرانہ اخلاق کیا ہیں اور دونوں قسم کے اخلاقوں میں کیا فرق ہے؟

اسلامی نظام قائم ہی اس معاشرے میں ہوا تھا جس کے اندر سب سے پہلے ایمان کو مستحکم کیا گیا تھا۔ پھر اس ایمان کی مضبوط بنیاد پر پورے اخلاقی نظام کی، پورے معاشرتی نظام کی، پورے معاشی نظام کی، پورے سیاسی نظام اور پورے قانونی نظام کی عمارت اٹھائی گئی تھی۔ اب اگر ہم اس مثالی دور کی طرف پلٹنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس ترتیب سے ہی پلٹنا ہوگا۔

ہم مسلمانوں کے دلوں میں اگر خدا پر ایمان، رسولؐ پر ایمان، قرآن پر ایمان اور آخرت پر ایمان مضبوطی کے ساتھ نہ بٹھایا گیا تو محض قوانین کو بدلنے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں جھوٹے مقدمات بنانے میں پولیس اتنی مہارت رکھتی ہے کہ وہ ساری دنیا کو چیلنج دے سکتی ہے کہ ہمارے مقابلے میں کوئی جھوٹا مقدمہ بنا کر دکھائے۔ گواہوں کا حال یہ ہے کہ عدالت میں جا کر صحیح گواہی دینا گویا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ عدالت ہے ہی جھوٹی شہادت دینے کی جگہ۔

Marfat.com

پولیس خود بھی جھوٹے گواہوں کا ایک پورا گروہ تیار رکھتی ہے۔ یہی دو چیزیں اگر نگاہ میں رکھی جائیں تو آپ اندازہ کر لیجیے کہ ہمارے ہاں اسلامی قانون صحیح طور پر کیسے نافذ ہوگا جبکہ اس کو نافذ کرنے والی مشینری ہی بگڑی ہوئی ہے۔ قوانین اسلامی کے نفاذ کی تدبیریں کرنے کے ساتھ موجودہ حکومت کے لیئے بھی اور آئندہ آنے والے حکمرانوں کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ملک کی انتظامیہ کو بھی درست کریں۔ تعلیم کے نظام کی بھی اصلاح کریں اور ملک کے تمام ذرائع و وسائل کو اس بات پر صرف کریں کہ مسلمانوں کے دلوں میں ایمان بٹھایا جائے۔ ان کے اخلاق درست کیئے جائیں اور ان کے اندر خدا کا خوف پیدا کیا جائے۔

پہلے اصلاح......پھر سزا!

اس قانون میں ڈنڈے کا بھی ایک مقام ہے مگر وہ سب سے آخر میں آتا ہے۔ اسلام میں ترتیب کار یہ ہے کہ پہلے ذہنوں کی اصلاح کا کام تعلیم و تلقین کے ذریعہ سے کیا جائے تاکہ لوگوں کے خیالات تبدیل ہوں پھر لوگوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر کام کیا جائے۔ یہاں تک کہ محلے محلے بستی بستی اور کوچے کوچے میں ایسے لوگ تیار ہو جائیں جو بدکرداروں کو عوام کی مدد سے دبائیں اور اپنے اپنے علاقے کے باشندوں میں دین داری اور دیانت داری پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح ملک کے اندر ایک ایسی رائے عامہ پیدا ہو جائے گی جو برائیوں کو سر نہ اٹھانے دے گی۔ کوئی شخص ایسی رائے عامہ کی موجودگی میں بگڑنا چاہے گا تو اس کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی اور جو شخص صحیح طرز زندگی اختیار کرے گا اس کو پورا معاشرہ مدد دینے والا ہوگا۔

اس کے ساتھ اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ معاشرہ ایسا ہو جس کے لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد اور غم گسار ہوں۔ ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آنے والے ہوں۔ ہر شخص انصاف کا حامی ہو اور بے انصافی کا مخالف ہو۔ ہر شخص اپنا پیٹ بھرنا حرام سمجھے، اگر اس کو معلوم ہو کہ اس کا ہمسایہ بھوکا سو رہا ہے۔ پھر اسلام ایسا معاشی نظام بھی قائم کرتا ہے جس میں سود حرام ہو۔ زکوٰۃ فرض ہو، حرام خوری کے دروازے بند کر دیئے جائیں، رزق حلال کمانے کے تمام مواقع لوگوں کے لئے کھول دیے جائیں اور کوئی آدمی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔ ان تدابیر کے بعد ڈنڈے کا مقام آتا ہے۔ ایمان، اخلاق، تعلیم، انصاف، اصلاحِ مثبت اور ایک پاکیزہ رائے عامہ کے دباؤ سے بھی جو آدمی درست نہ ہو تو ڈنڈے ہی کا مستحق ہے اور ڈنڈا پھر ایسی بے رحمی کے ساتھ علی الاعلان چلایا جائے کہ ان تمام لوگوں کے دماغ کا آپریشن ہو جائے جو جرائم کے رجحانات رکھتے ہوں۔

لوگ بڑا غضب کرتے ہیں کہ اسلام کے پروگرام کی ساری تفصیل چھوڑ کر صرف اس کی سخت سزاؤں پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ اسلام پہلے عام لوگوں میں ایمان پیدا کرتا ہے پھر عوام کے اخلاق کو پاکیزہ بناتا ہے پھر تمام تدابیر سے ایک رائے عامہ تیار کرتا ہے جس میں بھلائیاں پھلیں پھولیں اور برائیاں پنپ نہ سکیں۔ پھر معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام ایسا قائم کرتا ہے جس میں بدی کرنا مشکل ہو اور نیکی کرنا آسان ہو جائے۔ وہ ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے جن سے فواحش اور جرائم نشوونما پاتے ہیں۔ اس کے بعد ڈنڈا وہ آخری چیز ہے جس سے ایک پاک معاشرے میں سر اٹھانے والی ناپاکی کا قلع

Marfat.com

قمع کیا جاتا ہے۔ اب اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے کہ ایسے برحق نظام کو بدنام کرنے کے لئے آخری چیز کو پہلی چیز قرار دیتا ہے اور بیچ کی سب چیزوں کو نگل جاتا ہے۔

ہم نے سطورِ بالا میں اسلامی نظام کا خاکہ پیش کیا ہے اور اس کے قیام کی تدبیروں کو بیان کیا ہے۔ یہ نظام کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے، اسے خالق، فاطر اور بدیع نے بنی نوعِ انسان کو عطا کیا ہے۔ یہ نظام جب دنیا کے کسی خطے میں برپا ہوتا ہے تو اپنے لئے مردانِ کار بھی خود تیار کر لیتا ہے۔ بلکہ مردانِ کار خود بخود منصہ شہود پر آ جاتے ہیں۔ اس نظام کے صیقل شدہ مردانِ کار کو اللہ کی ذات پر یقین پہاڑ کی طرح بلند اور مضبوط ہوتا ہے۔ اس نظام میں زندگی گزارنا گویا اللہ کے گھر اور حفاظت میں رہنا ہے۔ اللہ اپنے گھر والوں کو کسی بھی میدان میں دنیا والوں سے شرمسار نہیں ہونے دیتا۔ اس نظام کا پروردہ اور اس کی روح کو پوری طرح جذب کر لینے والا بندہ اپنی روحانی اور دنیوی ترقی کے عروج پر ہوتا ہے تو ایسا وقت آ جاتا ہے کہ اس کی گردن جھکتی ہے تو صرف اپنے مالک کے آگے اور مالک الملک قوموں کی تقدیر اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور انسانیت اس دنیا میں جنت کا نظارہ کرنے لگتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص عاشقانہ انداز میں اس رجل رشید اور مردِ بے مثال کے خدوخال بیان کئے ہیں۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دلنواز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

(بالِ جبریل)

آج مغربی دنیا نت نئے نظریات پیش کر رہی ہے کہ شاید کوئی نظریہ کارگر ہو جائے اور عالمِ انسانیت جو پچھلی دو صدیوں سے جنگ و جدل میں مصروف ہے اور اس حد تک آگے نکل چکی ہے کہ بے اطمینانی اور کرب کا مارا ہوا انسان اپنے ہی بھائی بندوں کے گلے کاٹنے یا انہیں ہیروشیما اور ناگاساکی کے شہروں میں اپنے بموں کی حدت سے پگھلا کر ختم کرنے میں تمام حدود پار کر چکا ہے، پوری انسانیت بے یقینی اور بے اعتمادی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ابلیسی تہذیب نے انسانی جسم کو آرام دینے کے لئے لاکھوں ایجادات کا بندوبست کر دیا ہے لیکن انسان کی روح جس کرب اور اضطراب میں مبتلا ہے اسے بیان کرنے کے لئے ہر زبان کے الفاظ گنگ اور لاچار ہیں۔ بقول اقبالؒ

پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شرابِ خانہ ساز
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خاموش

ان حالات میں عالمِ اسلام پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ انسانیت کو انسانوں کی پرستش سے نکال کر خدائے واحد کی پرستش میں، دنیا کی تنگی سے دین کی کشادگی میں اور مذہب کی ناانصافی سے نکال کر اسلام کی عدل گستری میں داخل کرے۔

اقبالؒ کہتا ہے کہ ابراہیمؑ نے کعبہ تعمیر کیا اور ملت ابراہیمی کے فرزندوں نے کعبہ کے پیغام توحید کو دنیا کے کونے

Marfat.com

کونے میں پہنچا کر ملتِ ابلیس کے دو بڑے نمائندے قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کو الٹ دیا تھا اور انسانوں کا نصیب جاگ اٹھا تھا۔ اب پھر اسی ملتِ ابراہیمی کے فرزندوں کو اسی جان سوزی اور جان سپاری اور ذوق و شوق سے آگے بڑھنا چاہئے کیونکہ حرم کی تعمیر کرنے والے ہی جہان کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی — دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی — صہبائے یقیں درکش و از دیرِ گماں خیز

از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

از خواب گراں خیز

فریاد از افرنگ و دل آویزیٔ افرنگ — فریاد ز شیرینیٔ و پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ — معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

از خواب گراں خیز

(زبورِ عجم)

تشریح و ترجمہ اشعار

1- ازل کی ناموس (اللہ کے دین کی عزت) کا تو امانت دار ہے۔ تیرے پاس اللہ کی امانت یعنی اس کی خلافت ہے یا تیرے پاس اس کی امانت قرآن ہے۔ تو جہان کے رکھوالے کا دایاں بازو ہے مراد ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے نظام اور منشا کو جہاں میں نافذ کرنے والی قوت ہے۔

2- (تو اپنے امین ہونے کے منصب کو بھول کر محض ایک جسم خاکی رہ گیا ہے اور کھانے پینے اور سونے کے سوا تجھے اور کوئی کام نہیں) اے خود کو خاک کا غلام بنانے والے، اے خاکی بندے تو (محض) زمانہ اور زمین یعنی زمان و مکاں کی قید میں پھنسا ہوا ہے (اس سے باہر بھی جہان ہے اور جو باہر سے ہوتا ہوا تیرے جسم خاکی کے اندر بھی سب کا سب موجود ہے لیکن تجھے اس کی خبر نہیں، تو ایمان کی دولت کو چھوڑ کر بے یقینی اور تشکیک کی فضا میں سانس لے رہا ہے) یقین کی شراب پی اور وہم کے مندر سے اٹھ تو پھر زندگی کی حقیقت تیرے ہاتھ آئے گی۔ گہری نیند، گہری نیند، گہری نیند سے اُٹھ، گہری نیند سے اُٹھ۔

1- یورپ (مغرب) سے اور اس کی دل لبھانے والی فضا سے فریاد خدا اس سے بچائے۔ یورپ کی شیریں کی طرح کے حسن اور پرویز کی مکاری سے فریاد ہے، یورپ پچھلی چند صدیوں سے اپنی (خنزیری تہذیب) سگ پرستانہ ثقافت، شیطان پرور افکار اور دین بیزار علوم و فنون کے ذریعے ساری دنیا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اپنی ظاہری چمک دمک کا

فریب دے کر پھنسا رہا ہے بلکہ پھنسا چکا ہے اور مسلمان نام کا مسلمان رہ گیا ہے۔

2- سارا جہاں فرنگیوں کی فکری اور سیاسی یلغار کی چنگیزیت کی وجہ سے ویرانہ بن چکا ہے۔ چنگیز نے تو جسم کاٹے، شہر برباد کئے تھے۔ انہوں نے قلب و روح کے جہانوں کو برباد کر دیا ہے۔ ذہن و شعور کو بھی غارت کر دیا ہے۔ فرنگیوں کی بربادی چنگیز کی بربادی سے زیادہ خطرناک ہے۔ مسلمان جس نے حرم کعبہ تعمیر کیا تھا یعنی دین اسلام کے ذریعے دنیا کے ویرانے کو آباد کیا تھا اور جسم و روح کی ایک دوسرے سے مربوط بستیاں قائم کی تھیں، دوبارہ جہاں کی تعمیر کے لئے اٹھ کیونکہ جہاں کی صحیح تعمیر سوائے مسلمان کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ بشرطیکہ وہ صحیح مسلمان بن کر تعمیر جسم و روح اور تعمیر دنیا کا فن جانتا ہو۔ گہری نیند، گہری نیند، گہری نیند سے اُٹھ۔

آج مورخہ 2 جنوری 2016ء بروز اتوار ہم اپنی کتاب کو حدیث رسول ﷺ کے الفاظ اور ان کے بدیہی مفہوم علامہ اقبال کے دو اشعار کے ساتھ ختم کرتے ہیں: "اس امت کا آخر انہی طریقوں سے صلاح یاب ہو گا جس سے اس کے اول کی اصلاح ہوئی تھی"۔ ہست دین مصطفیٰ، دین حیات، شرع او تفسیر آئین حیات، تا شعار مصطفیٰ از دست رفت، قوم را رمز بقا از دست رفت۔ حضرت محمد ﷺ کا دین ہی دین فطرت ہے اور شرع محمدی آئین حیات کی تفسیر ہے۔ جب حضرت محمد ﷺ کا شعائر یعنی شریعت ہاتھ سے نکل گئی تو قوم رمز بقا سے محروم ہو گئی۔

مسلمان دشمن کا سر کاٹنا اور لاشوں کی بے حرمتی

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ہماری کوشش ہے کہ حکومتوں کے وہ عمال جنہوں نے اسلامی معاشرے کو اپنے ظلم و تشدد سے تہہ و بالا کر کے مسلمانوں کے اصلی جوہر۔ اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرنا اور نہ امید لگانا۔ ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح جابر و خونخوار عمال نے اسی غرض کے لئے جب انہوں نے معاشرے کے سربرآوردہ عمائد کو قتل کیا تو ان کے سر کاٹ کر ممالک محروسہ میں پھرائے اور ان کی لاشوں کی بھی حد درجہ بے حرمتی کی۔ جس کی اسلام کسی طرح بھی اجازت نہیں دیتا۔ قارئین کی معلومات کے لئے یہ دکھ بھری داستان بیان کی جارہی ہے۔

دورِ جہالت کے اس وحشیانہ طرزِ عمل کا پہلا شکار سرورِ دو عالم ﷺ کے پیارے صحابی عمار بن یاسرؓ بنے۔ حضرت عمارؓ جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے شریک جنگ تھے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کا سر کاٹ کر حضرت امیر معاویہؓ کے پاس لایا گیا اور دو آدمی جھگڑ رہے تھے، ہر ایک کہتا تھا کہ میں نے قتل کیا ہے۔ ایک صحابیؓ کا سر کاٹنے کے بعد دوسرے صحابی سے انعام کا لالچ، یہ کیا ہو گیا؟

اس کے بعد دوسرا سر عمر بن الحمق کا تھا جو رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے قتل میں انہوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ زیاد کی ولایت عراق کے زمانے میں ان کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ بھاگ کر ایک غار میں چھپ گئے۔ وہاں وہ سانپ کے کاٹنے سے مر گئے۔ تعاقب کرنے والے ان کی مردہ لاش کا سر کاٹ کر زیاد کے پاس لے گئے اس نے حضرت معاویہ کے پاس دمشق بھیج دیا۔ وہاں اسے بر سرِ عام گشت کرایا گیا اور پھرے جا کر ان کی بیوی کی گود میں ڈال دیا گیا۔

ایسا ہی وحشیانہ سلوک مصر میں محمد بن ابی بکر کے ساتھ کیا گیا جو وہاں حضرت علیؓ کے گورنر تھے۔ حضرت معاویہؓ کا جب مصر پر قبضہ ہو گیا تو انہیں گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا اور پھر ان کی لاش ایک مردہ گدھے کی کھال میں سی کر جلا دی گئی۔

اس کے بعد یہ طرزِ عمل مستقل شکل اختیار کر گیا۔ جن لوگوں کو سیاسی بنیادوں پر قتل کیا جاتا۔ ان کے مرنے کے بعد لاش کو بھی معاف نہ کیا جاتا۔ حضرت حسینؓ کا سر کاٹ کر کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے دمشق لایا گیا اور ان کی لاش پر گھوڑے دوڑائے گئے اور روندا گیا۔

حضرت نعمان بن بشیر جو یزید کے زمانہ تک بنی امیہ کے حامی رہے تھے، مروان کے زمانے میں حضرت عبداللہ بن

Marfat.com

زبیر کا ساتھ دینے کی وجہ سے قتل کیے گئے اور ان کا سر کاٹا گیا اور لے جا کر ان کی بیوی کی گود میں ڈال دیا گیا۔

حضرت مصعبؓ بن زبیر کا سر کوفہ اور مصر میں پھرایا گیا پھر دمشق لے جا کر اسے منظر عام پر لٹکا دیا گیا۔ اس کے بعد اس سر کو شام کے شہروں میں پھرانے کا ارادہ تھا مگر خود عبدالملک بن مروان کی بیوی عاتکہ بنت یزید بن معاویہؓ نے اس پر سخت احتجاج کیا۔ اس نے کہا جو کچھ تم نے اب تک کیا اس پر دل ٹھنڈا نہیں ہوا، اس کی نمائش کیوں کرتے ہو؟ پھر اس سر کو غسل دلوا کر دفن کرا دیا۔

حضرت عبداللہؓ بن زبیر اور ان کے رفقا عبداللہ بن صفوان اور عمار بن حزم کے ساتھ اس سے بھی زیادہ وحشت اور جہالت برتی گئی۔ ان کے سر کاٹ کر مکہ سے مدینہ اور مدینہ سے دمشق لے جائے گئے۔ جگہ جگہ ان کی نمائش کی گئی اور مکہ میں ان کی لاشیں کئی روز تک سولی پر لٹکتی رہیں، یہاں تک کہ وہ سڑ گئیں۔

قطع نظر اس کے کہ جن لوگوں کے مرنے کے بعد یہ سلوک ان کی لاشوں کے ساتھ کیا گیا وہ کس پائے کے لوگ تھے۔ سوال یہ ہے کہ اسلام نے کسی کافر کے ساتھ بھی یہ برتاؤ کرنا جائز رکھا ہے؟

حضرت عبداللہ بن زبیر کا سر کاٹنے کے بعد حجاج نے اس ظلم عظیم کو اور ترقی دی اور ایک وقت میں 18 ,18 لوگوں کے سر کاٹ کر ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچائے اور ان کی تشہیر کی۔

حضرت حسینؓ کی لاش اور سر کے ساتھ جو کچھ کیا گیا اس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ حضرت حسینؓ کے علاوہ بھی تمام شہداء کے سر کاٹ کر کوفے لے جائے گئے اور ابن زیادہ نے نہ صرف برسرِ عام ان کی نمائش کی بلکہ جامع مسجد دمشق میں منبر پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ "خدا کا شکر ہے امیر المومنین یزید کو اللہ نے حسینؓ بن علی پر کامیابی دی اس طرح حق ظاہر ہو گیا اور (نعوذ باللہ) حضرت حسینؓ بن علیؓ اور ان کے ساتھیوں کا کذب سامنے آ گیا۔"

سر کاٹنے، لاشوں کی بے حرمتی اور تشہیر، دولتِ بنو امیہ کی جاری کردہ یہ انسانیت سوز اور وحشت ناک رسم صدیوں بعد تک جاری رہی۔

Marfat.com

کوفہ، عجیب وغریب کیفیات کا حامل شہرِ بے مثال

بنوامیہ اور بنوعباس کی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت بار بار کوفے کا ذکر آتا ہے اور کوفہ والوں کا عجیب وغریب کردار عجیب وغریب سوالات کے ساتھ ذہن کو گھیر لیتا ہے اور کوفہ روئے زمین پر اپنے وقت کی محیر العقول بستی نظر آنے لگتی ہے۔

عبداللہ بن سبا اور ہر ایک سازشی گروہ کے لئے کوفہ کی سرزمین اپنا دامن پھیلا دیتی ہے۔حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد کوفہ والے سب سے آگے نظر آئیں گے۔حضرت علیؓ کی خلافت کا وقت آتا ہے تو کوفہ والے سب سے زیادہ ہمدرد اور ذرا حالات تبدیل ہوتے ہیں تو کوفہ والے ہی آپ کو سب سے زیادہ پریشان کرتے ہیں۔کوفہ والوں نے حضرت حسینؓ کو شہید کرایا اور اس کے بعد کوفہ والے ہی تھے۔جنہوں نے خونِ حسینؓ کا بدلہ لینے کے لئے سب سے زیادہ آمادگی ظاہر کی اور حیرت انگیز طور پر اہلِ بیت سے اپنی محبت کا ثبوت پیش کیا پھر اہلِ کوفہ ہی تھے جو اہلِ بیت کے سب سے بڑے حامی مختار بن عبیدہ ثقفی کے خلاف کوشش اور مصعب بن زبیرؓ کے قتل کا سبب بنے۔

کوفیوں کی نہ جرأت و بہادری یقینی تھی نہ ان کی بزدلی دیرپا۔کبھی انہوں نے اپنے آپ کو بے جگری سے قتل کرایا اور کوفہ کے حاکموں کی علی الاعلان مخالفت کی لیکن کبھی اس طرح مرعوب وخوف زدہ ہو گئے کہ عبیداللہ بن زیاد کے ہر ایک جابرانہ حکم کی تعمیل بلاچون وچرا کرنے لگے۔

اس قسم کی متضاد کیفیت کا سبب دریافت کرنے کے لئے ہم کوفہ کے باشندوں کی حالت وحقیقت سے آگاہ ہونے کی کوشش کریں گے۔فاروقِ اعظمؓ کے عہدِ خلافت میں کوفہ ان لوگوں کی چھاؤنی بنائی گئی تھی جو مجوسی سلطنت کے مقابلے میں برسرِپیکار تھے۔یہاں رہنے والی فوج میں ایک حصہ ان لوگوں کا تھا جو حجاز و یمن اور حضر موت وغیرہ کے رہنے والے تھے۔یہ لوگ فاروقِ اعظمؓ کے اعلانِ عام پر مدینہ منورہ میں آ کر جمع ہوئے اور ان کو فاروقی حکم کے مطابق عراق کی طرف بھیج دیا گیا۔کچھ لوگ ایسے تھے جو عربوں کے ان صوبوں کے باشندے تھے جو عراق کی سرحد پر واقع اور بمقابلہ مدینہ کوفہ اور بصرہ کے زیادہ قریب تھے۔یہ لوگ صحابہ کرام کے ہاتھ پر مسلمان ہو کر اسلامی لشکر میں شریک ہو گئے تھے اور مدینہ منورہ سے انہیں خصوصی تعلق حاصل نہ تھا۔نہ انہوں نے کبھی مدینہ دیکھا تھا۔کچھ لوگ ایسے تھے جن کی زبان عربی تھی،وہ مجوسی سلطنت کی رعایا تھی اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایرانیوں سے لڑتے تھے۔کچھ وہ سردار تھے جو مدینہ کے رہنے والے مہاجرین وانصار میں سے تھے جب اس لشکر کی چھاؤنی کوفہ قرار پائی اور خلیفہ وقت کا نائب اور عراقی لشکر کا سپہ سالار کوفہ میں رہنے لگا تو ایرانی شہروں کے بہت سے شہریوں کو ان کی

Marfat.com

ضرورتوں نے دارالصدر کوفہ سے تعلقات رکھنے پر مجبور کیا۔ کسریٰ اور کیکاؤس خسرو کے ملکوں کو فتح کرنے والے لشکریوں کی فاتحانہ اور حاکمانہ زندگی جو کوفہ میں بسر ہوئی تھی، یقیناً بہت خوش گوار ہوگی۔ مالِ غنیمت کی فراوانی بھی ضرور محرک بنی ہوگی۔ لہٰذا اس لشکر کا بیشتر حصہ کوفہ ہی میں زمین گیر ہوگیا اور کوفہ ایک فوجی چھاؤنی اور عارضی قرارگاہ نہ رہا بلکہ بہت جلد ایک عظیم الشان شہر بن گیا اور بالآخر اس نے دارالسلطنت اور دارالخلافہ کی صورت اختیار کرلی اور اس شہر کی آبادی میں چونکہ بڑا عنصر اس شہر کی آبادی کا فوجیوں پر مشتمل تھا۔ اس لیے یہاں علم و تعلم، درس و تدریس اور تہذیب و اخلاق و تہذیب نفس کے سامان بہت کم تھے۔ لہٰذا مجموعی طور پر شہر کا مزاج متلون اور اخلاقی حالت متغیر رہی۔ ظاہر ہے ایسی بستی میں علم و معقولات اور فہم و تدبر کو تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ جو کچھ کیا جذبات سے مغلوب و متاثر ہوکر ہی کیا۔ یہی وجہ تھی کہ جس شخص نے ان کو رضامند کرنا چاہا وہ رضامند ہوگئے، جب وفاداری یاد دلائی تو وہ وفاداری کی شرائط پوری کرنے لگے، یعنی فوجی ہونے کے ناطے کوفیوں کی اپنی کوئی سوچ فکر نہ تھی۔

کوفہ کے اندر جذبات تھے دماغ نہ تھا، جوش تھا عقل نہ تھی، خروش تھا مگر غور و فکر کا سکون نہ تھا۔ ایسی حالت میں کوفہ والوں سے ایسی ہی باتوں کی توقع ہوسکتی تھی جو ظہور میں آئیں۔ جب چند نسلیں گزر گئیں اور زمانے کے حوادث نے اس مختلف الاجزاء مجموعے کو کیمیاوی امتزاج سے ایک خاص مزاج دے دیا۔ پھر کوفہ کی متلون مزاجی بھی رفتہ رفتہ دور ہوگئی۔

95ھ میں حجاج کا انتقال ہوگیا۔ دولت بنی امیہ کا مدارالمہام بھی وہی تھا اور ممالک محروسہ میں افراتفری، بے چینی اور جذباتی ناہمواری کا سبب بھی وہی ذاتِ شریف تھی۔ اس کی موت نے ایک عالم کو سکون و اطمینان دیا۔ کوفہ کے گھر گھر میں علم و تعلم کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ منصور عباسی کی تمام تر ریشہ دوانیوں اور خونریزیوں کے باوجود یہ کوفہ ہی تھا جہاں سے نعمان بن ثابت امام اعظم اور امام ابوحنیفہ بن کر نکلے۔

واقعہ عجیبہ

حضرت زین العابدینؓ فرماتے ہیں کہ وہ کوفے میں تھے کہ ایک کوفی انہیں اپنے گھر لے گیا اور ان کی خدمت اور فرمانبرداری کی انتہا کردی۔ حضرتِ والا فرماتے ہیں کہ مجھے یقین ہوگیا یہ آدمی میرا سب سے بڑا غمگسار اور ہمدرد ہے۔ کچھ دن گزرے تھے کہ عبیداللہ بن زیاد نے اعلان کروایا کہ جو حضرتِ والا کو اس کے پاس لائے گا اسے بھاری انعام سے نوازا جائے گا۔ اب وہی خدمتگار کوفی مجھے ابن زیاد کے پاس لے گیا تاکہ انعام حاصل کرسکے۔ ابن زیاد نے امام کے قتل کرنے کا حکم دیا۔ حضرت والا کی پھوپھی حضرت زینب بھی ابن زیادہ کے دربار میں موجود تھیں۔ وہ چیخ اٹھیں کہ خاندان نبوت کے اور کتنے لوگوں کو قتل کرنا ہے اگر زین العابدین کو قتل کرنا ہے تو مجھے بھی قتل کردو۔ اس پر ابن زیاد کو شرم آگئی اور امام زین العابدین کی جان بچ گئی۔

Marfat.com

زیاد بن ابی سفیان اور عبیداللہ بن زیاد

زیاد کی ماں حارث بن کلدہ ثقفی کی لونڈی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک ایرانی دہقان بیمار ہوا تو طبیب حارث بن کلدہ نے اس کا علاج کیا تو انعام میں اس نے ایک ایرانی لونڈی طبیب کو دی۔ جس کا نام طبیب حارث نے سمیہ رکھا۔ حارث نے سمیہ سے اولاد بھی پیدا کی اور آخر میں ایک رومی غلام جس کا نام عبید تھا، سے سمیہ کا عقد کر دیا لیکن سمیہ ایک بدچلن عورت تھی۔ روایات میں ہے کہ امیر معاویہ کے والد ابوسفیان کفر کے زمانے میں طائف کسی ضرورت سے گئے تھے۔ وہاں کے بھٹی خانے میں شراب پی اور بھٹی خانے کے کلال جس کا نام ابومریم تھا، اس سے عورت کی خواہش ظاہر کی۔ ابومریم نے سمیہ کا نام لیا۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ سن کر ابوسفیان نے کہا تھا، اسی کو لے آؤ خواہ اس کی چھاتی دراز ہی کیوں نہ ہو اور بغل سے اس کے بدبو ہی کیوں نہ آ رہی ہو۔ یوں ابوسفیان نے سمیہ سے مقاربت کی۔ کہتے ہیں کہ اس کے کچھ عرصہ بعد زیاد پیدا ہوا۔ چونکہ سمیہ باضابطہ عبید رومی کی بیوی تھی اس لئے زیاد ابن عبید ہی کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن زیاد جب جوان ہوا تو اس سے غیر معمولی صلاحیتوں کا اظہار ہونے لگا۔ حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں اس کے ہوش وگوش خطابت وظلم اور تدبر کی شہرت ہو چکی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب زیاد کی تعریف ہونے لگی تو تو ایک دن قریش کے بڑے بوڑھوں کے مجمع میں زیاد کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس وقت ابوسفیان نے کہا کہ زیاد کے باپ کو میں جانتا ہوں جس نے اس کی ماں کے رحم میں اس کو ڈالا۔ اسے بھی جانتا ہوں اور یوں بھی ابوسفیان اشارے کنائے سے کبھی کبھی زیاد کا باپ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ جب علیؓ اور امیر معاویہؓ میں جنگ ہوئی تو زیاد حضرت علی کے طرفداروں میں تھا۔ امیر معاویہ نے اپنے والد کے اشاروں کنایوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آخر زیاد کو اپنا بھائی بتا کر اپنا ہمنوا بنا لیا۔ اس کے بعد لوگ زیاد کو زیاد بن ابی سفیان کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

امیر معاویہؓ نے زیاد کی ذہانت وخطابت اور دوسری خوبیوں کے ذریعہ اپنی سلطنت کو استحکام بخشنے کے لئے بڑا فائدہ اٹھایا۔ زیاد کو مختلف حصوں کی ولایت عطا کی اس نے بھی صوبوں میں انتظامی معاملات کی درستگی میں حد درجہ سختی کر کے امیر معاویہؓ کے دور حکومت کو مستحکم اور مضبوط بنایا۔

یزید کی بیعت سے پہلے زیاد کو بصرہ وکوفہ کی حکومت بالخصوص اس لئے سپرد کی کہ اہل عراق کو حیلے بہانے سے رام کر کے بیعت یزید پر تیار کیا جائے۔ زیاد کوفہ میں دو ہزار آدمیوں کے ساتھ پہنچا اور آتے ہی کوفہ کی مسجد میں خطبہ سنانا شروع کر دیا تو اہل کوفہ نے جو اپنے حاکموں کی تحقیر اور حکومت وقت کی خلاف ورزی کے عادی تھے زیاد کے ساتھ بھی تمسخرانہ برتاؤ شروع

کیا۔ چنانچہ چاروں سمت سے زیاد کی طرف سنگریزے آنے لگے۔ زیادہ نے خطبہ بند کر دیا اور دروازے پر کرسی بچھا کر بیٹھ گیا اور ہمراہیوں کو حکم دیا کہ مسجد کا محاصرہ کر کے کسی شخص کو باہر نہ آنے دیں۔ خود مسجد کے دروازے پر بیٹھا چار چار لوگوں سے قسمیں لینے لگا کہ انہوں نے سنگریزے پھینکے ہیں یا نہیں؟ کل تیس آدمی ایسے نکلے جنہوں نے سنگریزے پھینکے تھے۔ باقیوں کو چھوڑ کر ان تیس آدمیوں کے ہاتھ کٹوا دیے۔ زیاد کے اس سخت رویے سے کوفے والے چند ہی روز میں سیدھے ہو گئے اور زیاد نے چھ ماہ بصرہ میں اور چھ ماہ کوفہ میں رہنے کا فیصلہ کیا۔

زیاد نے امیر معاویہؓ سے فرمائش کی تھی کہ اسے عراق و فارس کے علاوہ حجاز و عرب کی حکومت عطا کی جائے۔ امیر معاویہؓ نے اس فرمائش کو قبول و منظور کر لیا تھا۔ اہل حجاز اس خبر کو سن کر خائف ہوئے اور عبداللہ بن عمرؓ کے پاس گئے کہ کس طرح زیاد کی حکومت سے محفوظ رہیں۔ حضرت عبداللہؓ نے قبلہ رو ہو کر دعا کی اور سب نے آمین کہی۔ اس دعا کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیاد کی اُنگلی پر ایک دانہ نکل آیا اور اسی میں وہ فوت ہو گیا۔

زیاد کی وفات کے وقت عبیداللہ بن زیاد کی عمر پچیس سال تھی۔ اس نے بڑی منت سماجت کے بعد امیر معاویہؓ سے بصرہ، خراسان و فارس کی حاکمیت کا فرمان حاصل کیا۔ کچھ عرصہ بعد امیر معاویہ نے خراسان کا صوبہ عبید بن زیاد کی ولایت سے نکال کر سعید بن عثمان کو دے دیا۔ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ عبید کو امیر معاویہؓ کے دورِ حکومت میں خاص اہمیت نہیں دی گئی۔ امیر معاویہؓ کے بعد جب یزید تخت نشین ہوا تو اس نے دوبارہ ابن زیاد کو فارس و عراق کا حکمران بنا دیا۔ تا کہ قتل حسینؓ کی صورت میں اس کی بدنصیبی اور بدقسمتی کھل کر سامنے آ جائے۔

عبیداللہ بن زیاد کو توقع تھی کہ قتل امام حسینؓ کے بعد اس کی خوب قدر افزائی ہو گی لیکن یزید نے واقعہ کربلا کے بعد سلم بن زیاد کو خراسان کا حاکم مقرر کر کے ایران کے بعض صوبے بھی جو بصرہ سے تعلق رکھتے تھے، سلم کے ماتحت کر کے اسے کوفہ کی طرف روانہ کر کے ایک خط ابن زیاد کے نام دیا کہ تمہارے پاس عراق کی جس قدر فوج ہے، اس میں سے چھ ہزار آدمی جن کو سلم پسند کرے اس کے ساتھ کر دو۔ ابن زیاد کو یہ بات ناگوار گزری اور امام حسینؓ کے قتل پر افسوس کرنے لگا کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو یزید کو میری احتیاج رہتی اور وہ میری عزت و مرتبہ بڑھانے میں کوتاہی نہ کرتا لیکن اب وہ بے پروا ہو گیا ہے اور ملک اور فوج دونوں کو میرے تصرف سے نکالنے کے درپے ہے۔ سلم نے جب لشکر کوفہ سے منتخب لوگوں کو ساتھ لے کر سرداران لشکر سے کہا کہ تم میں سے کون کون میرے ہمراہ خراسان کی طرف چلنا چاہتا ہے تو ہر ایک شخص نے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ابن زیاد نے رات کے وقت سرداران لشکر کے پاس اپنا آدمی بھیجا اور کہا کہ تعجب ہے تم سلم کو میرے اوپر ترجیح دیتے ہو۔ سرداران لشکر نے جواب دیا اور کہلا بھیجا کہ آپ کے پاس رہ کر تو ہمیں اہل بیت کے ساتھ قتال کرنے اور ان کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑے ہیں لیکن سلم کے ساتھ جا کر ہم کو ترکوں اور مغلوں کے ساتھ جہاد کرنے کا موقع ملے گا۔ اگلے دن سلم چھ ہزار چیدہ آدمی لے کر کوفہ سے خراسان کی جانب روانہ ہوا اور عبیداللہ بن زیاد کو واقعہ کربلا کے بعد ندامت و افسوس کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

عبدالملک بن مروان کے دور میں ابن زیاد کو موصل کا گورنر بنا دیا گیا۔ مختار ثقفی (قاتلین حسینؓ سے انتقام لینے والا) کے

سپہ سالار ابراہیم بن مالک اشتر نے بصرہ پر حملہ کر دیا۔ایک خونریز جنگ کے بعد ابن زیاد اور شامیوں کا دوسرا بڑا سردار حصین بن نمیر بھی مارا گیا۔ابن زیاد کا جسم جلا دیا گیا اور اس کا سر کاٹ کر مختار کے پاس کوفہ کی جانب روانہ کر دیا گیا۔

Marfat.com

نصیر الدین طُوسی

(599ھ/1201ء بمطابق 672ھ/1274ء)

نصیر الدین ابوجعفر محمد بن الحسن ایران کا منجم مورخ اور شیعہ سیاستدان طوس میں پیدا ہوا۔ اسماعیلی حاکم ناصر الدین ابراہیم بن ابی منصور کے مہتمم کی حیثیت سے سرتخت میں ملازمت شروع کی اسے معلوم ہوا کہ طوسی دربارِ خلافت میں جانا چاہتا ہے تو اسے نظر بند کر دیا گیا لیکن اس کی ملازمت بحال رکھی اور اجازت دے دی کہ وہ علم ہیئت میں اپنی تحقیق جاری رکھے۔

1266ء میں اس نے حشیشن کے شیخ رکن الدین خورشاہ کو ہلاکو کے حوالے کرا دیا اور پھر ہلاکو کا معتمد مشیر بن کر فتح بغداد کی مہم میں اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ہلاکو کے ساتھ ابن علقمی کے نامہ و پیغام کا تبادلہ، ہلاکو کو فتح کی یقین دہانیاں اور آخری خلیفہ معتصم باللہ کی موت تک اہم کردار ادا کیا۔ ابن علقمی اور طوسی دونوں شیعہ تھے۔ دونوں نے سنی المسلک خلافت بغداد اور بغداد کی آبادی، عمارات، کتب خانے، غرض ہر خیر کی تباہی و بربادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

مراقہ میں اس نے ہلاکو کے حکم سے ایک رصدگاہ قائم کی، پھر ہلاکو کا وزیر اور معتمد اوقاف بن گیا۔ اس نے اپنی ہوشیاری اور چاپلوسی سے اپنے اثر و اقتدار کو مرتے دم تک قائم رکھا۔

طوسی اثنا عشری فرقے سے گہری ہمدردی رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ ہمہ گیر لیاقت اور قابلیت کے باعث ایران کی شیعہ مقتدر جماعت کا سربراہ بن گیا اور خلافت عباسیہ کا مخالف بن کر منگولوں سے جا ملا۔ یہ اس کا اثر و رسوخ تھا کہ منگولوں کی پیدا کردہ عالم گیر بربادی میں شیعوں پر کچھ تھوڑا بہت رحم کیا گیا۔ جنوبی عراق میں ان کے مقدس مقامات دست درازی سے محفوظ رہے۔ علاوہ ازیں ہلاکو کی یلغار کے بعد بھی جب اور جہاں جہاں منگول حملہ آور ہوئے شیعوں نے منگولوں کا ساتھ دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ شیعوں کے ساتھ مقامی عیسائی آبادیاں بھی منگولوں کو خوش آمدید کہنے میں پیش پیش ہوتی تھیں۔

طوسی کی دو کتابیں "تجرید العقائد" اور "فوائد العقائد اصول و عقائد" مذہب پر ہیں جن کی اس کے ہم مذہب اور ہم مسلک بے حد قدر و منزلت کرتے ہیں۔ ان پر کئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ وہ راسخ العقیدہ شیعہ اور اماموں کا عقیدت مند تھا۔ اس کا ثبوت اس کی کتاب کتاب الاشراف سے ملتا ہے۔ تصوف کا قائل اور حلاج کا مداح تھا۔ فقہ میں اس نے قانون وراثت پر کتابیں لکھیں۔ اس کی ایک ادبی تصنیف "اخلاقِ ناصری" ہے۔ اپنے فرقے سے عقیدت کے باوجود اس کے تعلقات دوسروں سے بھی خوشگوار تھے۔ اس نے جلال الدین رومی سے خطوط کے ذریعہ اور نجم الدین کاتبی سے بالمشافہ علمی مسائل پر

Marfat.com

تبادلہ خیال کیا۔

طوسی کی طبی کتابیں علمی اعتبار سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں لیکن طوسی کی وہ محنت قابل داد ہے جو اس نے ثابت بن قرہ قطا بن لوقا اور اسحاق بن حسین کے ترجموں کی صحت و اشاعت میں کی جو انہوں نے یونانی مہندسوں اور ہیئت دانوں کی کتابوں سے کیے تھے۔

Marfat.com

بیرم خان، اکبر اعظم کا اتالیق

(14 جمادی الاول 968ھ/ 31 جنوری 1561ء)

ہندوستان کی مغل سلطنت کا ایک سردار خانِ خاناں لقب، والد کا نام سیف علی بیگ تھا جو غزنہ کا گورنر تھا۔ بابر کی وفات کے بعد اس نے ہمایوں کی ملازمت اختیار کرلی۔ بیرم خاں بدخشاں اور بعض کے نزدیک غزنہ میں پیدا ہوا۔ وہ بہارلو قوم کا ترکمان تھا۔ اس کے آباؤ اجداد نے خاندانِ تیموری کی بڑی خدمت کی تھی۔ بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کے انتقال کے بعد وہ بلخ چلا گیا اور وہاں تعلیم پائی۔ اس کا مطالعہ کتب بڑا وسیع تھا اور دربار کے آداب سے اچھی طرح واقف تھا۔ سولہ سال کی عمر میں ہمایوں کی ملازمت اختیار کی۔ اس وقت ہمایوں بدخشاں کا گورنر تھا۔ بعد میں ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آ گیا اور چوسا وقنوج کی لڑائیوں میں شرکت کی۔ ان جنگوں میں ہمایوں نے بری طرح شکست کھائی۔ بیرم خاں بھی جان بچا کر میدان سے بھاگ نکلا۔ اس نے کچھ عرصہ گجرات کے بادشاہ سلطان محمود کے ہاں ملازمت کی لیکن 950ھ/ 1543ء میں وہ جونپور کے مقام پر ہمایوں سے دوبارہ ملا۔ اس وقت ہمایوں تخت ہندوستان کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بیرم خان نے شاہی فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے ہمایوں کے لئے فتوحات حاصل کیں۔ سب سے بڑی فتح ماچھی واڑے کے مقام پر سکندر سوری کو شکست دی۔ یہ واقع 964ھ/ 1555ء کو پیش آیا۔

963ھ/ 1558ء میں بیرم خاں کو اکبر کا اتالیق مقرر کیا گیا اور خان بابا کا لقب ملا۔ جب اکبر کو پنجاب کا حاکم بنایا گیا تو بیرم خاں بھی پنجاب آ گیا۔ جب ہمایوں کی اچانک موت کی اطلاع ملی تو بیرم خاں نے اینٹوں کا عارضی تخت بنا کر اکبر کی تاجپوشی کا اعلان کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب ہیمو بقال جو شیر شاہ سوری کی افواج کا سپہ سالار تھا۔ نے دہلی پر حملہ کیا تو 964ھ/ 1556ء میں پانی پت کے میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ بیرم خان نے ہیمو کو قتل کرا دیا اور ہیمو کی شکست کے بعد اکبر کا ہندوستان پر مکمل قبضہ ہو گیا۔ اس وقت بیرم خاں کا اقتدار و اختیار انتہائی عروج پر تھا۔ اکبر ابھی کم سن تھا اس لئے اکبر کی طرف سے بیرم خاں ہی حکومت کرتا رہا۔ اس دوران بیرم خاں نے سلیمہ سلطان بیگم سے جو اکبر کی پھوپھی زاد بہن تھی۔ شادی کر لی۔ اس طرح وہ شاہی خاندان کا ایک فرد بن گیا۔ اور اس کی شخصی عظمت و اقتدار میں اضافہ ہو گیا۔

بیرم خاں اکبر کی تفریحات میں دخل دیتا اور چاہتا تھا کہ اکبر شاہانہ طور و اطوار اختیار کرے۔ چنانچہ اس پر شہزادہ ناپسندیدگی کا اظہار کرنے لگا۔ اسی زمانے میں بیرم خاں سے ایک اور غلطی ہوئی، وہ یہ کہ اس نے دہلی کے رہنے والے ایک

Marfat.com

شخص گدائی کمبوہ کو صدر الصدور مقرر کر دیا۔ یہ بات تورانی سرداروں کو بہت ناگوار گزری اور وہ بیرم خاں کے خلاف ہو گئے۔ ان تمام باتوں نے اکبر کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی اور دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔

جب بیرم خاں نے حالات کا یہ رخ دیکھا تو اس نے لڑائی کے ذریعے اس قصے کو ختم کرنا چاہا۔ چنانچہ حج کے بہانے سے جالندھر آیا اور وہاں قبضہ جمانا چاہا۔ شاہی فوجوں اور اس کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی جس میں بیرم خاں کو شکست ہوئی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اکبر سے معافی کا خواستگار ہو۔ شہنشاہ اکبر نے نہ صرف اسے معاف کر دیا بلکہ پچاس ہزار روپیہ سالانہ پنشن بھی مقرر کر دی۔ اس کے بعد اس نے اکبر سے حج کی اجازت مانگی۔ وہ حج کے ارادے سے گجرات گیا لیکن ایک شخص مبارک خاں لوہانی نے، جس کے باپ کو بیرم خاں نے شہنشاہ کے زمانے میں لڑائی میں قتل کر دیا تھا۔ اسے مار ڈالا۔ اس کی تجہیز و تکفین بھی اچھی طرح نہ ہو سکی۔ بعد میں بیرم کی وصیت کے مطابق اس کی نعش کو مشہد (ایران) منتقل کر کے امام موسیٰ رضا کے روضے کے متصل ایک اونچے گنبد کے مقبرے میں دفن کر دیا گیا۔

بیرم خاں نے ایک چار سالہ بچہ عبدالرحیم خان خاناں چھوڑا۔ بیرم خاں علماء کا بڑا قدردان تھا۔ ذہین عالم فاضل، ترکی اور فارسی زبانوں کا اچھا شاعر تھا۔ اس کے مخالفین اس کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کی دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔ بادشاہ اکبر نے ہندوستان میں دین اسلام کے ساتھ جو مذاق کیا تھا، بیرم خاں کو اس سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اکبر کی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی حصہ بیرم خاں ہی کا تھا۔

Marfat.com

خانِ اعظم مرزا عزیز کوکلتاش

مرزا عزیز اکبر اعظم کا رضاعی بھائی تھا۔ وہ اکبر کا رضاعی بھائی کیسے بنا۔ اس کا ذکر ہم اکبر کے باب میں کر آئے ہیں۔ اکبر اور عزیز ہم عمر تھے اور بچپن میں اکٹھے کھیلے تھے۔ اکبر تخت نشین ہوا تو اس نے اس خاندان سے یگانگت قائم رکھی۔ مرزا عزیز کے والد مرزا شمس الدین کو رضاعی باپ کا خطاب دیا، اپنی والدہ اور دوسری بیگمات جو ابھی کابل میں تھیں، لانے کے لئے بھیجا۔ پنجاب کا صوبے دار مقرر کیا۔ بیرم خاں کو شکست بھی اسی نے دی تھی۔ اس پر اکبر نے اسے خانِ اعظم کا خطاب دیا تھا اور جب 1563ء میں مرزا شمس الدین ادہم خاں کے ہاتھوں مارا گیا تو اکبر نے مرزا عزیز کی بہت دلداری کی۔ چند روز بعد خانِ اعظم کا خطاب عطا کیا۔ ہمیشہ پیار سے مرزا عزیز کو کہا کرتا تھا۔ اسے ہر وقت مصاحبت میں رکھتا۔ ہاتھی پر سوار ہوتا تو اکثر اس کو خواصی میں بٹھاتا۔ مرزا کوکہ بھی اپنے آپ کو بادشاہ کا عزیز اور بھائی سمجھتا تھا۔ اکبر کے ساتھ کھیل کود کر جوان ہوا تھا، صاف گوئی اس کا تر کانہ شیوہ تھا۔ جو سمجھ میں آتا خواہ وہ آدابِ شاہی کے خلاف ہو یا موافق، بے دھڑک کہہ دیتا۔ اکبر کبھی اسے برا نہ مانتا۔ بلکہ کہتا کہ میرے اور مرزا عزیز کے درمیان دودھ کا دریا بہہ رہا ہے۔ اگر وہ مجھ پر تلوار کھینچ کر بھی آئے تو جب تک وار نہ کرے میں حملہ نہیں کروں گا۔

خانِ اعظم کی تعلیم و تربیت توجہ سے ہوئی۔ وہ نہ صرف فنونِ سپہ گری سے پوری طرح واقف تھا بلکہ مورخین اس کی انشا پردازی اور لطیفہ گوئی کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ علم سیر و تاریخ میں اسے پورا دخل تھا لیکن اس کا اصل مرتبہ بطور ایک سپہ سالار اور رکن سلطنت کا تھا۔ اس نے کئی لڑائیوں میں حصہ لیا اور کارہائے نمایاں انجام دیے۔ گجرات کی فتح میں اس کا ہاتھ تھا اور جب ایک زمانہ میں وہ تھوڑی سی فوج کے ساتھ غنیم کی بے شمار فوج کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا اور اسے پٹن میں محصور ہونا پڑا تو اکبر فتح پور سیکری سے مارا مار کرتا ہوا شتر سوار فوج لے کر اس کی کمک کو پہنچا اور ستائیس دن کی منزلیں صرف نو دن میں طے کر کے عوام کو حیران کر دیا۔ اس کے بعد اکبر کی بدعتوں کے باعث جب بنگال میں بغاوت ہو گئی اس کے باوجود کہ خانِ اعظم بھی اکبر کی بدعتوں کا مخالف تھا۔ اس نے ایک وفادار رکن سلطنت کی طرح جان کو خطرے میں ڈال کر اس بغاوت کو فرو کیا۔

تاریخ میں خانِ اعظم کا بلند مقام اس لئے ہے کہ اکبر کے ساتھ ابوالفضل جیسے اہل علم بھی تھے جو اکبر کو راہ راست سے بھٹکائے رکھتے تھے لیکن خانِ اعظم نے دربار اکبری کو راہ راست پر رکھنے میں پوری جرأت سے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنا دینی فریضہ ادا کیا۔ بالآخر حالات کو بڑی حد تک سدھارنے میں کامیاب ہو گیا۔

Marfat.com

خوشامدی درباریوں کو خانِ اعظم کی حق گوئی کی روش سخت ناپسند تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مسلسل سازشوں اور چالبازیوں سے خانِ اعظم کو اکبر سے جدا کر کے گجرات بھجوا دیا تو وہ چھ سال تک دربارِ اکبری میں نہ آیا۔ حالانکہ قاعدہ تھا کہ اطراف کے گورنر گاہ بگاہ دربار میں حاضری دیتے رہیں۔ اس کی طلبی میں کئی فرمان لکھے گئے لیکن وہ پھر بھی نہ آیا۔ الغرض اس ساری خط و کتابت کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اسی دوران خانِ اعظم نے جونا گڑھ پر چڑھائی کر دی اور اسے فتح کر لیا۔ قریب کے بعض ہندو راجاؤں کو شکست دے کر بڑا زر و مال جمع کیا اور تمام اہل و عیال کو ساتھ لے کر دیو کی بندرگاہ سے مکہ معظمہ روانہ ہو گیا۔

خانِ اعظم کے مکہ چلے جانے سے اکبر کو بڑا رنج پہنچا۔ خانِ اعظم کی والدہ جو اکبر کی رضاعی ماں تھی۔ نیم جان ہو گئی۔ اکبر کو اس وجہ سے بھی تشویش تھی لیکن اس نے بڑے حوصلے اور تدبر سے کام لیا۔ خانِ اعظم کی تلخ کلامیوں کو بالکل پی گیا۔ بلا اجازت جن حالات میں ملک سے چلا گیا تھا، اس پر بھی کسی خفگی کا اظہار نہ کیا۔ خانِ اعظم کے جو بیٹے اور عزیز دارالسلطنت میں رہ گئے تھے ان کے منصب بڑھا دیئے اور خانِ اعظم کو ایک بڑا محبت بھرا خط لکھا۔ اس خط کو ابوالفضل نے تحریر کیا۔ اس میں لکھا کہ ہم تمہاری آمد کے منتظر تھے. جب یہ پتہ چلا کہ تم زیارت حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً کو چل دیے اور اس دہشتناک سمندر میں اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے گئے تو بڑا تعجب ہوا کہ ایسا مخلص اور متحن الخدمت ملازم ہمارے حقوق نظر انداز کر کے ہم سے اجازت لئے بغیر رخصت ہو گیا۔ نہ ہی اس نے اپنی والدہ شریفہ کی رضامندی حاصل کی۔ حالانکہ سارے اہل و عیال نے جملہ معاملات بالخصوص اس طرح کی عبادت میں ماں کی رضامندی کے بغیر کوئی کام نہیں کیا اور اس کی اجازت کے بغیر ان عبادات و اطاعات کو باعث ثواب نہیں سمجھا۔ اگر اس مقام مقدس تک پہنچنے کا شوق دامن گیر تھا تو چاہیے تھا کہ اجازت لیتے. اگر بہت جلدی تھی تو کم از کم اہل و عیال کو یہاں بھیج دیتے۔ خیر اس خاندان کی خدمات متحسن ایسی ہیں اور بالخصوص جی جی (خانِ اعظم کی حقیقی والدہ اور اکبر کی رضاعی ماں) کی خاطر اشرف ہمیں اس طرح عزیز ہے کہ اگر ہمیں ملال ہوا بھی تو وہ عارضی تھا۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم پردیس میں مارے مارے پھرو۔ چاہیے کہ تم یہاں پہنچنے کا قصد کرو اور ہمیں اپنی آمد سے دلشاد کرو اور جی جی کے زخم دل پر جس کی تمہارے فراق میں یہ حالت ہے کہ خدا کسی کو نہ دکھائے. مرہم رکھو اور دنیوی و اخروی عقوبت و عذاب سے نجات حاصل کرو۔

اکبر کے خط کے جواب میں خانِ اعظم نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر آداب درباداری کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر ایک عرضداشت لکھی لیکن اس کا عندیہ بالکل واضح تھا۔ اس میں ایک تو اس امر کی شکایت تھی کہ ہندوؤں کو اعلیٰ مناصب سے نوازا گیا ہے اور لکھا کہ صفحاتِ تاریخ میں یہ بات ثبت رہ جائے گی اور بدنامی کا باعث ہو گی کہ کافروں کو مسلمانوں پر ترجیح دی گئی۔ خانِ اعظم نے مزید یہ بھی لکھا کہ مجھ پر آپ نے اتنی عنایات کیں، خانِ اعظم اور عزیز کوکہ بنایا، گجرات کی حکومت سے سرفراز کیا اور اس طرح مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پہنچانے کا انتظام کیا۔ میرے لئے تو حضور کے ساتھ یہ انتہائی گستاخی اور بے ادبی ہے کہ وہ جسم جو آپ کے انعام و احسان سے پرورش یافتہ ہوا ہے "کافرانِ ہندوستان" کے ساتھ ایک ہی جگہ سپرد خاک کیا جائے۔ خانِ اعظم نے اس پر بھی زور دیا کہ جو لوگ اعلیٰ حضرت کو دینِ محمدیؐ سے بیگانہ اور مجتنب بناتے ہیں ہرگز ہرگز آپ کے خیر

خواہ نہیں۔ دنیا ناپائیدار ہے اور ان دو تین خوشامد گو آخرت بد نیا فروش لوگوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ اس سے پہلے بھی بادشاہ گزرے ہیں، جنہیں بڑا جاہ و جلال حاصل تھا، کسی کے دل میں یہ دغدغہ نہ ہوا کہ وہ دین محمدیؐ میں ترمیم اور دعویٰ پیغمبری کا خیال کرے اور شیخ سعدی کا یہ شعر نقل کیا:

خلاف پیمبر کسے رہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

(پیغمبر اسلام کی تعلیمات کے خلاف چل کر کسی منزل پر نہیں پہنچا جا سکتا)

اور قسم دے کر لکھا کہ عزیز کے سوا آپ کی نیک نامی کا خواہاں کوئی نہیں۔ سب خوشامد گو اور اپنا الو سیدھا کرنے والے ہیں۔ میں آپ کی نیک نامی کے سوا ایک لفظ زبان سے نہیں نکالتا۔ میں تو اس دھن میں لگا ہوں کہ حجاز میں مستحق لوگوں کے وظیفے مقرر کروں اور حضور کے نام پر ایک ایسا مدرسہ قائم کروں جس کی مورخانِ جہاں ہمیشہ تعریف کریں۔ جس میں علوم دینی کی تعلیم اور فکر شعر یعنی توحید و منقبت کے علاوہ حضور کی دولتِ روز افزوں کے لئے دعا ہوتی رہے۔

بادشاہ کی خدمت میں خانِ اعظم کی عرضداشت کوئی شخصی مسئلہ نہ تھا بلکہ اصول کا سوال تھا۔ بادشاہ کو طے کرنا تھا کہ اصل خیر خواہ کون ہیں اور اس کے لئے نیک نامی کا رستہ کون سا ہے؟ بادشاہ نے جو فیصلہ کیا اس کا اندازہ اسی منصب و اقتدار سے ہو سکتا ہے جو خانِ اعظم کو واپسی پر ملا۔ بادشاہ نے خانِ اعظم کو اپنے فرمان میں اول و اولیٰ امیر الامرا اور امیر المعاملہ لکھا، یعنی معاملات خانِ اعظم کے سپرد کئے جائیں گے اور اس کا طریق کار چلے گا۔

خانِ اعظم نے حجاز میں کارِ خیر کا ایک وسیع سلسلہ قائم کیا۔ تاریخوں میں آتا ہے کہ خانِ اعظم نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بڑا خرچ کیا اور نام چھوڑا۔ روضۂ نبویؐ کے متعلقہ اخراجات کا حساب بنوایا اور پچاس سال کا خرچ نذر کیا۔ اسی حساب سے مسجد نبوی کے قالین، سائبان، پردے، سراپردے، اسی طرح متعدد حجرے خرید کر وقف کئے اور شریف مکہ اور اس کے اہل و عیال کو اس قدر زر و جواہر دیا کہ اس کا حساب نہیں ہو سکتا۔

خانِ اعظم کی حجاز سے واپسی کے بعد کا واقعہ ہے کہ پرتگالی پادریوں نے لمبی تگ و دو اور حیلے بہانے سے اکبر سے ایسا فرمان حاصل کر لیا کہ کوئی شخص عیسائی ہونا چاہے تو اس کی مزاحمت نہ کی جائے۔ یعنی وہ عیسائی مذہب قبول کرنے میں آزاد ہوگا۔ خانِ اعظم نے اس فرمان کی شدید مخالفت کی اور اس حکم کو خلافِ اسلام سمجھتے ہوئے بہت بگڑے۔ علاوہ ازیں اس دور کے حاکم پنجاب نے اس فرمان کے حاصل کرنے کے بعد پرتگیزی پادریوں کی خوب گت بنائی۔ اکبر کے ہاتھوں اس کی جہالت یا مطلق العنانی کی وجہ سے بعض اوقات ایسے احکامات جاری ہو جاتے تھے جن کا شرعِ اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہوتا تھا لیکن خانِ اعظم کے زمانۂ اقتدار میں دار الحکومت اور اطراف میں فضا بڑی حد تک اسلام کے حق میں تھی اور بادشاہ کے غیر شرعی احکامات پر کھل کر اعتراضات کئے جاتے تھے۔

خانِ اعظم کا زمانۂ اقتدار اکبر کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس موقع پر اس سے ایک سخت غلطی یہ ہوئی کہ اس نے اکبر کا جانشین جہانگیر کے بیٹے خسرو کو بنانا چاہا جس سے اس کی بیٹی بیاہی گئی تھی۔ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور جہانگیر نے اپنے بیٹے اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ اکبر کے اہم ساتھی شیخ فرید کے کہنے پر نرمی کا سلوک کیا۔ اس کے باوجود جب خسرو نے

Marfat.com

بغاوت کردی تو ایرانی امرا جو جہانگیر کے دربار میں بڑے بااثر تھے، کے کہنے پر خانِ اعظم کو گوالیار کے قلعے میں قید کردیا۔ وہاں سے رہائی بڑے دلچسپ طریقے سے ہوئی۔ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ اکبر بادشاہ مجھے خواب میں ملے اور کہا کہ بابا خانِ اعظم کا گناہ میری خاطر بخش دے۔ جہانگیر نے اس خواب کے بعد اسے قلعہ سے بلایا اور آزاد کردیا اور تھوڑے عرصے کے بعد اس کا منصب بھی بحال کردیا۔

عہد جہانگیری میں خانِ اعظم کا ستارہ گردش میں رہا۔ پھر بھی اس نے ایسا کام سرانجام دیا جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ جہانگیر کے پہلے سال جلوس میں امیر الامرا، شریف خاں جو جہانگیر کا وکیل مطلق تھا، نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ قوم افاغنہ خاندانِ مغلیہ کے خلاف ہے چنانچہ عرش آشیانی اکبر بھی ان کے خلاف کوشاں رہے، اب انہوں نے سپہ گری چھوڑ کر سوداگری شروع کی ہے۔ اب چاہیے کہ ملک سے ان کا اخراج کر کے ان کو اپنے وطن میں واپس بھیج دیا جائے۔

چنانچہ اس مقصد کے لئے حکام کے لئے فرامین تیار ہو گئے لیکن خانِ اعظم نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس اقدام سے ملک میں ایک فتنۂ عظیم برپا ہو جائے گا۔ اس گروہ میں کئی مومن مواحد خدا پرست اور سپاہی ہیں۔ یہ تدابیر انسانی سے برطرف نہیں ہو سکتے۔ ممالک محروسہ میں ان کی تعداد ایک کروڑ ہوگی۔ ان کے قبیلہ دار انسانوں کو بے گناہ ملک بدر کرنا گناہ عظیم ہے اور خلق خدا میں بدنامی کا باعث۔ بادشاہ نے خانِ اعظم کے عقل و دانش پر آفریں کہی اور ان فرامین کا اجراء روک دیا۔

خانِ اعظم کی وفات کے 1033ھ میں بمقام احمد آباد گجرات میں ہوئی اور امت مسلمہ کا یہ ہمدرد، غمخوار اکبر کو راہ راست پر رکھنے میں کوشاں رہنے والا بھرپور زندگی گزار کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔

Marfat.com

ابوالفضل

جلال الدین اکبر نے علماء کو بحث مباحثہ میں مشغول رکھنے اور کسی حد تک اس بحث مباحثہ سے خود بھی مستفید ہونے کے لئے عبادت خانہ کے نام سے ایک ادارہ یا عمارت بنا رکھی تھی۔ عبادت خانہ میں علماء اور صوفیا کی بحثیں سن کر اکبر دین اسلام کے متعلق دل و دماغ میں یکسوئی سے بہت دور چلا گیا۔ انہی دنوں ایک نیا آدمی جس کا نام شیخ مبارک تھا، دربار اکبری میں داخل ہوا۔ یہ شخص اپنے زمانے کے متداول علوم کا ماہر تھا لیکن ہر معاملے میں اپنے مخصوص نظریات کا حامل تھا۔ بعض لوگ اسے شیعہ، بدعتی اور مہدوی کہتے تھے۔ اکبر کے سابقہ درباریوں کو یہ شخص ایک آنکھ نہ بھایا۔ انہوں نے بادشاہ کے کانوں میں یہ بات ڈالی کہ شیخ مبارک خود گمراہ ہے، دوسروں کو گمراہ کرتا ہے۔ اس کے بعد درباریوں نے اکبر سے برائے نام اجازت لے کر شیخ کا خاتمہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور محتسبوں کو بھیجا کہ شیخ مبارک کو حاضر کریں لیکن شیخ بچوں سمیت روپوش ہو گیا اور ہاتھ نہ آیا۔ محتسب اس کی مسجد کا منبر توڑ کر چلے آئے۔

شیخ مبارک کو جان بچانے کے لئے جا بجا خاک چھاننی پڑی۔ مدتِ دراز کی سرگردانی کے بعد ایک امیر مرزا کوکہ جو کہ اکبر کا رضاعی بھائی تھا، کی سفارش سے شیخ کی گلو خلاصی ہوئی۔ مرزا کوکہ نے شیخ کی درویشی اور علم و فضل کی تعریف کی، بادشاہ سے اسے گھر جانے اور اپنا درس شروع کرنے کی اجازت دلوائی۔ شیخ کا بڑا بیٹا فیضی تھا۔ 1567ء میں شاعری کے ذریعے اکبری دربار میں پہنچا۔ اس کے بعد مارچ 1574ء میں شیخ مبارک کا چھوٹا بیٹا ابوالفضل دربار آ کر میر منشی ہو گیا۔ یعنی جب علمائے دربار کا چراغ ٹمٹما رہا تھا تو شیخ مبارک اس کے بیٹوں کا آفتاب ترقی طلوع ہوا۔

ہم اکبر اعظم کے حالات میں تحریر کر چکے ہیں کہ کس طرح ایک ہندو نے مسجد کے لئے جمع کردہ سامان چھینا اور بات اس کے قتل تک پہنچی۔ اس وقت اکبر نے شیخ مبارک سے اس واقع کے متعلق رائے طلب کی تو شیخ نے اکبر سے کہا کہ بادشاہ عادل خود امام وقت اور مجتہدِ روزگار ہوتا ہے۔ احکام شرعی اور ملکی کے اجراء میں وہ اس جماعت کا جنہیں علم سے جھوٹی شہرت کے سوا کوئی حصہ نہیں ملا، محتاج نہیں۔ شیخ مبارک نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ اجتہاد کا دعویٰ کرے اور علماء سے محضر طلب کرے۔ چنانچہ شیخ نے جو برسوں پہلے بادشاہ کو ریاست دینی اور دنیوی کا اجتماع کا مشورہ دے چکا تھا، آیتوں اور روایات کی اسناد سے اب اس مضمون کا محضر مرتب کیا۔ علماء کا ایک جلسہ بلایا گیا جس میں بحث و تمحیص کے بعد علماء کی مہریں ثبت ہوئیں۔ مہریں ثبت کرنے والے دربار اکبری کے بااثر افراد تھے جو اکبر کے زیر اثر تھے اور اسے زیر اثر رکھ بھی سکتے

Marfat.com

تھے۔

یہ تھے شیخ مبارک ابوالفضل کے والد اور اکبر کے ذہن میں "اناولاغیری" کا خناس ڈالنے والے۔ اس کے بعد اکبر بالکل ہی بھٹک گیا۔ شیخ مبارک کے بعد یہی کام شیخ کے بیٹے ابوالفضل نے کیا اور اس انداز سے کیا کہ اس کام کو ایک آرٹ بنا دیا۔ ابوالفضل نے اکبر کو راہ راست سے بھٹکانے، اسے خواہشات کا غلام بنانے اور ہدایت کا سرچشمہ ثابت کرنے کے لئے بہت کچھ گھڑا جو اس کی کتاب اکبر نامہ میں صاف نظر آتا ہے۔ ابوالفضل نے اکبر کو مشورہ دے کر اس امر پہ پوری طرح تیار کر لیا کہ وہ خود (اکبر) پیر یا ہادی بن جائے اور لوگ اس کے مرید بن جائیں۔ یہ سلسلہ اکبر کے خوشامدی درباریوں تک محدود رہا لیکن فطری طور پہ جہالت کی باتیں انسان کے نفس اور شیطان کی معاونت سے بہت جلد زمانے کا چلن بن جاتی ہیں۔

فیضی کی وفات 5 اکتوبر 1595ء کو لاہور میں ہوئی۔ اکبری طریقہ پیری و مریدی میں خلیفہ اعظم ابوالفضل تھا۔ اس سے بھی ایسی واردات ہوئی جو بدلے ہوئے حالات پر روشنی ڈالتی ہے۔ ابوالفضل شاید اکبر کا سب سے وفادار اور معتمد علیہ ملازم تھا۔ وہ اکبر کو بے حد عزیز تھا لیکن اب یکا یک دونوں میں ایسی بدگمانیاں اور ناچاقیاں پیدا ہو گئیں کہ ابوالفضل نے دربار جانا بند کر دیا بلکہ وہ خود اکبر نامہ میں بتاتا ہے کہ ایک عرصے تک وہ سوچتا رہا کہ وہ خودکشی کرے یا سب کچھ چھوڑ کر خانہ بدوش ہو جائے۔

یہ صورت حال اکبر کے قیام لاہور کے آخری سال میں رونما ہوئی اور ابوالفضل کے مخالفوں نے شہزادہ سلیم کو شکر رنجی کا ذریعہ بنایا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ وہ خاموشی سے خدماتِ شاہی میں اس طرح مگن تھا کہ اس سے شہزادہ کی خدمت میں حاضر ہونے اور لوازماتِ ولی عہد برداری بجالانے میں کچھ کوتاہی ہوئی۔ اس نے اپنی کوتاہیوں کی جو وضاحت پیش کی وہ قبول نہ ہوئی بلکہ بادشاہ نے ان شکایتوں کو وزن دیا۔ حتیٰ کہ مئی 1598ء کو ابوالفضل اس حد تک گرفتہ خاطر تھا کہ اس نے دربار جانا بالکل بند کر دیا اور اپنے پرائے سے ملنا بھی چھوڑ دیا۔ اکبر نے اسے بلایا لیکن اس نے جلے کٹے جواب بھیجے اور اس بات کے لئے آمادہ تھا کہ وہ اپنے الزام کنندہ کے ساتھ جلتی آگ میں کود پڑے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ابوالفضل خودکشی یا خانہ بدوشی کی بھی سوچتا رہا۔

شیخ مبارک نے جب تفسیر لکھی تو وہ بادشاہ کو نہ دکھائی۔ اس کی وفات کے بعد ابوالفضل نے بغیر اجازت اس کی بہت سی نقلیں کرا کے بلادِ اسلامی میں بھیجیں۔ جب اکبر کو اس کی اطلاع ہوئی تو شہزادہ سلیم نے بھی بادشاہ کو بتایا کہ ابوالفضل کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ یہ بھی تاریخوں میں موجود ہے کہ ایک مرتبہ شہزادہ سلیم ابوالفضل کے گھر آیا۔ دیکھا کہ چالیس کاتب قرآن لکھنے میں مصروف ہیں۔ وہ سب کو بادشاہ کے حضور لے گیا۔ کئی درباری جو موقع کی تلاش میں تھے، نے جلتی پر تیل ڈالا اور ابوالفضل کے تعلقات مغل اعظم کے دربار سے بگڑ گئے۔

ابوالفضل نے بالآخر دربار آنا شروع کیا لیکن اس کے دشمنوں نے زیادہ موثر حربے استعمال کئے۔ اکبر نامہ میں ابوالفضل خود رقم طراز ہے کہ وہ کسی کی پرواہ کئے بغیر اپنی رائے میں مستحکم رہتا تھا اور قوی دلائل سے وہی کہتا تھا جس میں حکومت کی مصلحت ہوتی تھی۔ اس لئے اس کے دشمنوں نے اس کے خلاف جھوٹی سچی باتیں کیں اور ان کی سازشوں کی وجہ

Marfat.com

سے 5 جنوری 1599ء کو اسے دکن بھیج دیا گیا تا کہ شہزادہ مراد کو واپس لائے۔ دکن میں ابوالفضل پر جو گزری اس کا ذکر آگے آئے گا۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ دکن کی طرف ابوالفضل کی روانگی دربار کو آخری الوداع تھا۔ پھر اسے زندہ دارالخلافہ میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔

ابوالفضل کے مخالفین میں اکبر کا رضائی بھائی عبدالعزیز کوکہ خانِ اعظم جس نے ابوالفضل کے والد شیخ مبارک کے لئے دربار میں رسائی کی سفارش کی تھی، سب سے آگے تھا۔ خانِ اعظم کی شخصیت اور عمل کے متعلق ہم تحریر کر چکے ہیں لیکن یہاں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ جب ابوالفضل قتل ہوا تو عبدالعزیز خانِ اعظم نے یہ مصرع کہا "تیغ اعجاز رسولؐ سر باغی برید"...... اللہ کے رسولؐ کی تلوار کے معجزے نے (اللہ) کے باغی کا سر کاٹ دیا۔

ہم مخالفوں کی سازش کی بنا پر جنوری 1599ء میں ابوالفضل کے دکن بھیجے جانے کا ذکر کر چکے ہیں۔ چند مہینے بعد اکبر خود دکن پہنچا، ابوالفضل کی وہاں اس سے ملاقاتیں ہوئیں۔ 1600ء میں ابوالفضل بادشاہ کے ساتھ شیر گڑھ کے محاصرے میں شریک تھا۔ جب اکبر شیر گڑھ کی فتح کے بعد واپس مڑا تو بیرم خاں عرف خانِ خاناں نے جو دکن کی فتح کے لئے مامور تھا، بادشاہ سے درخواست کی کہ ابوالفضل کو اس کی مدد کے لئے یہاں چھوڑا جائے۔ چنانچہ بادشاہ نے ابوالفضل کو دکن میں چھوڑا اور خود آگرے روانہ ہو گیا۔ بادشاہ کی واپسی کے بعد خانِ خاناں نے شیخ کو اس قدر دق کیا کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ دکن میں گرفتار بلا ہونے کے بعد اس نے کئی خطوط اپنے ہمدردوں اور شاہزادے، شہزادیوں کو لکھے کہ اسے دکن سے بلا کر خانِ خاناں کی مسلط کردہ عقوبت سے نجات دلائی جائے لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور ابوالفضل کے لئے عقوبت کی حد ختم نہ ہو سکی۔

ابوالفضل اسی کشمکش میں گرفتار تھا کہ نیرنگی زمانہ نے ایک اور کھیل کھیلا۔ جہانگیر نے الٰہ آباد میں اپنی بادشاہت کا ساز و سامان کر لیا۔ دربار کے کئی بااثر امرا اکبری خیالات اور طرزِ عمل سے متنفر تھے۔ انہیں جہانگیر سے ہمدردی تھی۔ الٰہ آباد میں اکبر کے نمائندے میر صدر جہاں خود جہانگیر کے پرانے استاد اور دلی خیر خواہ تھے۔ صدر جہاں اپنے وقت کے جید عالم اور صوفیا کرام کے ہم نشیں تھے۔ جہانگیر کی تخت نشینی میں وہ بہت اثر انداز ہو سکتے تھے۔

ان حالات میں اکبر کو اپنا پرانا خادم یاد آیا اور ابوالفضل کو لکھا کہ اپنے کام اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کے سپرد کر کے فوراً میرے پاس آ جاؤ۔ خبر دینے والے نے جہانگیر کو خبر دی، وہ ڈرا کہ ابوالفضل دربار میں پہنچ گیا تو الجھن اور بڑھ جائے گی۔ اس نے بندھیلہ کے راجہ نرسنگھ دیو کو جس علاقے سے شیخ کو گزرنا تھا، لکھا کہ شیخ کا کام تمام کر دو بڑی رعائتیں پاؤ گے۔ نرسنگھ دیو کے فوجی دستے نے شیخ پر حملہ کر دیا۔ شیخ کے آدمیوں نے مقابلہ کیا لیکن تین چار ہزار کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی۔ شیخ کو بارہ زخم آئے اور جنگ میں ہی مارا گیا۔ سر جہانگیر کو بھیجا گیا، جسد بے سر گوالیار کے پاس ایک قصبہ نرتری میں دفن کر دیا گیا۔ اس طرح اکبری بوالعجبیوں اور گمراہیوں کو بددیانتی سے علمی سہارا دینے والا اپنے انجام کو پہنچا۔

Marfat.com

نادر شاہ

نادر شاہ بنیادی طور پر ایک چرواہے کا بیٹا تھا جس کی اخلاقی اور اسلامی تربیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ ایک جاہل اور اکھڑ شخص تھا۔ قسمت نے اس کی یاوری کی اور وہ کامیاب ڈاکو بن گیا۔ اس کے ساتھی تین سو کے قریب تھے۔ وہ شاہی فوج کا مددگار بن کر سامنے آیا۔ ازبکوں کے خلاف جنگ میں کامیابی حاصل کی تو خراسان کے حاکم نے اسے اپنی فوج کا سپہ سالار بنا دیا لیکن اس کی مفسدانہ سرگرمیوں نے حاکم خراسان کے اعتماد کو ہلا کر رکھ دیا۔ چنانچہ اسے شہر بدری کی سزا دی گئی۔ نادر شاہ نے ایرانی بادشاہ طہماسپ کی مدد میں افغانوں کے خلاف جوہر دکھائے اور فتح پائی۔ پھر اس نے روسی حملہ آوروں کو بھی بحر کیسپین کے کنارے شکست دی۔ عربوں کے حملے بھی روک دیے۔ 1729ء میں بلوچوں کو کرمانو سے نکال دیا۔ 1729ء ہی میں تبریز کا علاقہ ترکوں سے چھین لیا اور پھر ابدالیوں سے خراسان کو بھی خالی کرالیا۔ 1731 میں ہرات کا محاصرہ کیا جو دس ماہ تک جاری رہا۔ بالآخر نادر شاہ نے فتح پالی اور جب 1723ء میں طہماسپ نے وفات پائی تو اس کی جگہ شاہ عباس سوم ایران کے تخت پر بیٹھا۔ جس نے 1736ء میں انتقال کیا۔ اس کے بعد ایرانی امرا نے نادر شاہ کو تخت پر بٹھا دیا لیکن اقتدار کے باوجود اس کی ظالمانہ سرشت میں فرق نہ آیا بلکہ وہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول پر عمل پیرا رہا۔ نادر شاہ نے 1739ء میں ہندوستان پر حملہ کیا، ہندوستان کو لوٹا اور وہ قتل عام کیا کہ تاریخ میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اس کے حملے کے بعد عملاً ہندوستان کا بھرکس نکل گیا اور بکھر کر رہ گیا۔ نادر شاہ واپس جاتے ہوئے کوہ نور ہیرا اور تخت طاؤس بھی ساتھ لے گیا۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ نادر شاہ بنیادی طور پر ایک گڈریا تھا، اقتدار کے نشے میں ظالمانہ روش اختیار کرنے اور لاکھوں بے گناہوں کا قتل عام کرنے کی وجہ سے اپنے آخری ایام میں دماغی توازن کھو بیٹھا۔ اس کی عمر پچاس سال تھی لیکن وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ نادر شاہ کے بھتیجے علی قلی خاں نے سازش کر کے نادر شاہ کو 8 جون 1747ء کی رات کو قتل کر دیا۔ اس کی فتوحات سے ایران کو بہت وسعت ملی لیکن اس کے مرتے ہی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور دولت بھی لٹ گئی۔ یہاں تک کہ کوہ نور ہیرا بھی افغانستان پہنچ گیا۔ ہندوستان سے واپسی پر اس نے خیوا (خوارزم) اور بخارا بھی فتح کئے تھے اور کردوں کی بغاوت کے دوران جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اپنے بھتیجے کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

احمد شاہ ابدالی

(1724ء تا 1773ء)

افغانستان میں درانی حکومت کا بانی، ابدالیوں کا پہلا بادشاہ اور ہندوستان کا آخری مسلم فاتح۔ اس کی جائے پیدائش کا علم نہیں البتہ ملتان میں باغ لانگہ خاں میں ایک کتبہ درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ ملتان میں پیدا ہوا۔ گو تاریخ کی شہادت نہیں ملتی مگر ملتان میں درانی قبائل اب بھی آباد ہیں۔

احمد خاں ایران کے بادشاہ نادر شاہ کی فوج میں افسر تھا۔ جب نادر شاہ 1739ء میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو وہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ جون 1747ء میں نادر شاہ اپنے بھتیجے کے ہاتھوں قتل ہو گیا تو افغانی قبائل کی مجلس شوریٰ نے احمد خاں کو تخت نشین کیا۔ یوں اکتوبر 1747ء میں سلطنت ابدالیوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ احمد خاں نے تخت نشین ہونے کے بعد احمد شاہ کا لقب اختیار کیا۔ فقیر و درویش سید صابر شاہ نے اسے "دُرِ دوراں" کا خطاب دیا۔ اسی بنا پر اس کا قبیلہ درانی کے نام سے مشہور ہوا۔

احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر سات حملے کئے۔ 1748ء میں اس نے محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں لاہور اور سرہند پر قبضہ کر لیا۔ اسی سال احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن مغل بادشاہ کی فوج جسے محمد شاہ کا بیٹا احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ میں لایا محمد شاہ رنگیلا بھی اس فوج میں شامل تھا۔ مغل فوج نے بڑی دلیری اور حوصلہ سے کام لیا اور ابدالی کی فوج پر اتنا دباؤ ڈالا کہ اس نے کابل میں جا کر دم لیا۔ 1749ء میں دوسرا حملہ کیا۔ 1750ء میں اس علاقے کی مالگزاری چودہ لاکھ روپے سالانہ وصول کرنا شروع کر دی۔ جب پنجاب کی افراتفری کے باعث رقم وصول نہ ہوئی تو دسمبر 1751ء میں احمد شاہ نے تیسرا حملہ کیا اور لاہور کے علاوہ ملتان پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس بار معین الملک سابقہ گورنر لاہور کو گورنر مقرر کیا۔ 1756ء میں معین کے فوت ہو جانے کے بعد سلطانی بیگم کی مدد کے لئے چوتھا حملہ کیا۔ اس بار احمد شاہ دہلی پہنچ گیا اور اسے تاخت و تاراج کیا۔ اپریل 1757ء میں اپنے بیٹے تیمور شاہ کو لاہور کا حاکم مقرر کیا اور خود افغانستان چلا گیا۔

1758ء میں مرہٹوں نے افغانیوں کو پنجاب سے نکال دیا۔ اس لئے اکتوبر 1759ء میں احمد شاہ نے پانچویں بار حملہ کیا اور پورے پنجاب پر قبضہ کر کے اسے سلطنت افغان میں شامل کر لیا۔ جنوری 1761ء میں اس کا مرہٹہ افواج کے ساتھ پانی پت کے میدان میں مقابلہ ہوا۔ مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔ مرہٹوں کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ تھی، اس کے مقابلے میں مسلمان صرف اسی ہزار کے لگ بھگ تھے۔ مرہٹوں کو اپنی عددی برتری کی وجہ سے فتح کا یقین تھا مگر مرہٹے جواب ایک

Marfat.com

ایسی فوج سے لڑ رہے تھے جو مسلمان تھی اور ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے نجات دہندہ بن کر آئی تھی۔ اسی لئے 14 جنوری 1761ء کا دن اسلامیان ہند کی تاریخ میں ایک روشن دن تھا۔ قریب تھا کہ مرہٹے مسلمانوں پر فتح حاصل کر کے ہندوستان سے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتے۔ اللہ نے احمد شاہ ابدالی کے نیک مقصد کی وجہ سے اس کی مدد کی اور پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی کمر ٹوٹی ہی نہیں بلکہ کٹ گئی اور ہندوستان مرہٹوں کے تسلط سے محفوظ ہو گیا۔ اس بار احمد شاہ ابدالی نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے تمام حکمران شاہ عالم کو شہنشاہ تسلیم کر لیں۔

پنجاب میں سکھوں نے سر اٹھایا تو مارچ 1764ء میں ابدالی چھٹی بار سکھوں کی سرکوبی کے لئے حملہ آور ہوا مگر اسے لاہور سے واپس جانا پڑا۔ اس کے اپنے ملک میں حالات ابتر ہو رہے تھے۔ 1767ء میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دعوت پر سکھوں کو مغلوب کرنے کے لئے حملہ آور ہوا۔ ہندوستان پر یہ اس کا آخری حملہ تھا۔ اس نے سکھوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی سلطنت میں ہونے والی سازشوں نے اسے واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد پنجاب پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ ابدالی نے کابل میں وفات پائی۔ کابل میں اس کے مزار کو شاہ بابا کا مزار کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

کتابیات

1-	معارف القرآن سورۃ بنی اسرائیل	مفتی محمد شفیع عثمانی
2-	تاریخ دعوت وعزیمت اسلام	ابوالحسن علی ندوی
3-	انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر	ابوالحسن علی ندوی
4-	شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا (جلد اول)	سید قاسم محمود
5-	شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا (جلد دوم)	سید قاسم محمود
6-	تاریخ اسلام (جلد اول)	معین الدین ندوی
7-	تاریخ اسلام (جلد دوم)	معین الدین ندوی
8-	تاریخ اسلام (جلد اول)	اکبر شاہ نجیب آبادی
9-	تاریخ اسلام (جلد دوم)	اکبر شاہ نجیب آبادی
10-	رودِ کوثر	شیخ محمد اکرم
11-	مسلمانوں کا عروج وزوال	مولانا سعید اکبر آبادی
12-	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (حصہ سوم)	ثروت صولت
13-	الملک الظاہر بیبرس	طالب ہاشمی
14-	مسلم تاریخ کے نازک اور فیصلہ کن موڑ	محمد اجمل
15-	سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک	میاں محمد افضل
16-	تاریخ پاک وہند	قدر آفاقی
17-	مغل دربار	ڈاکٹر مبارک علی
18-	دولتِ عثمانیہ (جلد اول)	ڈاکٹر محمد عزیر
19-	دولتِ عثمانیہ (جلد دوم)	ڈاکٹر محمد عزیر
20-	عثمانی ترکوں کی تاریخ	سید عبدالصبور طارق
21-	تاریخ ترکی	ڈاکٹر پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی
22-	تاریخ ترکیہ	عبدالباری، عبدالرزاق شاہد دلبر خان
23-	امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی	علامہ سید مناظر احسن گیلانی مرحوم
24-	سیرۃ نعمان بن ثابتؒ	مولانا شبلی نعمانی
25-	خلافت وملوکیت	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
26-	محاضرات شریعت	ڈاکٹر محمود احمد غازی
27-	رسالہ ترجمان القرآن	مدیر پروفیسر خورشید احمد
28-	کلیاتِ اقبالؒ اردو	
29-	کلیاتِ اقبالؒ فارسی	
30-	سیرۃ عائشہؓ صدیقہ	سید سلیمان علی ندوی

Marfat.com

Marfat.com

گوہر پبلیکیشنز

سید پلازہ فسٹ فلور A-3، چیٹر جی روڈ، اردو بازار لاہور

فون: 042-37027720 موبائل: 0345-4327063

Marfat.com